چُپ

ممتاز مُفتی

چُپ

فہرست

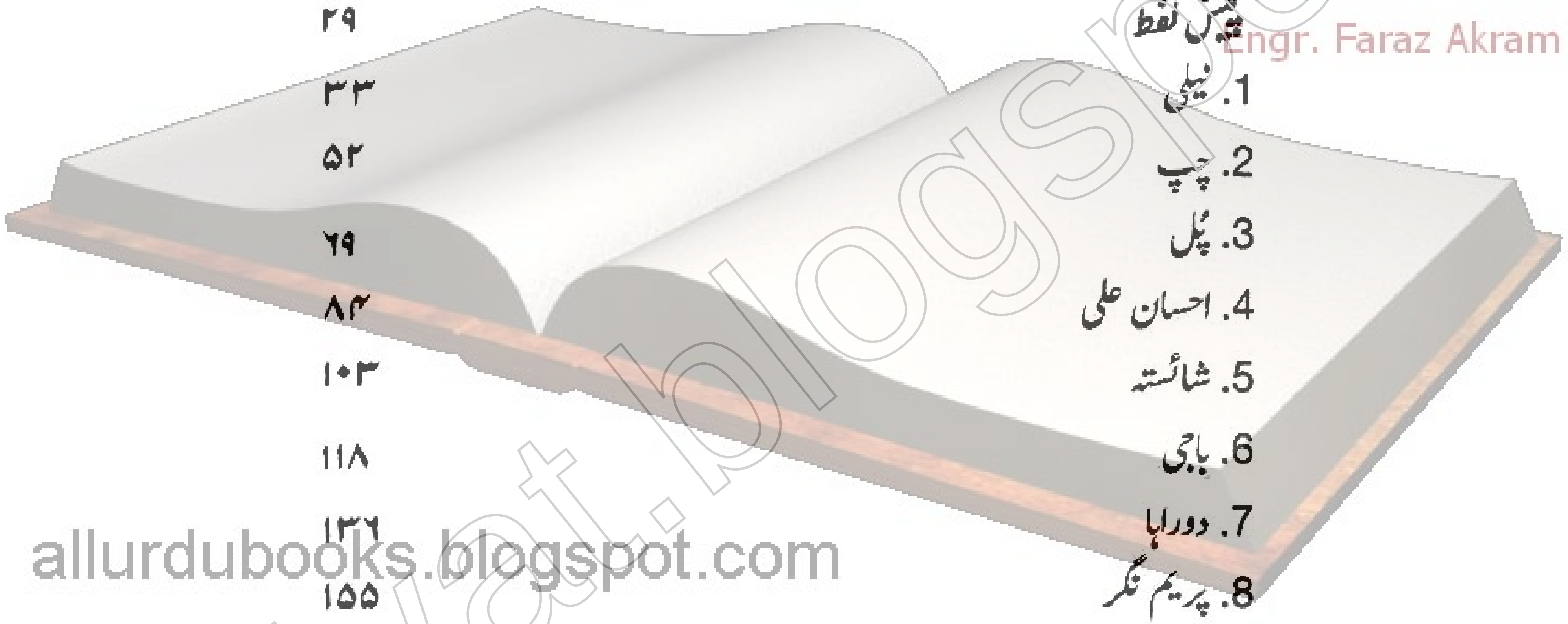

مفتی کا فن ۷
سُورما ۱۵
پیش لفظ ۲۹
1. نیلی ۳۳
2. چُپ ۵۲
3. پُل ۶۹
4. احسان علی ۸۴
5. شائستہ ۱۰۳
6. باجی ۱۱۸
7. دوراہا ۱۳۶
8. پریم نگر ۱۵۵
9. تین خدا ۱۶۵
10. پاگل ۱۷۸
11. دروازہ ۱۹۲
12. گہرائیاں ۲۱۲
13. سہارا ۲۲۷
14. لیڈی ڈاکٹر ۲۳۷
15. پیارا پالتو ۲۵۵

فکر تونسوی

۱۹۴۷ء

مفتی کا فن

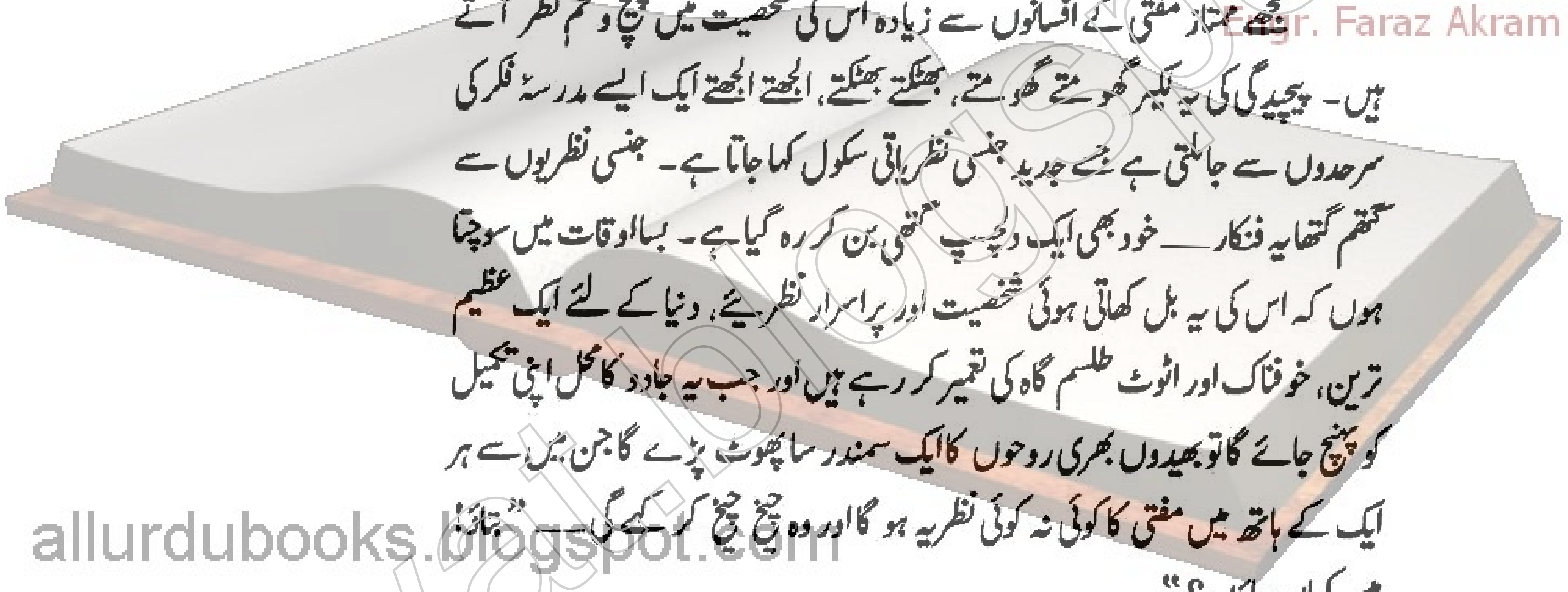

مجھے ممتاز مفتی کے افسانوں سے زیادہ اس کی شخصیت میں پیچ و خم نظر آتے ہیں۔ پیچیدگی کی یہ لکیر گھومتے گھومتے، بھٹکتے بھٹکتے، الجھتے الجھتے ایک ایسے مدرسۂ فکر کی سرحدوں سے جا ملتی ہے جسے جدید جنسی نظریاتی سکول کہا جاتا ہے۔ جنسی نظریوں سے گتھم گتھا یہ فنکار——— خود بھی ایک دلچسپ گتھی بن کر رہ گیا ہے۔ بسا اوقات میں سوچتا ہوں کہ اس کی یہ بل کھاتی ہوئی شخصیت اور پراسرار نظریئے، دنیا کے لئے ایک عظیم ترین، خوفناک اور اٹوٹ طلسم گاہ کی تعمیر کر رہے ہیں اور جب یہ جادو کا محل اپنی تکمیل کو پہنچ جائے گا تو بھیدوں بھری روحوں کا ایک سمندر سا پھوٹ پڑے گا جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں مفتی کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہو گا اور وہ چیخ چیخ کر کہے گی——— "بتاؤ! میں کہاں جاؤں؟"

اس کی جسمانی ترتیب اور ذہنی ساخت میں ایک حیرت انگیز قسم کی ہم آہنگی ہے۔ یہ تحیر اور بھی استوار ہو جاتا ہے جب ہم اس کے آرٹ میں بھی اسی ہم آہنگی کو در آتا دیکھتے ہیں۔ اس مثلث میں وضاحت بھی ہے اور عدم وضاحت بھی——— جب اس کا کوئی فنی نظریہ، اس کے جسم و ذہن کو بھول کر صرف "نظریہ برائے نظریہ" کی تفسیر بننے لگتا ہے تو مفتی گویا ساری کائنات کو بھول جاتا ہے۔ اپنے ماحول، اپنے کردار، اپنے اسلوب سے ماورا ہو کر افسانہ کی بجائے منطق کی تخلیق کرنے لگتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس مقام نازک پر "عدم واضحیت" ابھر آتی ہے

—— لیکن جب وہ اپنے آرٹ کی حدود پر اپنے جسم و ذہن کو پہرہ دار کی حیثیت میں بٹھا رکھتا ہے تو اس کے الجھے ہوئے کردار، ماحول اور پلاٹ، باوجود آرزوئے بغاوت کے دم نہیں مار سکتے اور پھڑپھڑا کر افسانہ میں زندگی اور تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں مفتی اپنے فن کی پوری شیطانی قوتوں کو کام میں لاتا ہے۔ گرد و پیش کو چوکس شکاری کی طرح اپنی آنکھ میں نمایاں رکھتا ہے۔ اس ماحول سے کھیلتا ہے، زہر خند کرتا ہے اور جب تک وہ اپنے نظریئے کے پورے نقوش، پھیلا پھیلا کر، انتہائی نقطوں تک نہیں لے جاتا، ماحول کے ایک ایک کونے اور کونے کے ایک ایک ذرے کو جھلکا نہیں دیتا، تب تک کھیلتا رہتا ہے، ہنستا رہتا ہے، متحرک رہتا ہے۔

جدید دور کے بیشتر فنکاروں کے آرٹ میں فرائڈ کے جنسی سکول اور مارکس کے معاشی فلسفہ کے تاثرات بیک وقت شامل ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ ان دونوں فلسفوں کا زمانی قرب ہے۔ وقت کی ستم ظریفی نے ان دونوں متضاد فلسفوں کو ایسے ماحول اور دور میں روشناس کرایا جو انقلابی کروٹیں لے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دو مختلف فکری لکیروں نے ادب میں آ کر پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ نظریات گڈمڈ ہو گئے اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ایک کا تخیل کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرے کا کہاں شروع اور ان دونوں کی باہمی آمیزش اور نظریاتی میل جول کا تعلق کیونکر برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

مفت بھی ادب کے اسی گڈمڈ دور کی پیداوار ہے لیکن اس کے ذہنی اور جسمانی عناصر کے طے شدہ رجحان نے اس طوفانِ مشترک کو جلد ہی بھانپ لیا اور مفتی نے اپنے لئے فرائڈ کا انتخاب کر کے اپنا دامن صاف بچا لیا —— وہ اشتراکیت سے مطمئن نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے سامنے انسان کے بنیادی نفسی تقاضے بار بار ابھر کر اپنے رجحاناتی تضاد کو عریاں کرتے رہتے ہیں اور مفتی سرمایہ، جائداد، طبقاتی سماج، مزدور اور قوت کار کے سبھی خارجی شعبوں کو لایعنی تگ و دو سمجھنے لگتا ہے۔ نفس آدم ڈارون کے بندر سے لے کر کارل مارکس کے بندۂ مزدور تک اپنی فطری خوبیوں اور

برائیوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی طبعی ارتقاء نہیں ہوا اور جب مفتی سرمایہ و محنت کی اس کھینچ تان کو دیکھتا ہے تو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک ...... نفسیاتی کروٹ کا لیبل تجویز کرتا ہے اور بس ...... ایک نفسی بغاوت اور پھر ردِ بغاوت —— تعمیل و تردید کا یہ کھیل لازمی ہے ..... ابدی ہے۔ ”ہمیں اس جدوجہد کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔“

وہ کہتا ہے ہم کبھی کبھی اپنی بنیادوں کو ہلا کر ہنگامی لذتِ نفس حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب اس لذتیت سے اکتا جاتے ہیں تو پھر اپنے پس منظر کے خول میں آ کر دبک جاتے ہیں۔ مارکس، ہیگل، ڈارون، بدھ، عیسیٰ، ہٹلر، سٹالن ...... سب اسی نفسیاتی شطرنج کے مہرے ہیں۔ ان مہروں کا رقص ہمیں بھٹکا نہیں سکتا۔ ”ناچنے دو، ناچنے دو انہیں کہ یہ ناچ پھر اسی سنسان خاموشی کو مضبوط کرے گا جو ہمارے لاشعور میں لامحدود عرصے سے چلی آتی ہے۔“

میرا خیال ہے اسی نظریاتی فیصلہ نے مفتی کے آرٹ کو بچا لیا۔ اس بے ہنگم شور و شغب سے بچا لیا جس نے بہت سے فنکاروں کی ابدیت کے لئے زہر کا کام کیا ہے۔ جنس اور نفسیات کو اپنے موضوع کی سرحدیں بنا کر اس نے اپنی انفرادیت کو سنبھال لیا ہے۔ یہی دو بنیادی تقاضے اس کے ہر افسانے کے تار و پود بنتے ہیں۔ انہیں سے شست باندھ کر وہ کائنات میں بھٹکے ہوئے لاتعداد شکاروں کو اپنے دام میں پھنسا لاتا ہے۔ اس کی یہ کمند شخصی اور اجتماعی، دونوں بلندیوں پر پھینکی جاتی ہے اور یہی انفرادیت شاید مفتی کے آرٹ پر ابدیت کی مہریں بھی ثبت کر دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مفتی کے پاس صرف نظریئے ہیں۔ کتابی، ٹھس اور منجمد نظریئے، ان میں فنکارانہ لچک نہیں ہے۔ ان میں تجربہ اور مشاہدہ کا پھیلاؤ نہیں ہے۔ وہ صرف گھٹے گھٹے، بیجان فقروں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن ان فیصلوں کے بعض حصوں سے مجھے اختلاف ہے۔ اول تو جب یہ ظاہر ہے کہ مفتی فرائڈ سکول کا طالب علم ہے تو ہم اس پر یہ الزام کیونکر دھر سکتے ہیں کہ وہ صرف کتابی فنکار

ہے۔ آرٹ زندگی کا مفسر ہے اور جس زاویئے سے فرائڈ نے زندگی کی چھان بین کی ہے، ہم اس زاویۂ نظر کو صرف تخیلی یا غیر مرئی نہیں کہہ سکتے اور زندگی کے متعلق ان مخصوص بنیادی نظریوں کو فرائڈ، ہوا کی لہروں پر تو نہیں گونجائے گا۔ آخر اسے لفظ و بیان کو ہمراز بنانا پڑے گا اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مفتی کے نظریئے صرف کتابی ہیں تو گویا ہم غیر محسوس طریقے پر اس کو ”فن برائے زندگی“ کا مفسّر کہہ دیتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے لیکن کتنی سچی۔

اس کے بعد تجربہ اور مشاہدہ کی سرحد آتی ہے۔ نظریات صرف اسی وقت تک ٹھس اور منجمد رہتے ہیں جب تک انہیں چھیڑا نہیں جاتا۔ یہ چھیڑ مشاہدہ اور اس کی جزئیات کے کچوکوں سے نظریات کو زندہ اور متحرک بنا دیتی ہے۔ مفتی کے افسانوں میں اس چھیڑ کے وجود سے منکر نہیں ہوا جا سکتا۔ اس کے بیشتر افسانوں میں داخلی اور خارجی مشاہدہ کی جزئیات پھیلی پھیلی، نکھری نکھری اور ابھری ابھری دکھائی دیتی ہیں لیکن جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں، وہ کبھی نظریوں کو پھیلاتے پھیلاتے عدم واضحیت کی ”بھول بھلیاں“ کا رخ کر لیتا ہے۔ اس کی بظاہر وجہ اور بظاہر نتیجہ مشاہدے کی کمی اور کتابی انجاد کو ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس کی وجہیں مختلف ہیں ایک تو یہ کہ نظریئے میں ایک کڑا پن ہوتا ہے جو افسانوی ماحول کا متحمل نہیں ہو سکتا اور وہ صرف ایک فلسفیانہ اور ادق مضمون ہی میں سما سکتا ہے۔ چونکہ مفتی کے ذہن میں اپنے فن کے اظہار کے لئے افسانہ کے علاوہ فلاسفیکل مضامین کے جراثیم بھی موجود ہیں، اس لئے وہ افسانہ لکھتے لکھتے جب نظریئے کی کڑی سرحدوں پر پہنچتا ہے تو اس کا قلم افسانہ کی عنان چھوڑ کر مضمون کا دامن پکڑ لیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ”متضاد مرکب“ —— کا یہ زہریلا گھونٹ پی جاتا ہے آنکھیں بند کر کے —— افسانہ اور مضمون گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور وہ بچارا ملزم بن جاتا ہے۔

دوسری اہم وجہ اس کے افسانہ کی عجیب سی تکنیک ہے —— آج کل نفسیاتی افسانوں کا ایک بے ہنگم ہجوم دکھائی دیتا ہے جن میں انسان کی داخلی کیفیات کی تحلیل کی

جا رہی ہے۔ ایسے افسانوں کی عام تکنیک یہی ہے کہ کردار، سوچتے اور مسلسل سوچتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اندرونی گپھاؤں کے تاریک ترین رازوں کو اجالتے چلے جاتے ہیں —— لیکن مفتی لاشعوری نفسیات کو اپنے انوکھے ڈھب سے دیکھتا ہے اور دیکھنے کا یہی زاویہ اس پر عائد کردہ الزام کو اور بھی استوار کر دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی اس کی انفرادیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ نفسیاتی افسانوں کے عمومی رخ کے خوگر قاری، مفتی کی ان بوجھی شاہراہوں پر پھیلے ہوئے مبہم نقوش کو مجذوب کی بڑ کہہ کر اسے مطعون کر دیتے ہیں کیونکہ اگر مفتی نفسیات کے مروجہ کلیوں کی لکیروں پر اپنے افسانے کی ترتیب و تشکیل کرتا تو ہم اسے مفتی کے افسانوں کی مخصوص تکنیک نہ کہہ سکتے بلکہ صرف تقلید کا تراشا لیبل۔

دراصل —— جب مفتی اپنے کرداروں کی لاشعوری تہوں میں پہنچ جاتا ہے تو اسے سب سے بڑی رکاوٹ یہی پیش آتی ہے کہ وہ ان گتھیوں کو کرداروں کی زبان سے براہ راست نہیں کہلوانا چاہتا کیونکہ یہ تکنیک اسے بنیادی طور پر غلط دکھائی دیتی ہے۔ اگر اس کے کردار کو یہ شعور ہو جائے کہ اس کے اندر کیا کیا مستور ہے تو گویا کردار کے وہ لاشعوری خصائص ختم ہو جاتے ہیں اور کردار میں انفرادیت باقی نہیں رہتی جو اس کی لاشعوری حالتوں میں افسانہ کی جان تھی۔

اور پھر مفتی اپنے بیان سے بھی متعینہ کرداروں کی تحلیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایک رجعتی تکنیک ہے۔ اس طرزِ اظہار میں ایک سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ بیان کرنے والے کی خارجی اور غیر ضروری شخصیات افسانہ کی فضا پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ نظریئے کی مرکزیت کو ابھارنے والے کردار پس منظر میں چلے جاتے ہیں، لاشعوری باتوں کے الجھاؤ بدستور قائم رہتے ہیں اور قاری افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی وہ مخصوص تلذذ حاصل نہیں کر پاتا جو فنکار کا مقصد ہوتا ہے۔

چنانچہ مفتی کے پیچیدہ ذہن نے اپنے لئے ایک نہایت پیچیدہ لیکن زیادہ فطری اور منفرد تکنیک کا انتخاب کیا۔ وہ کرداروں کے افعال و حرکات سے ایسی فضا کی تخلیق

kitabiyat.blogspot.com

کرتا ہے اور کچھ اس طرح گتھیوں کو سلجھا کر رکھ دیتا ہے کہ اس کے کردار تو بدستور اپنے اندھیروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ جو ان کے فطری مقامات ہیں ـــــ لیکن قاری انہیں حرکات و سکنات سے پیدا کی ہوئی فضا سے مختلف کڑیوں کو خود بخود اس آسانی سے ملا کر نظریئے کی مرکزیت تک پہنچ جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ گویا مفتی اپنے قاری کے ذہن کی پگڈنڈیوں کو فنکارانہ طریق سے اس چوراہے پر لے آتا ہے جہاں وہ نظریہ نہایت وسیع، پھیلا پھیلا اور صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے اور قاری اچھل پڑتا ہے۔ "ہیں!!" ــ اور "ہیں" کا یہی تحیّر ہی مفتی کی افسانوی تکنیک کا مقصود ہے۔

نظریئے کے کڑے پن میں لچک اور تجربہ میں پھیلاؤ نہ ہونے کا باعث، مفتی کی متذکرہ بالا مشکل اور ادق تکنیک ہے جو بسا اوقات قاری کو مفتی کے ساتھ نہیں چلنے دیتی اور وہ بھٹک کر مفتی پر ہی فتوے لگا دیتا ہے۔

یہاں آ کر مفتی کا اسلوبِ بیان بحث میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلوب کے اعتبار سے ہر بڑے فنکار کی طرح مفتی بھی ایک رنگِ خاص کا مالک ہے، لیکن اس نے جس نظریاتی سکول کو اپنے فن کے لئے منتخب کیا ہے، وہ سکول اور مفتی کی بیانیہ قوتوں میں ابھی ایک دوری ہے، ایک افسوسناک بُعد ہے۔ لیکن یہ بُعد اور دوری ایسی نہیں کہ اس کے فن کی جامعیت پر اثر انداز ہوتی ہو۔ کیونکہ اس کا طرزِ بیان، لہجے کا سبک رفتار طنز اور ہلکے پھلکے فقرات کی نرم چبھن اس کے نظریئے کے ابھار کے لئے منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ صرف اسی اسلوب سے لاشعور کے پتھریلے نظریات کو پگھلا سکتا تھا۔ اس نرمی، چبھن اور سبک روی ہی سے اس گرد و پیش کے نقوش اجاگر ہو سکتے تھے جو نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کے اظہار کے باعث ظہور میں آتا ہے۔ اگر وہ معاصرین سے متاثر ہو کر کوئی ایسا پیرائیہ بیان اختیار کرتا جس میں وقار یا عظمت ہوتی تو مفتی اپنے آپ کو جھٹلا دیتا۔ اس کے فکری ماحول کی پیدائش کے لئے جس اسلوب کی ضرورت تھی، وہ مفتی کے فن کے ساتھ ہی ساتھ ظہور میں آ گیا۔

تتبع تخلیق کے لئے سم قاتل ہے اور کسی بڑے کلاکار کی یہی پرکھ ہے کہ اس کے ذہنی عکس کا رنگ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ وہ بھی فن کی روح کا ہم رنگ ہوتا ہے اور مفتی کو یہ امتیاز حاصل ہے۔

اس کی قوت بیان اور فرائڈین نظریات کی پیچیدگیوں میں جو بعد دکھائی دیتا ہے، اس کے لئے مفتی کا وہ خارجی ماحول ذمہ دار ہے، وہ ماضی ـــــ جس نے اسے انگریزی لٹریچر کا متوالا تو بنا دیا لیکن اردو کے کلاسیکل ادب سے کماحقہٗ روشناس نہ ہونے دیا اور جب مفتی نظری طور پر صلاحیتوں کے اس موڑ پر پہنچا جہاں اسے "پیامبری" کے فرائض سرانجام دینا تھے اور نظریات کو ایک فنکار کی حیثیت سے منظر عام پر لانا تھا تو زبان کی دشوار گزار گھاٹیاں اس پر بند تھیں۔ یعنی وہ ایک گونگا مفکر تھا جو صرف سوچ سکتا تھا، بیان نہیں کر سکتا تھا۔ تفکر اور اظہار کے اس دوراہے پر آ کر الجھنوں کا یہ مفسر، خود ایک بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا اور وہ تھی زبان کا کانٹا جو اس کے حلق سے اترنے ہی میں نہ آتا تھا۔ اس کا ذہن اظہار کے لئے مغربی ترتیب کا آسرا لیتا تھا لیکن اردو اس ترتیب پر سرا نکار ہلا دیتی تھی۔ چنانچہ یہ مجبور فلسفی آج تک اس چبھن کا شکار ہے اور اسی چبھن کو نہ سمجھ کر اسے کبھی تو کتابی کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی مشاہدے کے میدان کا ہارا ہوا کھلاڑی۔

وہ بعض تجربوں اور مشاہدوں سے صرف اڑتے اڑتے اشاروں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور جب انہیں افسانوی جال میں بننے لگتا ہے تو نظریات کا کڑا پن، زبان پر ناعبوری، تکنیک کا عجب اور اس کی منطقی مضمون لکھنے کی ترغیبی حس، مل جل کر اس کے افسانے کو ٹھس اور جامد بنا دیتی ہے۔ وہ جزئیات کی بھول بھلیوں پر داخلی لحاظ سے تو قادر ہوتا ہے لیکن خارجی اعتبار سے الفاظ اس سے بدکتے ہیں اور وہ انہیں پکڑنے کی تگ و دو میں تھک ہار کر اپنے معین کرداروں، افسانویت اور جزئیات کے حقائق کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور ان کے بجائے ایسے کردار تعمیر کرتا ہے جو اس کے لئے بت کا کام دے سکیں۔ خود نہ ہلیں بلکہ ہلائے جائیں اور مفتی ان بتوں کو اپنے

نظریئے کے شیشے سے تراش تراش کر اپنے ڈھب کا بنا لیتا ہے۔ لیکن وہ ساکت و جامد بت، مشینی حرکات تو کر سکتے ہیں، فطری نہیں۔ ایسے مقامات پر پہنچ کر مفتی کے افسانوں میں خلوص اور سچائی نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس معاشی جبر کا ذکر بھی لازمی ہے جو اس کی تخلیقوں پر پہرے بٹھا بٹھا کر اپنے ہنگامی مقاصد پورے کرا رہا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا جس مقام پر اس کی گرفت میں آئے ہوئے الفاظ اس کے نظریات کو پگھلانے کی قدرت رکھتے ہیں، وہاں اس کی جزئیات میں پھیلاؤ اور تجربہ میں بے پناہ لچکیلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نہایت غضب ناک اور فتح مند شکاری کی طرح پے در پے ایسے نشانے لگاتا چلا جاتا ہے جو کبھی نہیں چوکتے۔

اس سب کچھ کے باوجود مجھے مفتی کے فن سے زیادہ اس کی شخصیت میں پیچ و خم دکھائی دیتے ہیں اور میرا یقین ہے کہ اگر اس کی شخصیت میں پیچ و خم نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی ایک بڑا فنکار نہ بن سکتا بلکہ صرف ایک سکول ماسٹر۔

بشیر رومانی۔ (احمد بشیر)

۱۹۴۵ء

تعارف

سورما

ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ آپ کسی اسکول میں چلے جائیں جہاں وہ پڑھاتا رہا ہے اور اس کے متعلق پوچھیں تو اس کے شاگرد کہیں گے "ان کی باتیں؟ کیا بات ہے ان کی باتوں کی مگر ان کا ڈنڈا..... توبہ ہے!! اساتذہ مسکرا دیں گے..... ہاں تھا تو یار آدمی، مگر کچھ عجیب سا تھا۔" ہیڈ ماسٹر اطمینان بھرا سانس لے گا "خیر، اب تو یہاں سے چلا گیا، چھوڑیئے اس بات کو۔"

آل انڈیا ریڈیو کے کسی رکن سے پوچھیے "وہ شخص؟ خصوصیت تو خیر، ویسے خوب آدمی ہے۔ اچھا ہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ سمجھتے ہی ہیں نا......"

مکتبۂ اردو میں بات چھیڑیئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جائے گی۔ "ممتاز مفتی؟ ممتاز مفتی ہی ہے۔ ہاں ذرا پیسوں کے معاملے میں۔ لیکن خیر، حاجت مند کون نہیں۔

اس کے والد سے بات کیجئے۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو جائیں گے۔ پھر حقے کا ایک لمبا سا کش لے کر کہیں گے...... "اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہاں اگر وہ اتنا خود سر نہ ہوتا اور عقل سے کام لے سکتا تو اس کی زندگی سنور ہی جاتی۔"

اس کی بیوی سے بات کی جاتی تو وہ ہنس دیتی۔ "اچھا! تو آپ انہیں مرد سمجھتے ہیں؟" اور دوسری بیوی سے پوچھئے تو وہ ہونٹ پر انگلی رکھ لے گی۔ "ان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ان کی کیا بات ہے!"

ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے۔ چھوٹے قد کا منحنی آدمی، لمبوترہ چہرہ، گدلی گدلی بے جان آنکھیں اور بڑا سا سر، بات کیجئے تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ "ارے! یہ تو محض جی حضوریہ ہے۔" احساسِ برتری کی ایک لہر آپ کی رگ وپے میں دوڑ جائے گی۔ چھاتی قدرے باہر کو اینٹھ آئے گی۔

کسی موضوع پر چاہے وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو، اس کی رائے دریافت کیجئے تو نہایت خلوص اور دیانت داری سے آپ کی ہاں میں ہاں ملا دے گا۔ اس کی موجودگی میں کسی معاملے پر بحث کر دیکھئے، چپکا بیٹھا سنتا رہے گا۔ اس سے استفسار کیجئے تو آپ کی ہنسی نکل جائے گی کیونکہ وہ آپ کے اور آپ کے مخالف کے ساتھ بیک وقت اتفاق کر رہا ہو گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ نکتہ متنازعہ فیہ آپ کی حیرانی اور ہنسی کے درمیان کہیں کھو جائے گا۔ اگر آپ ذرا سنجیدہ قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں تو آپ کو غصہ آنے لگے گا یا آپ اسے مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ممتاز مفتی کو آپ اس روپ میں صرف اسی صورت میں دیکھیں گے جبکہ آپ کی اس سے محض رسمی ملاقات ہو۔ لیکن اگر آپ اس کے دوست ہیں۔ پناہ بخدا۔ کاش کہ میں اور ممتاز مفتی محض شناسا ہوتے۔

جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا تو وہ چارپائی پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ رسمی تعارف کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا "مزاج اچھے ہیں؟ تشریف رکھئے" اور پھر سے طبلہ بجانے میں منہمک ہو گیا۔ تو یہ ہے ممتاز مفتی، میں نے سوچا۔ اب اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی شاید مجھ سے اس اَن کہے فقرے کا انتقام لے رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے حقیقی ممتاز مفتی کون سا ہے۔ وہ جو کچھ سال پیشتر مجھ سے متعارف ہوا تھا اور مہینوں محض واقف کار کی حیثیت سے ملتا رہا یا یہ جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے اور دوستی کا دم بھر رہا ہے۔

دوستی کی ابتدا میں وہ آپ کی شخصیت میں انوکھے گن دیکھے گا اور ان کا آپ سے بے تکلف اظہار کرے گا۔ ایسے انوکھے گن جن کے وجود کا آپ کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ آپ سمجھیں گے کہ وہ مذاق کر رہا ہے اور آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ لیکن اثر قبول کئے بغیر اس کی باتوں کے رنگین جال سے نکل جانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کی دلیل کا رنگ عجیب ہوتا ہے۔

"بے تعلقی، بے تکلّفی اور سرراہے" اس کی گفتگو کی تین خصوصیات ہیں۔ بظاہر وہ آپ کی شخصیت کی کسی خامی کے بارے میں بات کرے گا۔ لیکن بات کی تہہ میں آپ کی شخصیت کی کسی انوکھی خوبی کی طرف اشارہ ہو گا اور اس رنگین اشارہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خوبی کے انوکھے پن اور منفرد نقطہ نگاہ کی شگفتگی کی وجہ سے آپ حیران رہ جائیں گے۔ وہ نیا گن نہ جانے کہاں سے چپکے چپکے آپ کی شخصیت میں ابھر آئے گا۔ کچھ دیر بعد آپ کو اپنے اندر اتنے نئے گن محسوس ہونے لگیں گے کہ آپ اپنے کردار کے انوکھے پن پر ششدر رہ جائیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے کہ آپ کوئی عجیب ترین شخصیت ہیں۔ چنانچہ آپ کے اندر ایک نیا کردار بیدار ہو جائے گا۔ جب یہ نیا کردار آپ کے معمولات پر چھا جائے گا تو مفتی دفعتاً آپ کی کمزوریاں دکھانے لگے گا۔ آپ کی ہر بات کا تجزیہ کرے گا اور آپ کی شخصیت کے کھوکھلے پہلوؤں کو اس شدت سے اجاگر کرے گا کہ آپ کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ نئی شخصیت استوار ہونا تو کجا آپ کی پہلی شخصیت بھی کچی دیوار کی طرح بیٹھتی ہوئی محسوس ہو گی اور آپ کے اندر ایک بے پناہ اور لامحدود خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس انمٹ خلا کو تجسس سے پُر کرنے کی کوشش کریں گے مگر اس سے الجھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کی پھینکی ہوئی کمند کو اتار پھینکیں۔ اس کی باتوں کو بے وقعت بنا دینے کی کوشش کریں۔ جی چاہے گا کہ آپ اس سے کہیں دور بھاگ جائیں مگر آپ بے حس ہو چکے ہوں گے۔ آپ اس کی باتوں کو نہ

سننے کی کوشش کریں گے۔ ان کا مذاق اڑانا چاہیں گے۔ مگر اس کی باتیں زبردستی آپ کے اندر قیام کر چکی ہوں گی۔ آپ پر چھا چکی ہوں گی۔

آپ بے حد مظلوم اور مجبور ہو جائیں گے لیکن آپ کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہوگی کہ اس کا یہ نیا رخ آپ کو اور بھی متاثر کر دے گا۔ آپ کے دل میں اس کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہو جائے گی اور آپ پھر اس کی طرف بھاگنا چاہیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا کہ آپ پر یہ ظلم ہوتا رہے، ہوتا رہے۔

ممتاز مفتی ایک حالتیں بدلنے والا کیڑا ہے۔ میں گرگٹ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے پہل تو وہ آپ کو محض ایک کویا سا نظر آتا ہے پھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کیڑے کی طرح رینگ رہا ہے اور آنکھ کے جھپکے میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک پھدکتا ہوا سنپولیا بن کر آپ کے گرد منڈلا رہا ہے۔ ان عجیب کیفیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت مختلف اور دلچسپ ہیں۔

آپ مفتی سے اس کے اپنے بارے میں دریافت کریں تو وہ کندھے سکوڑ کر کہے گا "اوہ! میں، یعنی...... میرا مطلب ہے آپ میرے بارے میں پریشان کیوں ہوتے ہیں؟" لیکن اگر آپ اس کی ڈائری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بارے میں واقعی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ ہو۔

ملتان:۔۔۔

"سند باد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہیں اور مجھ پر ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں اور مناسب اہمیت دیں۔ اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری سی ابھر آئی۔ اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں، توازن نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے، وہ جھجھک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی ہمت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بدک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔

اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل ایک الجھی ہوئی پگڈنڈی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں ربط نہیں، سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کشمکش سی لگی رہتی ہے۔

میں بے حد ڈرپوک ہوں اور بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے، احمقانہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لئے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ دل ہی دل میں دنیا سے از حد خائف ہوں اور اس بات پر مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پروا ہو کر دنیا داری کو انتقاماً ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔ بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے کسی اونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے تو میں اس ڈر سے بچنے کے لئے کہ گر نہ پڑوں، اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ عورت سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ عشق ہو جائے تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی مٹیار کی ایک نظر پر دوشیزگی، نوخیزی، معصومیت اور الھڑپن تج

دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بدمعاش عورت سے عشق ہے۔

میرا ذہن قومی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی ہے۔ میں عزت اور خودداری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔"

ممتاز مفتی

اگرچہ آج کا ممتاز مفتی کل کے ممتاز مفتی سے مختلف ہے لیکن بنیادی طور پر بالکل وہی ہے۔ بچپن میں وہ سوتیلی ماؤں کے زیر سایہ رہا۔ چنانچہ اس نے عمر کا پہلا حصہ اس غصے کے خلاف جہاد کرنے میں گزارا جو اس کے دل میں کثرتِ ازدواج کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں بچپن گزارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ڈر اور غصہ پیدا ہو گیا اور ان دونوں جذبوں پر اس کی شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے حد شرمیلا اور چپ چاپ ہو گیا جس سے اس کی کالج کی زندگی برباد ہوئی۔ یہ زمانہ اس نے ایلمو ڈی مائی اور پیڈرو بہادر کی خاموش فلمیں دیکھ کر، سستے سگریٹ پی کر، مونگ پھلی کھا کر اور کالج سے بھاگ کر گزارا۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس نے ایک عورت کے اثر سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش میں کاٹا اور زندگی کی تیسری منزل افلاس کے خلاف لڑنے میں بسر کی کیونکہ اسے پینتالیس روپے کی حقیر رقم میں آٹھ پیٹ پالنے پڑتے تھے۔

ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے بہت ہچکچاتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ اگر آپ اسے کچھ کتابیں، چائے، پان، کچھ کھانے کو اور ایک ریڈیو سیٹ دے کر ایک جگہ مقید کر دیں تو اسے بہت دیر تک پتہ ہی نہ چلے گا کہ وہ قید ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے کسی ایسی جگہ رکھیں جہاں بہت سے آدمی اور ہنگامے ہوں تو وہ گھبرا کر کہیں بھاگ جائے گا۔

گھر کا شوقین ہونے کے باوجود وہ فرمانبردار خاوند اور گھریلو مرد نہیں۔ ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک بھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشینری ہمیشہ اپنے چلانے والے کی ذہنیت کے مطابق خصوصیات پیدا

کر لیتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا کسی نے اس کے کلاک میں کوک بھر دی۔ عموماً صبح دس بجے سوئیاں تین پر ہوں گی اور گھنٹہ چھ بجائے گا۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ صبح دس بجے سوئیاں ٹھیک دس پر ہی ہیں تو یقین رکھیں کہ گھڑی پر رات کے دس بج رہے ہیں، صبح کے نہیں۔

مقولہ ہے کہ شہر اس مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگوں کو روپے کی قیمت کا اندازہ نہ رہے۔ اس لحاظ سے ممتاز مفتی مستقل طور پر شہر میں رہتا ہے۔ اسے فضول خرچی میں بڑی تسکین ملتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا ہاتھ تنگ ہو تو تسکین کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر قرض ہی اس کی پونجی رہی ہے۔ لیکن تعجب ہے وہ کہیں نہ کہیں سے ادھار کا انتظام کر ہی لیتا ہے۔ آپ نے کیسا ہی عزم کیا ہو کہ آپ اسے کچھ نہ دیں گے مگر وہ آپ سے مانگے گا ہی کچھ ایسے انداز میں کہ آپ اپنے سارے ارادوں کو یکسر بھول جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اس میں خودداری نام کو بھی نہیں اور اسی سے وہ اپنی سدا بہار غربت اور بدنامی کے قبیح نتائج سے بچا ہوا ہے۔ وہ...... خودداری کو ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہے مگر اس کا خیال ہے کہ خودداری کا نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

دفتر جاتے ہوئے اسے اکثر خیال آتا ہے کہ چپڑاسیوں کو سلام کرنے کی عادت اچھی نہیں۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگتا ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ آج چپڑاسیوں کو سلام نہیں کرے گا اور ان کے سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دے گا جیسا کہ ایک خوددار آدمی کو کرنا چاہئے لیکن موقعہ آنے پر اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جائے گا۔ "آداب عرض!"

اگر اس کا افسر اس سے کہے "دیکھئے صاحب! آپ نہیں سمجھتے۔" تو سوچے سمجھے بغیر اس کے منہ سے نکل جائے گا، "جی ہاں...... جی ہاں۔" پھر ملاقات کے بعد دفعتاً اسے احساس ہو گا کہ چاہے وہ افسر ہے لیکن اسے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔

"میں نہیں سمجھتا۔ میں؟"

وہ اپنی حماقتوں کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ذرا نہیں گھبراتا بلکہ اسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے۔ وہ دوستی، محبت، ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے اور عام آدمی کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں عوام ذہین آدمیوں سے بہتر مخلوق ہیں۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ذہنی قابلیت حاصل ہونے سے انسانیت کی خوبی کم ہوجاتی ہے اس لئے وہ علم کو انحراف سمجھتا ہے اور جذبہ کو صراطِ مستقیم۔ اس کی رائے میں زندگی کی تمام تر دلچسپی، رنگینی اور خوشی عوام کے دم قدم کا نتیجہ ہے۔

ممتاز مفتی حتیٰ الوسع جھوٹ نہیں بولتا مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ یا سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب لوگوں کا ڈر غالب ہو یا یہ خوف طاری ہو کہ مخاطب میں سچائی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی محض آپ کے جذبات اور احساسات کے احترام اور اخلاق کی خاطر جھوٹ بولنا گوارا کرے گا اور جھوٹ بول کر آپ کی ذات پر بہت بڑا احسان کرے گا۔ چونکہ ابتداً وہ لوگوں سے از حد خائف تھا، اس لئے اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ مگر اب وہ جان گیا ہے کہ پھٹ سے سچ بول دینا لوگوں کو دھوکا دینے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔

اس میں راز داری کی اہلیت بے شک ہے۔ مگر وہ اس اہلیت کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اسے کسی بات کے راز رکھنے کی تاکید کردیں، وہ بات اس کے سر پر سوار ہوجائے گی، دل پر بوجھ سا بن جائے گا، حتیٰ کہ وہ راز فاش کردینے پر مجبور ہوجائے گا تاکہ اسے سکون مل سکے۔ اگر یہ بات آپ کے ناموس کے متعلق ہے اور اس کا راز رہنا ضروری ہے تو وہ کسی کو اعلانیہ تو نہیں بتائے گا مگر چھپا کر بھی نہیں رکھ

سکے گا، اس لئے وہ اسے یکسر بھول جائے گا تاکہ اسے چھپانے کی زحمت سے چھوٹ جائے۔

وہ ذہنی الجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اسے بتایا جائے کہ وہ نوکری سے برخاست کردیا گیا ہے تو وہ ایک لمحے کے لئے پریشان ہوجائے گا مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کے لئے تیار کرے گا اور اس طرح اپنی زندگی سے الجھن اور غم کو مٹا دے گا۔ تھوڑے ہی وقفے میں وہ اس تبدیلی کے لئے اس قدر تیار ہوچکا ہوگا کہ اگر دوبارہ اطلاع پہنچے کہ وہ بحال کردیا گیا تو پریشان ہوجائے گا اور اسے اپنی نئی سکیموں کے ضائع چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔

اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی سناٹے میں نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اسے دھچکا نہیں پہنچتا۔ ایسی خبر سن کر وہ خالی الذہن ہوجائے گا اور اس کے برتاؤ سے مترشح ہوگا کہ وہ غمزدہ نہیں بلکہ کھویا کھویا سا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے غم اس کے احساسات میں سرایت کرے گا، قطرہ قطرہ ہوکر۔ اچانک اور فوری خوشی پر بھی اس کا طبعی توازن قائم رہتا ہے کیونکہ اس نے اپنے گرد تسکین و اطمینان کا ایک خول سا بنا رکھا ہے۔

وہ زیادہ بلند امیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا تاکہ پوری نہ ہونے پر اسے دکھ نہ پہنچے۔ کوئی مسرور کن توقع ہو تو وہ اسے بھلا دے گا۔ بھلا نہ سکے تو زیادہ اہمیت نہیں دے گا اور دل ہی دل میں امید رکھے چلا جائے گا کہ وہ توقع پوری ہوکر اسے ایک اچانک اور خوشگوار تعجب بخشے اور اگر وہ پوری نہ ہو تو مایوسی کے صدمے سے اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ اسے سپنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اسے سائیکل پر کہیں دور جانا ہو تو رستے کی تکان سے بچنے کے لئے کسی سپنے میں کھو جائے گا۔ جوانی کے زمانے میں وہ کرائیڈن سے کراچی تک ہوائی تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہوا بازی سے سیر ہوگیا تو دنیا کا مشہور کرکٹ باؤلر بن گیا اور بسا اوقات ایم سی سی کی ساری ٹیم تینتیس رنوں میں آؤٹ کرلی۔ یہ گیند پھینکنے کا شغل

بھی کچھ زیادہ دیر تک دلچسپ نہ رہ سکا، اس لئے اس نے دیپک راگ کی صحیح بندش کھوج نکالی۔ وہ مجمعوں میں اس راگ کا الاپ کیا کرتا۔ دیپک کی جلتی ہوئی تانوں سے اہلِ محفل کے دل سلگ سلگ جاتے، بتیاں جل جل اٹھتیں اور لوگ حیرانی سے بت کے بت بنے تکتے رہتے۔ آج کل اس کے خواب بین الاقوامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایسی عجیب شعاعیں ایجاد کر رکھی ہیں جن کی مدد سے وہ بارود کو پھٹنے سے روک سکتا ہے اور ان شعاعوں کی مدد سے وہ آج کل دنیا کے امن کو محفوظ کر رہا ہے۔ مگر ان سپنوں میں اس نے کبھی روپے اور حکومت کے حصول کا پروگرام نہیں بنایا، اگرچہ اسے یہ بھی پسند ہے کہ خرچ کرنے کے لئے اسے روپیہ مل جائے۔ لیکن اگر اس کے پاس بہت سارا روپیہ آجائے تو اس کی زندگی کا آدھا لطف ختم ہو جائے گا۔ آج کل اس کی صرف یہی آرزو ہے کہ اس کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہو۔ کار یا بنگلے کا مالک ہونے کی خواہش اس میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی یا حاکم تصور کرنا اسے قطعی پسند نہیں۔ چند ایک امیرانہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا بشرطیکہ اس کی موجودہ حالت جوں کی توں رہے۔ اس کی موجودہ زندگی بے پرواہی اور مفلسی کا امتزاج ہے۔ عمر بھر اس کے سامان میں ایک چٹائی، ایک بستر، ایک ٹرنک اور دو ایک کرسیاں شامل رہیں۔ اس کے گھر اور کردار کی سب سے بڑی خصوصیت بے ترتیبی ہے۔

وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھتا ہے اور اس جگہ سے اٹھ کر جہاں سویا ہوا تھا، کسی اَور جگہ پر جاکر پھر سو جاتا ہے اور پھر چائے دانی کی کھنک سنے بغیر آنکھیں نہیں کھولتا کیونکہ چائے پینے کی اسے لت ہے۔ حلق میں پہلا پیالہ انڈیلنے کے بعد اس کے ارد گرد کی دنیا بیدار ہونے لگتی ہے تا آنکہ چیزوں کی ماہیت کا تناسب پوری طرح قائم ہو جاتا ہے۔ وہ دن میں دو بار چائے کو پانی کی طرح ٹھنڈا کر کے پیتا ہے۔

سٹرانگ چائے پی پی کر اسے بار بار پیشاب کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اس شکایت سے عاجز آکر ایک دفعہ اس نے ایک مشہور و معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے ملنے کے لئے دُور دراز کا سفر اختیار کیا۔ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ بیماری اس قدر پرانی ہے کہ اسے اس کی ابتدا کی ماہیت کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا اور اب وہ اس کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جو بیک وقت معالج، فلسفی اور درویش تھا، یہ سن کر خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ پھر علاج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مفتی ڈاکٹر کی بات سے اس قدر متاثر اور محظوظ ہوا کہ دوائی لئے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زندگی کا زیادہ وقت چیزیں ڈھونڈنے میں گزرا ہے۔ مثلاً پنسل بنانے کے لئے وہ چاقو کی تلاش کرے گا اور اس تلاش کے دوران میں قطعی بھول جائے گا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ بفرضِ محال چاقو اس کے ہاتھ آجائے تو اس کی پنسل گم ہو جائے گی اور وہ اس پنسل کو ڈھونڈنے میں کھو جائے گا جو اَن جانے میں اس نے کان پر اٹکا لی تھی۔ گھر میں اسے ننگے پاؤں، اَن دھلے منہ اور بالوں کے گُنجل کے گُنجل بکھرائے پریشان پھرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے بغلگیر ہو کر رو دیں۔

کام کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا سارا وقت اِدھر اُدھر کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے میں کٹتا ہے اور کام ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند ہی سطریں لکھ کر وہ پانی کا ایک گلاس پیتا ہے اور پھر پان کھاتا ہے، پھر پیشاب کرتا ہے اور پھر پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے میں بیس سطریں لکھتا ہے، چار گلاس پانی پیتا ہے، دو پان چباتا ہے، دو دفعہ پیشاب کرتا ہے۔ اکثر دو ایک سگریٹ بھی پی لے تو مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود اگر اس کی بیوی اس چارپائی پر گنڈمنڈ شخص سے جو ہر وقت اس سے پانی، پان، سگریٹ ایسی چیزیں مانگتا رہتا ہے، تعلق قائم رکھنا چاہتی ہے تو تعجب کا مقام ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کی بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی کیونکہ ممتاز مفتی ایک اچھا خاوند ہے۔ لیکن ٹھہریئے یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.com

ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کرے اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو کہ اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے۔ اگر اسے شک پڑ جائے کہ اس سے ایک بچے کا سا سلوک کیا جا رہا ہے تو اس میں سویا ہوا مرد بیدار ہو جائے گا اور اپنی تحقیر کے خلاف جہاد کرے گا کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے عام بیویوں کا سا سلوک کرے اور ڈر کر رہے تو وہ اسے جاہل، نکمی اور بے عقل سمجھنے لگے گا۔ اسے گھریلو جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کے لئے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ لیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے زندگی میں دو بار محبت کی ہے۔ پہلی دفعہ جب وہ محض ایک نکما لڑکا تھا اور اسے اپنا کوئی بہتر مصرف سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے گرد ایک بیگانہ اور بے پرواہ دنیا بکھری پڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں نہ تو اس کی کوئی حیثیت تھی، نہ وقعت۔ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے اس نے یہ روگ لگا لیا۔ اس کی پہلی محبت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ تعمیری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اندازِ محبت بذاتِ خود تخریبی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر کے لئے اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دائمی کشمکش کی داغ بیل پڑ گئی۔ محبت کے لئے وہ اپنے اقربا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی برسرِ پیکار رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے بیک وقت مجنونانہ محبت اور نفرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی دوسری محبت در حقیقت اپنی پہلی محبت سے چھٹکارا پانے کی ایک شدید کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ لیکن حالات ساز گار نہ ہوئے اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوئی صورت نہ پا کر انتقاماً، پھر سے اسی پہلے جھمیلے میں جا پھنسا۔ تعجب کی بات یہ نہیں کہ وہ شدید ذہنی کرب اور رسوائی میں کیسے زندگی گزار سکا بلکہ یہ کہ وہ ان مشکلات کے باوجود جیتا

رہا...... اور آج ان جھمیلوں سے قطعی طور پر آزاد ہو چکا ہے۔

اس کی روزانہ زندگی میں سستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو جانتا اور اعلانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔ وہ سارا دن کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا مگر شام تک مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ بہت ضروری کام کرنا ہو تو اس وقت اس کا دل ایک ایکٹ کے ڈرامے پڑھنے کے لئے مچل جائے گا ——— نفسیاتی مقالہ لکھنا ہو تو راگ کی کتاب لے بیٹھے گا۔ کہانی لکھنے کی اشد ضرورت درپیش ہو تو نفسیات پڑھنے لگے گا۔ چھوٹی عمر ہی سے اسے راگ سے عشق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک مقامی میوزک کالج میں داخل بھی ہوا لیکن انہی دنوں کالج میں ایک مدراسی آنے جانے لگ گیا جو راگ کا دیوانہ تھا۔ اتفاقاً وہ مدراسی ہندوستانی نہیں سمجھتا تھا اور راگ ماسٹر انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی ترجمانی کرنے کا فرض مفتی کو ادا کرنا پڑا۔ وہ راگ کا دیوانہ گانے کی دھن راگ ماسٹر سے سیکھ لیتا اور پھر ممتاز مفتی سے گانے کے بول انگریزی میں ترجمہ کروا کر عجیب مضحکہ خیز انداز میں گانا شروع کر دیتا۔ "بلیبے سٹ ڈاؤن ان دا ٹرین کوائٹ لی۔ آر آئی وِل گوُیو اے سلیپ۔ بلیبے ......" اس دلچسپ راگ سکشا میں مفتی کو اس قدر مزا آنے لگا کہ خود سیکھنے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ بعدہٗ اس نے راگ کا غائر مطالعہ بھی کیا اور سُروں کے مجموعات، ٹمپرڈ سکیل، آروہی امروہی سبھی معلومات حاصل کر لیں اور اب وہ راگ کو پورے طور پر سمجھتا ہے۔ آپ صرف اسے اتنا بتا دیں کہ کیدارا گایا جا رہا ہے۔ پھر وہ فوراً اسے پہچان لے گا اور معاً اس کی وکر چال اور جذبات پیدا کرنے والے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے لگے گا۔ نہ سمجھے تو بھی وہ راگ سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کچھ دن راگ سننے کے بعد اس کے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لکھے یا کرے۔ راگ سے اسے تسکین ملتی ہے، ایسی تسکین جو اس میں ایک تعمیری اضطراب پیدا کرتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے گرد و پیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دو رخی کو

شدت سے محسوس کیا۔ وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ فطرت کی عجیب ترین چیز سے بھی عجیب تر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اردو ادب اس حیران کن دو رنگی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اردو ادب نے نفس لاشعور کی آرزوؤں کو ابھی نہیں پہچانا۔ محبت کو محض آرزو کے سوا کچھ نہیں سمجھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دل میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ممتاز مفتی زیادہ تر داستاوسکی، یونگ ایڈلر، برٹرینڈ رسل اور فرائڈ کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ نفس لاشعور کی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس لئے ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا کہ وہ ان ان کہی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں۔ پھر بھی اسے تسکین ہے کہ وہ قاری کی توجہ تو اس طرف مبذول کر سکا ہے۔

پیش لفظ

چُپ میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ اردو نے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں تقسیم سے پہلے شائع کیا اور اب فیروز سنز لاہور دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے میں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب میں سکول میں پڑھاتا تھا۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک میں مختلف سکولوں میں پڑھاتا رہا۔

۱۹۳۶ء میں، میں نے افسانہ نویسی کی ابتدا کی۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ لکھنے کا شغل اپناؤں گا۔ اردو زبان اور ادب سے میں ناواقف تھا لیکن حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ لکھنا مجھ پر عائد ہو گیا۔

لکھنے کے لئے جس موضوع کو میں نے اپنایا، اس دور میں وہ پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ خصوصاً ایک سکول ماسٹر کا ایسے موضوع پر لکھنا ناقابلِ معافی فعل تصور کیا جاتا تھا۔

اساتذہ کرام صرف اسلامی یا اخلاقی موضوعات پر لکھنے کی اجازت دیتے تھے۔

دس سال میں چوری چھپے ممتاز مفتی کے نام سے افسانے لکھتا رہا۔ سکول میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ممتاز مفتی کون ہے۔

میں نے دس سال کبھی کسی ادبی محفل میں شرکت نہیں کی تھی۔

ان حالات میں میرا مجموعہ چھپنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میرا پہلا مجموعہ ان کہی ۱۹۴۳ء میں مکتبۂ اردو لاہور نے شائع کیا۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق تھا کہ تین مجموعے تو چھپ گئے لیکن مصنف گمنام رہا۔

سکولوں میں درسی کتابوں کے پبلشر آیا ہی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آیا کرتے تھے۔ ان میں ایک صاحب چودھری برکت علی تھے۔ چودھری برکت علی بڑے منفرد کردار کا مالک تھا۔ بڑا خود اعتماد تھا۔ منہ پھٹ تھا، دلیر تھا، اساتذہ سے ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی تھا۔

ایک روز وہ مجھے انگلی لگا کر ایک طرف لے گیا۔ کہنے لگا میں تجھے ایک آفر دیتا ہوں۔ تو ہمارے لئے اردو سے انگریزی میں ترجمے کی ایک کتاب لکھ دے۔ بول کیا کہتا ہے۔

میں نے کہا چودھری کسی لائق استاد سے لکھوا۔

وہ غصے میں بولا۔ کس سے کون سی کتاب لکھوانی ہے، اس کا فیصلہ ہم خود کرتے ہیں۔ ہم پبلشرز بڑے ویل انفارمڈ ہوتے ہیں۔ تیری تنخواہ کیا ہے؟ اس نے پوچھا۔

پینتالیس روپے۔ میں نے جواب دیا۔

ہم تمہیں تین ہزار روپے معاوضہ دیں گے۔ تیری چھ سال کی تنخواہ۔ ڈیڑھ ہزار ابھی معاہدہ کرنے پر اور باقی جب تو مسودہ دے گا۔ بول کیا کہتا ہے۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔

تیرا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر۔ وہ چلایا۔

میرا دماغ ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا۔

تو پاگل ہے۔ وہ چلایا۔ ہم ایسی آفر کسی کو نہیں دیتے لیکن تُو یا تو احمق ہے اور یا پاگل۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چھ ماہ کے بعد وہ پھر آ گیا۔

انگلی سے مجھے اشارہ کیا۔ میرے ساتھ چل۔ وہ ایک ہوٹل پر رک گیا۔ بولا پہلے طعام پھر کلام۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں کہا ممتاز مفتی میں نے تیری چودہ کہانیاں حاصل کر لی ہیں۔ تین کہانیاں تو دے دے اور ہم تیرا مجموعہ شائع کر دیں گے۔

میں نے بات کرنے کی کوشش کی۔

فضول آئیں بائیں شائیں نہ کر۔ میں نے پوری تحقیق کر لی ہے اور دیکھ ہم پبلشرز راز رکھنا جانتے ہیں۔

ٹیکسٹ بک کے علاوہ ہمارا ایک ذیلی ادارہ بھی ہے، مکتبۂ اردو، جو ادبی کتابیں شائع کرتا ہے لیکن خوش فہمی میں نہ رہنا۔ مجموعے کے چھپنے پر تجھے زیادہ سے زیادہ تین سو روپے رائلٹی ملے گی۔ یوں مجھے حسنِ اتفاق سے ایک پبلشر مل گیا ورنہ ان حالات میں میرا مجموعہ شائع ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ممتاز مفتی

جولائی ۱۹۹۲ء

نیلی

ہائے ری کیسا پیارا بچہ تھا آپا کا ۔ بھورا بھورا ۔ جیسے زرد روئی کا گالا ۔ چھوٹے چھوٹے گدّے سے ہاتھ اور اتنا بڑا سر ۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لگائے پھروں ۔ پر توبہ ! بھائی جان کی امّاں نے کتنا پاکھنڈ مچایا تھا ۔ بڑی آئی تھی ننھے کی مالکہ ۔ ہونہہ ! گویا اپنی گرہ سے خریدا تھا اُسے ! توبہ اس بڑھیا کی باتیں ! مجھے تو ہنسی آ جاتی سُن کر ۔ وانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے ۔ یوں بولتی تھی جیسے بگڑی ہوئی چلی پھیپھ پھپھ ۔ بولی "پھیضہ کو نہ دو ۔ گرا نہ دے" ۔ بڑی آئی ننھے کی رکھوالی ۔ نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے ۔ جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں ۔ ہونہہ ! بھائی جان نے بہتیرا کہا ۔ لینے دو فیضو کو ذرا ۔ کیا حرج ہے ۔ لیکن وہ بڑھیا ! ! ۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ ننھے کو اٹھا کوٹھے پر چڑھ جاؤں اور ۔۔۔ اور ۔ ۔ ۔ ہائے میں کیوں پھینکتی اسے ، کلیجے سے نہ لگائے رکھتی ۔ ایسا پیارا بچہ ہے نیلی نیلی کانچ سی آنکھیں ۔ زعفرانی رنگ اور پھر لانبے سنہری بال جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتی ہی رہوں ۔ گُتھا تھا گُدا ۔ ذرا نہ روتا تھا بس رونی صورت بنائی ہونٹ نکالے اور آنکھیں ! ! ۔ ۔ ۔ اس وقت اس کی آنکھیں ! ! ۔ ۔ ۔ جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو ۔ اور پُھول سی آنکھیں ۔ جیسے کوئی سبز پھول کِھل گیا ہو ۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا ۔

ننھے کی آنکھیں تو اک تماشا بنی ہوئی تھیں ۔ جو کوئی آتا اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا ۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ تھا ۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کی آنکھ نیلی نہیں اور پھر ایسی نیلی ۔ ۔ ۔ یہ بات بھی سچی تھی ۔ آپا کا بیاہ اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا ۔ بھائی جان ، آپا اور میرے پھوپھی زاد تھے ۔ اور ہمارے گھروں میں تو سب "کل نینے" تھے ۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شربتی جھلک مارتی تھی وہ بھی صرف مسکراتے وقت ، مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے ۔

آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ ! اور توبہ ! ۔ ۔ ۔ کیسی موٹی موٹی !! آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا ۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا میں تو سُن ہو جاتی تھی ۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ جاتا ۔ اور میں چیختی ۔ ہم پر تو نہ نکالا کرے کوئی آنکھیں ۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے ۔ "نہ بھئی صفی ۔ فیضو کو نہ دکھایا کرو آنکھیں" ۔ "واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں" ۔ میں کہتی ۔ اور وہ بن کر کہتے توبہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہے تو اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے ۔ اور تم ! تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے ۔ "اوں" میں چڑ کر کہتی "کہاں پڑتی ہے پھوار ۔ میں جانتی ہوں بناتے ہیں آپ" پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا ۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی ۔ اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے ۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی ۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دلہن سے کیا کرتا ہے ۔ پھر وہ کچھ اور کہتے تو میں چیختی "بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی" ۔ پر میرے دل میں ذرا بھی غصہ نہ آتا ۔ ویسے میں یوں منہ موڑ لیتی جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لئے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا ۔ میں جانوں ۔ ۔ ۔ مجھے نہیں پتہ کیوں ۔ ۔ ۔

توبہ ! بھائی جان کی اماں نے ننھے کی آنکھوں پر کیا پاکھنڈ مچایا تھا ۔ بولی "یہ انگریج کہاں سے آ گیا ۔ اوئی اماں دیکھو تو" نجمہ چلاتی "اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں ۔ توبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! اور آپا بولتی "آنکھیں نہ ہوئیں گرگٹ ہوا" ۔ ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی "دیکھو تو بی بی کیسا جافرانی رنگ ہے ۔ اور بال تو سونے کی تاریں ہیں" ۔ "اونہوں" بڑھیا بڑبڑاتی ۔ "یہ تو لاکھے سنہری ہیں" ۔ آپا ان کی باتیں سُن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی ۔ شرمانے کی بات ہی کیا تھی اس میں ۔ آخر سبھی کے ہاں بچے ہوتے ہیں ۔ پر آپا کا پہلا تھا تھا نا ۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں جیسے گھٹا چھا جائے ۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چہرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی ۔ آپا بھی عجیب ہے ۔ پر میں جانوں گھبرانے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی ۔ لیکن چھپ چھپ کر ۔ پھر کوئی نہ کوئی چلا اٹھتی ۔ "نہ جانے کس پر گیا ہے ننھا ۔ پورا انگریج ہے انگریج" ۔ یا

کوئی ناواقف آتی تو وہ ننھے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی ۔ اور پھر ننھے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو ۔ جبھی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا ۔ اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی "توبہ یہ میرا سر کھا جاتی ہیں" ۔

ننھے کی آنکھوں ۔ رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی خاموش تھا ۔ تو وہ بھائی جان تھے ۔ ۔ کسی نے ننھے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ بہانے بہانے اٹھ کر وہ گئے ۔ جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں ۔ بات سن کر ان سنی کر دیتے تھے ۔ اور گھر میں تو بس یہی اک بات چلتی تھی ان دنوں ننھے کی آنکھیں رنگ اور بال سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے ۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ننھے کی طرف ۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا ۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں ۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید جانتے ہوں ۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے ہوں ۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سُن کر دکھی کیوں ہو جاتے تھے ۔ جیسے پھوڑے کو چھیڑ دیا جائے ۔ اور اس وقت مسکراتے بھی تو وہ کیا مسکراہٹ ہوتی ۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی !!

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب اماں کہنے لگیں "پھیضہ کس پر گیا ہے ننھا" اور انکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی ۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے ۔ پھر آپا بولی ۔ "مجھے کیا معلوم انہیں سے پوچھیئے" ۔ اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکرانے ۔ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا ۔ بڑی اماں کب چھوڑنے والی تھی ۔ بولی "کیوں جلیل کس پر گیا ہے ننھا ۔ دیکھ تو ذرا" بھائی بولے "اماں میں پوچھتا ہوں وہ میرا پن کہاں گیا ۔ جانے کس نے اٹھا لیا ہے ۔ کیا مصیبت ہے" ۔ "اے ہے جائے گا کہاں مل جائے گا ۔ تو ذرا اپنے بیٹے کو تو لے ۔ دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے" ۔ "لیکن گیا کہاں میرا پن" بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

"توبہ یہ آج کل کے لڑکے" ۔ بڑی اماں بڑبڑاتی ۔ "بیٹے کے نام سے

Engr. Faraz Akram
kitaabyat.blogspot.com

تو چڑ ہے انہیں اور اس کی اماں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھریں ۔ آپا تڑپ کر مڑی ۔ اس نے نگاہ بھر کر بڑی اماں کی طرف دیکھا ۔ توبہ وہ ایک نگاہ ! جیسے چیخیں بھری ہوئی ہوں ۔ پھر آپا نے منہ موڑ لیا ۔ بھلا بڑی اماں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ ۔ آپا بھی تو پگلی ہے ۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے مٹی کی ۔ وہ تو کہی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیٹو ۔ نہ جانے سبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں ۔ ہائے ۔ مجھے تو موت آجائے بڑھاپا نہ آئے ۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں ۔ یوں مر کر جینے کا مزہ ؟

آپا کے دکھ کو کون نہیں جانتا ۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کرے تو ؟ پر جانتے سبھی ہیں ۔ گو آپا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے ۔ بس یہی ہے نا ، کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹا کو چھپا لیا ۔ اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی ۔ یا بھائی جان نے آپا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھیڑ دیا اور آپا کا سوال ان سنا کر دیا ۔ اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے ۔ تو ایک آن کے لئے آپا کی آنکھیں چھلکیں اور پھر تیرنے لگیں ۔ اور اُس نے منہ موڑ کر اس چھوئی جوڑے کو چھپا لیا ۔ اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھی ۔ وہ سمجھتی ہوگی میں بچہ ہوں ۔ مجھے ان باتوں سے کیا ۔ کیوں میں کیا بچہ ہوں ۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور ابھی بچہ ۔ وہ تو خود بچہ ہے ۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی ۔ ۔ ۔ سبھی اندھے ہیں ۔ ۔ ۔ کیا آپا اور کیا کوئی اور ۔ امی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات ۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی ۔ کیوں رہوں ؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے ؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں ۔ آپا تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے ۔ جبھی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے ۔ فیضو تو بھی کریدے بنا نہ رہ سکی ۔ توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دینا ۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ ۔ کیا امی اور کیا ابا ۔ کہتے ہیں کھاؤ پیو ہنسو کھیلو لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو بہرے بن جاؤ ۔ اندھے ہو جاؤ ۔ اور سُن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی بلی بنی بیٹھ رہو ۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔

نا بھئی ۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی بلی ۔ اس سے تو ویرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے ۔ نہ بھئی ہم سے تو جیتے جی مرا نہ جائے گا ۔ کہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو ۔ سُن لینا پر نہ جانتا ! تو بھی !! یہ بھی ہو سکتا ہے کیا ۔ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے ۔ مزا تو جب ہے کہ بات سُن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ بیتی ہو ۔ پھر پتہ چلتا ہے بات کا ۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر ناچنے نہ لگے ۔ یا کچھ توڑ پھوڑ نہ دے ۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے ۔ وہ نجمہ ہی ہے ۔ بھیگی بلّی !! : جو سنتی بھی رہتی یوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کہیں کی !! ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپا سے بیاہ کرنے پر راضی نہ تھے ۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپا سے جوڑ دیا ۔ جیسے ٹانگے میں ٹٹو جوڑ دیتے ہیں ۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے ۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے ۔ جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں ویسی ہی ہے یہ شادی ۔ بھائی جان بھی تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر ۔ جیسے بڑے اصیل

ہوں ۔ توبہ ! کیسے مکار ہوتے ہیں مرد ۔ کتنے بہروپ دھار سکتے ہیں ۔ پر اُڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی ۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات ۔ جو بھی آتی امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی ۔ اور جب بھی کوئی امّی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی اور پھر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی ۔ اور مجھ سے کہتی ”اے ہے لڑکی تم اب کھیلو نا جا کر“ ۔ اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی ۔ ”فیضہ بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر“ تو میں جھٹ تاڑ جاتی کہ کوئی بات ہوگی ۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چیونٹیاں چلنے لگتیں ۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو ۔ سُر سُر کر رہی ہو ۔ بات، بات ، بات ، اور دل یوں بجتا ۔ سن ! سن ! سن ! پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لئے ۔ دیوار کے پیچھے کھڑکی کی اوٹ میں ۔ باورچی خانے کی ڈولی کے پیچھے ۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں ۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھڑکی کی درز میں سے ۔ وہاں سے تو کہنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ہائے

بات سن لینا پر کہنے والی کو نہ دیکھنا !! نہ جی ہم تو کبھی نہ سنیں روکھی بات جو صرف کان میں بھنبھنائے اور بس ۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی بغیر کھائے حلوہ نگل لے ۔ جب وہ ہاتھ چلاتیں ۔ منہ بناتیں آنکھیں چمکاتیں اور انگلی ہونٹ پر رکھ لیتیں تو بات میں جان پڑ جاتی تھی ۔ اور بن دیکھے سوکھی بات ۔ جیسے مری ہوئی ہو ۔ جیسے کھٹائی بنا چٹنی !

ایک بولی ۔ ”لو سنا تم نے بی بی ۔ یہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ لیکن وہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آئے ہائے ۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔ سُنا ہے لڑکا تو مانتا ہی نہیں ۔ کہتا ہے میں تو ساری عمر کنوارا رہوں گا ۔ لو بی بی بھلا یہ بھی سنا ہے کبھی ساری عمر بھی کنوارا رہ سکتا ہے کوئی ۔ توبہ بی بی آج کل کے لڑکے ! جب تک بیاہ نہ ہو ”تو کنوارا رہوں گا میں“ اور ہو جائے تو بیگم کے بغیر دم نکلتا ہے“ ۔

دوسری نے کہا ۔ ”چاہے تم بُرا ہی مانو پر سبھی کہتے ہیں لڑکے کو کسی سے محبت ہے ۔ اسکول کی ہے کوئی ۔ ہائے ری یہ اسکول کی ۔ توبہ ان کے ہتھے نہ چڑھے کوئی لسوڑی کی گٹھلی کی طرح چپک جاتی ہیں“ ۔

تیسری ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولی ۔ ”میں تو سچی کہوں گی چاہے کوئی مانے نہ مانے ۔ ہاں میں نے تو نمخ خایا ہے اس گھر خا ۔ لڑخے خے لچھن اچھے نہیں دخیں ہیں مجھے“ ۔

اور امی کہتی ۔ ”اچھا جو لڑکی کے نصیب میں لکھا ہو گا ہو جائے گا ۔ اب تو ہم نے ہاں کہہ دی ہے بہن ۔ اُگلی بات کو پھر کیسے نگل جاؤں ۔ اب بس اللہ ہی کارساز ہے بہن“ ۔

ہونہہ کارساز ! جیسے اللہ کو کوئی اور کام ہی نہ ہو ۔ توبہ ایسے سمے امی یوں بن جاتی تھی ۔ جیسے کسی فرشتے کے پر اکھڑ گئے ہوں ۔ بڑی حاجن تو دیکھو ۔ اور ویسے ابا سے بات ہو تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں ۔ اس وقت اس کے کارساز اللہ کہاں ہوتے ہیں ۔ توبہ کیا مکر بنانے آتے ہیں بڑوں کو ۔

آپا نے بھی سن لی تھی بات ، نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا تھا اسے بیٹھے بٹھائے ۔ پر سن بھی لی تو کیا ۔ اس کے منہ میں زبان بھی ہو ۔ بس آنکھیں چھلکانا ہی جانتی ہے ۔ دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور آنسو گرا دیا یا پی گئی ۔ اور پھر اٹھ کر کوئی کام لے بیٹھی جیسے کام بُھلا سکتا ہو بات کو ۔ ہم سے تو نہیں بھولتی چاہے ہزار کام لے بیٹھیں ۔ اور ہزار تو کیا ایک بھی لے بیٹھیں تو ستیاناس کر کے رکھ دیں ۔ مجھے تو بات کا بخار چڑھ جاتا ہے ۔ پھر کام کیسے کروں ۔ کام کونین تو ہے نہیں اگرچہ کڑوا ضرور ہوتا ہے ۔ پر آپا !

ابا بولے ۔ ”آپ ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں یہ لڑکے ۔ بیاہ ہو لینے دو“ ۔ ابا تو بس مونچھوں کو تاؤ دینا ہی جانتے ہیں ۔ تاؤ دیا اور سگار سلگا کر بیٹھ گئے ۔ یا ہم پر رعب چھانٹ لیا اور امی کے سامنے چوہے کی طرح دبک گئے ۔ وہاں چلے بھی رعب ان کا ۔ اور امی ! توبہ اسے کیا کیا گر یاد ہیں ۔ صبح و شام بیسیوں سنی اور یوں پی گئے جیسے شربت کے گھونٹ ہوں ۔ اور پھر چوٹ تبھی لگائے گی ۔ جب لوہا لال ہو ۔ جب موقعہ آیا تو بیگم بن ٹھن کر بیٹھ گئی ۔ ہائے کیسی پیاری لگتی ہے امی جب وہ بن ٹھن تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہے ۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں اُس کے ۔

پہلی مرتبہ جب آپا سسرال آئی تو امی نے مجھے بھی بھیج دیا ساتھ ۔ آئی تو بڑی چاؤ سے تھی پر توبہ ہے پرائے گھر میں یوں آ بیٹھنا ۔ میرا جی چاہتا تھا چیخیں مار کر رو پڑوں ۔ میں تو پھر بھی نجمہ سے کھیل کر وقت کاٹ لیتی ۔ اور دن میں چار چار بار اپنے گھر سے ہو آتی پر آپا !! یوں گٹھڑی بن کر پڑی رہی گویا جان نکل چکی ہو ۔ کسی نے پلہ اٹھا دیا تو منہ دیکھ لیا ۔ کسی نے ہاتھ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا تو وہیں پڑا رہا ۔ جیسے مسالے کی بنی ہوئی جاپانی گڑیا ہو ۔

توبہ ! اس روز گھر میں ایک قیامت دبی ہوئی تھی ۔ بڑی اماں بھائی جان کے ابا کے کان میں منہ دیئے بیٹھی تھی ۔ نجمہ بانو سے پوچھ رہی تھی اور بانو مسکرا کر کہتی ”چپ کوئی سن لے گا ۔ اور بھائی جان چارپائی پر پڑے تھے ۔ اور ان کے بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں دبی زبان میں چیخ رہے تھے ۔ ”اگر تمہیں گھر کی

kitabiyat.blogspot.com

لاج کا خیال نہیں، تو پھر یہاں رہنے کا مطلب" ۔ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی منتیں کر رہی تھیں ۔ "آپ ہی سمجھ جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ اے ہے جوان لڑکا ہے ۔ اگر ۔ ۔ ۔ !!" پھر ماں بیٹے کے پاس گئی ۔ منتیں کرتی رہی ۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے ۔ اور لگے گھورنے ۔ بہت چھپا چھپا کر کر رہے تھے بات ہونہہ ! ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی بگڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے ۔ میں سب سمجھتی تھی ۔ آپا کو زبردستی اس ڈھول پر منڈھ دیا تھا ۔ اور آپا ۔ دم پخت دیگ کی طرح ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی ۔ جیسے لجائی ہوئی ہو ۔ ہونہہ لجائی ۔ ۔ ۔ میں کیا جانتی نہیں ۔ سبھی یونہی بھیگی بلی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سسرال میں ۔ جیسے بہت لجا رہی ہوں ۔ بڑی لجانے والی !! چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں ! اس لئے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مزا آتا ہے ! نہیں ۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ناچنے نہ لگیں خوشی سے ۔ ۔ ۔ پر آپا !! آپا کس بات پر لجاتی ۔ میں نے ایک بار پلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو ! اتنا بڑا آنسو ۔ ۔ ہائے میرا دل بیٹھ گیا اور میں لپٹ گئی آپا سے ۔ اپنے اپنے انداز ہیں کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں ۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی ۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے ! میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی کبھی ڈولی کے پیچھے کبھی میز کی اوٹ میں تب کہیں جا کر پتہ چلتا کہ بات کیا ہے ۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کان میں ریڈیو لگا ہو ۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور ایسی ویسی ہو تو چھلکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی ۔ بیٹھے بٹھائے بات پا لینے میں اُسے کمال حاصل تھا ۔ ایک دن مجھ سے بولی ۔ "فیضی یہ کیا عادت ہے تیری ۔ یوں لوگوں کی باتوں پر کان لگائے رکھنا ۔ کسی کی بات میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا" ۔ مجھے غصہ آگیا میں نے کہا ۔ "پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے ۔ بڑی مکّے سے آئی ہوئی تو دیکھو" اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا ۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرایوں کی طرح پیش آئے ۔ ایک جگہ بھی

تو نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں ۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے ۔ اور وہ باہر آگئی تو یہ کمرے میں چلے گئے ۔ بہانے بہانے ۔ ہائے بیچاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی تھی اس کے بعد آپا کو چپ لگ گئی نہ جانے کیا ہو گیا اسے ۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی ۔ "اوہ ۔ میں تو بھول ہی گئی ۔" اور باہر نکل گئی ۔ اور وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی ۔ لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے لیکن توبہ آپا ۔ ۔ ۔ آپا جل جانے والی کہاں وہ تو سلگنا جانتی ہے اور بس ۔ بھئی ایسا بھی نہ ہو کوئی ۔ اٹھتی اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی انہیں ۔ جیسے جی چاہتا ہو ۔ اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں ۔ نہ جانے کے لئے بہانہ ڈھونڈتی تھی ۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے ۔ عورتیں کیوں مرمٹتیں ہیں ۔ ریجھ جاتی ہیں ۔ اور ویسے دیکھنے میں چھوئی موئی ۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے ۔ نخرو ۔ بھئی میں تو کبھی نہ یوں مرمٹوں کسی پر ۔

آخر بھائی جان کی اکڑفوں ٹوٹ ہی گئی ۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی ۔ جیسے بڑی آپا کے گھر میں ۔ ۔ ۔ ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میلا لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈپو کھلا ہو ۔ یہ آئی ۔ وہ گئی ۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں ۔ اک تماشا لگا رکھتے ہیں ۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھاگی اب وہ پکڑ رہے ہیں ۔ اب چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹ رہے ہیں ۔ اور اُس نے چیخ ماری ۔ جیسے کوئی مر رہا ہو ۔ ادھر پڑوس میں دیوار پر سے اماں نصیبن جھانکی ادھر چوبارے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آکھڑی ہوئی ۔ کیا ہوا کیا ہوا ۔ اور یہ ہیں کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں ۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تکئے کیوں پسند ہیں ۔ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے ۔ اور وہ چلائے گی کیوں میں کیا تکیہ ہوں ۔ نہیں نہیں گاؤ تکیہ نہیں میں تو چھوٹے سے تکئے کی بات کر رہا ہوں ۔ اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا ۔ اور میں ان کے کہنے پر ٹنچر کی پھریری لائی تھی تو بولے ۔ "فیضی یہ

کیا مذاق ہے ۔ اس پھریری سے کیا بنے گا ۔ بیٹی بوتل ہی اٹھا لاتی“ ۔ ”بوتل ۔ کیوں ؟“ میں نے ویسے ہی پوچھا ۔ بولے ”اوہ نہیں سمجھتی یہاں تو پہاڑ لینا ہے پہاڑ“ ۔ اور بڑی آپا غرائی ۔ ۔ ۔

توبہ اُس گھر میں قہقہوں کے پٹاخے چھوٹتے ہیں ہر وقت اور یہ گھر ۔ بس برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ اُوٹی ہوئی بجکی پھپ پھپھ ۔ پھپھ ۔ پھپھ ۔ اور بس ۔ آپا نے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا مٹر گوشت بنا لوں ۔ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے ۔ بنا لو ۔ یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ رومال تو بہت میلا ہوگیا ہے ۔ اور آپا بولی ”ابھی دھوئے دیتی ہوں“ ۔ پر ہزار شور ہو ۔ چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا کتنی باتیں کر رہی ہوں ۔ لیکن بھائی نے ہونٹ ہلائے اور آپا کے کان کھڑے ہوئے ۔ وہ آپس میں بات کر بھی لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا ۔ آپا تو شائد اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو ہلی بات کرنے کو ۔ بولنا تو سیکھ لیا ۔ اور آپا ۔ ۔ ۔ حد کر دی آپا نے تو ۔ بھائی نے بات کر دی تو سن لی ۔ نہ کی تو نہ سہی ۔ ان کے ہونٹوں کی طرف تکتے رہنا ۔ ہائے کیا غلامی ہے ۔ آپا تو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی ۔ آپا کی اس بات پر یا نہ جانے کیوں کئی بار بھائی جان ٹھٹھک جاتے اور پھر اک بھرپور نگاہ ڈالتے اس پر ۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آپا مسکراتی ۔ چھپی چھپی مسکراہٹ ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے ۔ بس ہاں جی ۔ جی ہاں ۔ اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی ۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آپا پر ۔ اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پہاڑی کے اندر ہی اندر راستہ بنا رہا ہو ۔ ہائے ری مکار آپا ۔

اس روز بھائی جان کسی قدر پریشان تھے ۔ میں نے انہیں کبھی یوں بیقرار نہ دیکھا تھا ۔ کبھی لیٹ جاتے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے پھر آپا کے کمرے میں جھانکتے اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لئے ادھر ادھر دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے ”تم ہو فیضو ۔ اچھا ۔ اچھا“ ۔ اور پھر چلے

جاتے ۔ آپا بھی تو حیران تھی ۔ ۔ ۔ آخر شام کے قریب وہ بولے ”صفی کل مہمان آئیں گے ۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی ۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں ۔ اچھا میں پھر بات کروں گا تم سے“ ۔ اور وہ چلے گئے ۔ آپا نے آنکھیں کھولیں ۔ میرا مطلب ہے اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرا دی ۔ عجیب مسکراہٹ تھی وہ ۔ تعجب خوشی اور غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ وہ چلے گئے تو آپا بڑبڑائی ”ہوں ۔ ۔ ۔ میں جانتی تھی کہ ایک نا ایک دن آئیں گے ۔ آہی جائیں تو اچھا ہے“ ۔ پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی ۔ ”تو یہیں بیٹھی ہے فیضو“ ؟ ”کون آئیں گے“ ۔ میں نے آپا سے پوچھا“ ۔ ”ہوں گے نا کوئی ۔ تم بھی دیکھ لینا“ ۔ وہ مسکرائی ۔ میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا ۔ ”ہوں تمہاری سہیلی ہوگی کوئی“ ۔ آپا بہت ہنسی ۔ ہنستی ہی گئی ۔ توبہ ایسا بھی کیا ہے خواہ مخواہ دوسرے کو شرمندہ کر دینا میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی ۔ پھر بولی ”ہاں میری ہی تو ہے“ ۔ میں چڑ گئی تھی ۔ میں نے کہا ”چاہے کوئی ہو تمہاری سہیلی ہو یا ان کی دوست ۔ ہمیں اس سے مطلب“ ؟ اور آپا پھر ہنسنے لگی ۔ کہنے لگی ”میری سہیلی جو ہوئی سو ان کی بھی تو ہونی ہوئی کچھ“ ۔

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ ہمارے کمرے میں جھانکا ۔ اس کمرے میں آپا اور میں سوتے تھے پہلے بانو بھی سویا کرتی تھی یہیں آپا کی چارپائی اور ننھے سے کھٹولے لگے پڑے اس کونے میں ۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی ۔ پھر آپا نے کہا ۔ ”بانو اب میں اچھی ہوں ۔ جب ضرورت پڑے گی بلا لیا کروں گی“ ۔ بس پھر ہم دونوں رہ گئے یہاں ۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا ۔ دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا ۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی ۔ ”بھائی جان کب آئیں گی وہ مہمان“ ۔ بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی مسکراتی ہوئی ۔ پھر بھائی جان بولے فیضو کو الہام بھی ہونے لگا اب ۔ بڑی مشکل ہوگئی“ ۔ ”میں نے کہا ۔ میں کیا جانتی نہیں آپا کی سہیلی آئی“ ۔ ”تو پھر پوچھ اپنی آپا سے“ وہ بولے ۔ پھر وہ آپا سے بولے ۔ ”صفی تمہیں نیند تو نہیں آئے گی“ ۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرائی ۔ اور وہ بولے ۔ ”نہیں اگر تمہیں نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں“ ۔

اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا پھر آپا کی طرف میں سمجھ گئی ۔ کہ بس اس بات کی انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں ۔ پھر کیا تھا ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ لگی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھر سی پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی ۔ توبہ ! ایسے سمے کیا مجال کہ ذرا سی بھی ہل جاؤں ۔ چاہے لاکھ چیونٹیاں رینگیں ۔ کھجلی ہو ۔ اونہوں ۔ ۔ ۔

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا ۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درز رکھ لی تھی ۔ جس میں سے دیکھ بھی سکوں ۔ وہ بولے ۔ "فیضو سو گئی" ۔ "فیضو" آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی ۔ میں چپ ۔ بھائی نے اطمینان کا سانس لیا ۔ بولے "یہاں بیٹھ جاؤں میں" آپا ذرا پرے سرک گئی ۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے ۔ میں جانوں وہ گھبرا رہے تھے ۔ شائد اس لئے کہ کیسے شروع کریں بات ۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے ۔ آپا بھی تاڑ گئی ۔ اور آپ ہی چھیڑ دی اس نے ، بولی "کب آئیں گے مہمان فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ" "نہیں نہیں ٹھیک ہے" وہ بولے ۔ "تم نے سچ کہا تھا ۔ وہ کل آ رہی ہے ۔ کل رات کو ۔ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا صفی ۔ ۔ ۔ نہ جانے وہ کیوں آ رہی ہے" ۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے ۔ "کسی گاؤں میں جانا ہے ۔ ضروری کام ہوگا ۔ کل رات یہاں پہنچے گی ۔ پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی ۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی ۔ لیکن وہ ویٹنگ روم میں ٹھہر سکتی تھی ۔ نہ جانے کیوں یہاں گھر آکر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے ۔ اف اس کی ضد ۔ ۔ ۔ !!!" بھائی نے کہا ۔ "اس کی ضد کون توڑے گا ۔ اس کی ضد نے تو کیا کیا توڑ کر رکھ دیا ۔ اُسے بھی توڑ دیا ۔ لیکن" وہ غصے میں بڑبڑائے "اب آنے کا مطلب ۔ یہ میں پسند نہیں کرتا ۔ نہ جانے کیوں آ رہی ہے وہ" ۔ "بلکہ اچھا ہوا" ۔ آپا بولی ۔ "مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی" ۔ یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے ۔ "تم نہیں جانتیں صفی" ۔ "میں جانتی ہوں" ۔ وہ بولی "مجھے معلوم تھا وہ آئے گی ۔ ضرور آئے گی ۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی" "تم" بھائی جان نے آپا

کی طرف دیکھا ۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو ۔ وہ گھبرائے ۔ "صفی ۔ تم جانتی نہیں ۔ "ہاں ہاں میں جانتی ہوں" میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا ۔ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گا صفی" ۔ "میں جانتی ہوں" آپا بولی ۔ اسنے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی ۔ "صفی" بھائی نے حیرانی سے دیکھا ۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبریز تھی ۔ "کچھ دن کیلئے یہاں ۔ ۔ ۔" وہ زیادہ کچھ نہ کہ سکے ۔ آپا بولی ۔ "انہیں روک لیجیئے گا" ۔ کچھ دیر اکٹھے رہیں گے ۔ مجھے مدت سے آرزو تھی" ۔ "نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو صفی ۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ۔

بس وہ تمہاری طرح ہے ۔ تمہاری طرح" بھائی بولے "میری طرح ۔ ۔ ۔ ؟ میری طرح" ! آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا ۔ طنز کی دھار تھی اور چیخ پکار بھی ۔ ہائے ۔ آپا کی وہ ہنسی ۔ میں تو کانپ گئی ۔ "ہاں" بھائی بڑبڑائے ۔ "تمہاری طرح بے داغ ۔ اجلی ۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے ۔ وہ سب سے الگ تھی ۔ باقی لڑکیاں تو چاؤ چونچلے کرنے میں لگی رہتیں ۔ لیکن نیلی اس کا نام ہے عیسائی ہے نا وہ ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں ۔ نیلی" ۔ بھائی مسکرائے ۔ معاً آپا نے مجھے کی طرف دیکھا ۔ "نیلی کسی سے نہ ملتی تھی اس میں اک آن تھی ۔" بھائی نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا ۔ "مجھے اس کی یہی بات بھا گئی ۔ ہم اکثر اکٹھے بیٹھے رہتے ۔ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا ۔ گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے لیکن کیا مجال جو کوئی حرکت ہو ۔ فضول بات ۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے" ۔ "میں سمجھتی ہوں" ۔ آپا نے کہا ۔ بھائی ہنسنے لگے ۔ "ایک دفعہ میں نے کچھ کہہ دیا تھا ۔ ویسے ہی مذاق میں اُف کس قدر بگڑی ۔ بولی ۔ مسٹر جلیل ۔ میرے خیال میں آپ یہاں آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ہفتہ بھر تک اس کا غصہ نہ گیا ۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پیغام دے دیا ۔ شادی کرنے میں تو اسے اعتراض نہ تھا ۔ لیکن بڑی کڑی شرط تھی اس کی ۔ کہنے لگی ۔ "مسٹر جلیل "پروپوزل" دینے سے پہلے یہ جان لیجیئے کہ میں شادی اپنے ہم مذہب ہی سے کروں گی ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس کے لئے وہ کام بھی کر سکتا تھا جو کسی کے لئے کرنے کو تیار نہ ہوتا ۔ لیکن مذہب بدلنا ! یہ مجھے

kitabiyat.blogspot.com

گوارا نہ تھا ۔ ہزار منتیں کیں ۔ کہا "نیلی تم میری ہی نہیں اپنی زندگی بھی برباد کرو گی" ۔ پر ۔ ۔ ۔ اس کی بات اٹل تھی ۔ کہنے لگی "میں جانتی ہوں ۔ اس سے زیادہ جانتی ہوں ۔ شائد ۔ شائد میں کبھی کسی سے بیاہ نہ کر سکوں ۔ لیکن مسٹر جلیل محبت کبھی کچھ نہیں ہے اس دنیا میں ۔ محبت ایک ذہنی فتور ہے ۔

لیکن اس کائنات میں اس سے بڑے بڑے جہاں بھی ہیں۔

چھ مہینے کے بعد جب میں پھر اس سے ملا تو کہنے لگی ۔ "بہتر ہے کہ اب یہ چنگاری یا تو بجھ جائے یا بھسم کر ڈالے ۔ اب بار بار مل کر اسے بھڑکانا اچھا نہیں ۔ ان دنوں وہ کس قدر لاغر ہو رہی تھی ۔ اس کی ماں کہتی تھی اسے دق نہ ہوا تو کہنا ۔ لیکن اپنی ضد کی پکی ہے ۔ یہ بات اس نے سن لی ۔ کہنے لگی ۔ "اماں ۔ دق نہ بھی ہو تو کیا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا ۔ ۔ ۔ بس ایک ہی افسوس ہے مجھے ۔ صرف ایک بچہ" ۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں "بھائی نے بہانے بہانے آنکھیں پونچھ کر کہا ۔ توبہ میں تو بھائی کی حالت دیکھ کر سن ہو رہی تھی ۔ نہ جانے لوگوں کو آپ جلنے اور کسی کو جلانے میں کیوں مزہ آتا ہے ۔ مجھے معلوم نہ تھا بھائی اس قدر دکھی ہیں ۔ "نہ جانے اب وہ کیوں آ رہی ہے" ۔ بھائی اٹھ بیٹھے ۔ "ضد ۔ اور کیا ۔ لیکن صفی ۔ یہ نہ بھولنا کہ اب ۔ اب بے سود ہے ۔ اب میں تمہارا ہوں ۔ صرف تمہارا ۔ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں آ سکتا" ۔

بڑی اماں نے سنا تو پھپھ پھپھ کر کے بولی ۔ "نہ جی میں نہیں جانتی سہیلی وہیلی ۔ توبہ ۔ ۔ ۔ کیا زمانہ آیا ہے" "یہ ویسے ہی چھیڑ رہے ہیں سہیلی تو میری ہے" ۔ آپا بولی ' چاہے کسی کی ہو" ۔ بڑی اماں بولی ۔ "پر ہے تو کافر میں تو کسی کافرہ کو منہ نہ لگنے دوں گی بچہ زچّہ کے ۔ نہ بھئی ۔ یہ شگن اچھا نہیں ہوتا ۔

اس روز میں نے دوپہر کو جی بھر کر سو لیا ۔ جانتی تھی نا کہ رات کو وہ آنے والی ہے ۔ ہائے کس قدر چاؤ تھا مجھے اسے دیکھنے کا ۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ دیکھوں تو کیسی ہے ۔ بڑی پھبن ہو گی ۔ کالج کی جو ہوئی ، ہائے میری تو جان

جاتی ہے ان کالج والیوں پر ۔ کس طرح بات کرتی ہیں ۔ جیسے شربت کے گھونٹ پی رہی ہوں اور پھر ان کا چلنا پھرنا ۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے لے اور رنگ !! رنگوں کے چناؤ میں تو حد کر دیتی ہیں ۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے عشق ۔

اپنا کمرہ خالی کر دیا ۔ وہاں اس بیگم کی چارپائی ڈلوا دی اور اپنی چارپائی ہمارے کمرے میں لے آئے ۔

توبہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے ۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے ۔ اور آپا کروٹیں لے رہی تھی ۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو ۔ ۔ ۔ نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے ۔ اور میرا دل لگا دھک دھک کرنے ۔ میں نے رضائی میں سے دیکھا ۔ پر ۔ ایسی جگہ پر تھی میری چارپائی کہ وہ نظر نہ آئی ۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی ۔ لیکن ہلتی کیسے ۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی ۔ جیسے نیند میں بیہوش ہو کوئی ۔ ہلتی تو آپا کو پتہ چل جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ اُدھر اُن دونوں کا جھگڑا شروع تھا ۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی ۔ کیسا لوچ تھا ۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس گھلے ہوں ۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے ۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے ۔ "اگر کچھ ہو گیا اسے تو سب سمجھیں گے کہ بس تم ہی کچھ کر گئی ہو" وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی پر میں جانوں اسے آپا اور ننھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا ۔ توبہ ! اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے وہ کہ سنی نہ جاتیں ۔ کبھی کوئی لفظ کان میں پڑ جاتا ۔ آپا بھی تو بار بار کان سے بال ہٹاتی تھی ۔ گو دیکھنے میں چپ پڑی تھی وہ یوں کھوئی ہوئی تھی کہ ننھے کو تھپکنا بھی بھول گئی تھی ۔

"ہاں" ۔ اس کی آواز آئی ۔ "اب میں نے جان لیا ہے" ۔ اس نے اک آہ بھری ۔ "اس بات میں مذہب کو لانا یہ میری بھول تھی ۔ لیکن ۔ ۔ ۔"

"نہیں نہیں" بھائی جان تڑپ کر بولے ۔ "اب ۔ اب اس بات کو ۔"

kitaabyat.blogspot.com

"ہاں ۔ اب !!" وہ ہنسی ۔ دھار سی تیز ہنسی ۔ گویا وہ دھار اپنے آپ کو کاٹ رہی ہو ۔

"یہ تم نے کیا کیا" بھائی اٹھ بیٹھے ۔ "اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ ۔ اوہ ۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا نیلی ۔ پھر سے مجھے ۔ ۔ ۔ "

"پھر سے" وہ ہنسی ۔ "ہاں ۔ آپ کے لئے تو پھر سے ہے ۔ ۔ ۔ لیکن یہاں جب اور اب سب ایک تار سے بندھے ہیں ۔ پھر تو ہوا ہی نہیں" ۔

"نیلی" بھائی چلائے ۔ "تم اب آرام کرو ۔ تھکی ہوئی ہو" ۔

"ہاں ۔ چُور ہوں چُور ۔ ۔ ۔ لیکن میں مسٹر جلیل سے ضرور ملوں گی چاہے کچھ ہو ۔ میں آپ اندر چلی جاؤں گی" ۔

"نہیں نہیں آج نہیں" ۔ بھائی بولے "اگر صفی کو اعتراض نہ ہوا تو کل بڑی اماں سے چوری ۔ ۔ ۔ "

"اور بچہ ۔ وہ تو مجھے دے دیجئیے ۔ وہ میرا ہے ۔ مسٹر جلیل !!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" ۔ بھائی بولے ۔

"آخر میں کیسے گذار سکوں گی" ۔

"لیکن ۔ وہ نہ مانے گی" ۔

"میں منا لوں گی اُسے" ۔

بھائی جان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے ۔

صبح جب میں جاگی تو مہمان جا چکی تھی ۔ بھائی جان اسے پہلی موٹر میں بٹھا آئے تھے ۔

سارا دن میں دعائیں مانگتی رہی کہ بھائی جان اسے آپا سے ملانے پر راضی ہو جائیں ۔ وہ آپا سے نہ ملتی تو میں اسے کیسے دیکھتی اور اسے دیکھنے کے لئے تڑپ رہی تھی میں ۔

شام کو میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بگڑی بیٹھی ہے ۔ غصے میں

کہہ رہی تھی "میں ضرور ملوں گی ۔ چاہے آپ مانیں نہ مانیں میں آپ ادھر چلی جاؤں گی" ۔ بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا اور آپا کو چپ کرا دیا ۔ میں بھی وہاں سے سرک گئی ۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ۔ لیکن بھائی جان کی میز کے پیچھے بیٹھ کر سننے لگی ۔ وہ سمجھے میں باہر چلی گئی ہوں ۔

آپا پھر چمک کر بولی ۔ اف ۔ آپا ۔ اس روز آپا لڑ رہی تھی ۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا ۔ آپا اور بھائی جان سے لڑے ۔ وہ آپا جو جی ہاں کے سوا کچھ کہنا جانتی نہ تھی بولی "اس میں ہرج ہی کیا ہے ۔ آخر لوگ چار چار کرتے ہیں ۔ میں اس کی خدمت کروں گی ۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہ ہو گا" ۔

"لیکن کیوں" بھائی نے بات کاٹ دی ۔

"بس میرا جی کہتا ہے" ۔ آپا بولی ۔ "ایسی اچھی ہے وہ ۔ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ ۔"

"لیکن تمہاری زندگی" بھائی بولے ۔

"میری زندگی" آپا نے دہرایا ۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بجتا ہے ۔ "میری زندگی کو جانے دیجئیے ۔ گئی آئی چیز کا کیا ہے" ۔

"نہیں نہیں" ۔ بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے "یہ نہیں ہو سکتا اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا" ۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا ۔ جسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے ۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی ۔ ایسی جیسے نیا نیا سہاگ ملا ہو ۔

شام کو نیلی لوٹ آئی ۔ ہم سب اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے ۔ چونکہ بھائی جان نے کہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دیں گے تم سے ! اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی ۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی ۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو ۔ توبہ اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا ۔ ۔ ۔ نہ جانے

کس وقت اماں نے نماز شروع کی ۔ اس نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی ۔ چونکہ نئی پڑوسن سیدانی کو آنا تھا نا ۔ بچے کو دیکھنے کے لئے ۔ لیکن سیدانی نہ آئی ۔ آخر اماں نے انتظار کے بعد شروع کی نماز ۔

ہائے ری ۔ وہ نیلی ۔ ۔ ۔ کیا پھبن تھی ۔ کس شان سے وہ اندر آئی گویا میم ہو میم ۔ سنہرے بال ۔ زرد مخملی رنگ اور نیلی آنکھیں ۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور یوں چونکی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو ۔ پھر بے اختیار پلا اٹھا کر تھے کی طرف دیکھا ۔ اور پھر پاگلوں کی طرح نیلی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی "آیئے بیٹھیئے" ۔

آپا نے تھے کو اٹھا کر نیلی کی گود میں ڈال دیا ۔ اور مسکرا کر بولی ۔ آپ ہی کا تو ہے ۔ چاہے ابھی لے لیں یا جب جی چاہے ۔ میں تو دایہ ہوں اس کی" اف آپا کی وہ بات ۔

نیلی پہلے تو حیران بت بنی بیٹھی رہی پھر چونک کر بولی ۔ "آپ کے مزاج تو اچھے ہیں" کیا ٹھکانے ہیں آپا ہنسی ۔ بھائی جان گھبرا گئے ۔ نیلی نے کہا ۔ کیسا پیارا ننھا ہے ۔ اور اس نے تھے کی طرف دیکھا ۔ اف ۔ اس کا تو رنگ اڑ گیا ۔ شرم سے یا نہ جانے کیوں پانی پانی ہو گئی ۔ پھر بھائی بولے ۔ "نیلی ۔ صفی جانتی ہے" ۔ "مجھے تو بہت خوشی ہے ۔" آپا کہنے لگی ۔ "کہ گھر والی گھر آ گئی" "نہیں نہیں" نیلی چلائی "آپ نہیں جانتیں ۔ ۔ ۔" "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔" "آپا مسکرائی ۔ "ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہا کریں گی ۔" میں خدمت کروں گی ۔ "آپا کی آواز بھرا گئی" ۔ نہیں نہیں بھائی جان چیخنے لگے ۔ اب نہیں ۔

عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا اندر آ گئی "میں پڑوس سے آئی ہوں بیٹی" ۔ وہ بولی ۔ "برا نہ ماننا ۔ میرا جی چاہتا تھا تھے کو دیکھ آؤں" ۔ بھائی سرک کر کونے میں ہو گئے ۔ نیلی نے کرسی کھینچ کر بڑھیا کو بٹھا لیا ۔ میں جانوں وہی سیدانی تھی ۔ بڑی اماں انتظار کرتی رہی تھی جس کا ۔ سلام کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی ۔ پھر بولی "کہاں ہے ننھا ۔ تھے کو دیکھا اور پھر غور سے نیلی

کی طرف دیکھ کر مسکرائی ۔ اس وقت اس کی گود میں تھا نا وہ ۔ "اللہ عمر دراز کرے" وہ بولی "کیسا پیارا ہے ۔" نیلی کی طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگی ۔ بالکل اپنی ماں پر گیا ہے ۔ بھائی جان کا منہ فق ہو گیا ۔ نیلی تو تصویر بنی بیٹھی تھی ۔ پر وہ اپنی ہی دھن میں بولتی رہی ۔ اے ہے لڑکی ۔ اس نے نیلی سے کہا ۔ یوں کرسی میں بیٹھنا ۔ توبہ آج کل کی لڑکیاں تو زچہ بننا جانتی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ تجھے تو پلنگ پر لیٹ جانا چاہیئے !!

میں نے کہا ۔ "نانی ۔ تھے کی اماں تو یہ رہی" میں نے آپا کی طرف اشارہ کیا ۔ بڑھیا نے غور سے آپا کی طرف دیکھا پھر وہ ہنسی ۔ "اسے ہے لڑکی ۔ مذاخ کرتی ہو ۔ یہ بال دھوپ میں تو نہیں سفید کئے ۔ پھر وہ تھے سے مخاطب ہوئی ۔ "چاہے تھے سے پوچھ لو ۔ کہ کون ہے اس کی اماں ۔ ۔ ۔ نیلی بت بنی بیٹھی تھی ۔ ادھر آپا گنگنانے لگی ۔ نہیں اب ہمارے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا" ۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسی ۔

بڑھیا اپنی ہی دھن میں بولتی گئی ۔ "کہتے ہیں ۔ سچ کہتے ہیں سیانے باپ کی نظر میں جو دلھن کی صورت بچ جائے تو بچے کو تو ماں پر جانا ہی ہوا ۔"

بڑھیا بولی ۔ "کیا ہنستی ہے بیٹی ۔ بچہ حائل کہاں ہوتا ہے ۔ وہ تو بلکہ دونوں میں بندھن بن جاتا ہے" ۔ بڑھیا نے بھائی اور نیلی پر معنی خیز نگاہ ڈال کر کہا ۔ "اور پھر جب ماں پر شکل ہو اس کی ۔"

چُپ

"چُپ"

جیناں نے چچی کی نظر بچا ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا۔ اور پھر نشے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پائنچے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور ازسرِ نو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چارپائی پر پڑے ہوئے رومال پر کاڑھی ہوئی بیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل خواہ مخواہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ گویا اس نے کسی جُرم کا ارتکاب کیا ہو۔ قاسم کئی بار یوں چوری چوری جیناں کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا۔ جیناں کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی نگاہیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتیں۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جیناں کے جسم کے پیچ و خم یا اُبھار پر جا پڑتی۔ اور وہیں گڑ جاتی۔ اس وقت وہ قطعی بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے مصیبت یہ تھی کہ بات تبھی وقوع میں آتی جب جیناں کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی بیٹھی ہوتی۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی۔ "کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی"؟ میں "میں نہیں تو" وہ گھبرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی۔ "کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلو"۔ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پائنچہ اکثر اوپر اُٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ ساٹن میں ملبوس ابھار نمایاں ہو جاتے۔ لیکن اس وقت قاسم کو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جیناں بظاہر شدت سے کام میں منہمک ہوتی۔ لیکن قاسم بیقرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اب میں جاتا ہوں۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی۔ "بیٹھو بھی۔ جاؤ گے کہاں"۔

"کام ہے ایک" قاسم کی نگاہیں کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتیں۔

"کوئی نہیں کام وام پھر کر لینا"۔ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جانے پر مجبور ہو اور وہ آپ ہی آپ بیٹھی مسکاتی رہتی۔

اس روز جب وہ جانے لگا تو وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ "قاسی ذرا یہاں تو آنا" ------ ایک بات پوچھوں بتاؤ گے۔ "کیا ہے" وہ رک گیا۔ "یہاں آؤ بیٹھ جاؤ۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی۔ وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ زیرِ لب مسکرائی۔ پھر دفعتاً اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے سر کو اپنی رانوں پر رکھ کر تھپکنے لگی۔ "سچ سچ بتانا قاسی"۔ دو ایک مرتبہ قاسم نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن نشے کی ریشمیں نرمی۔ خس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور جسم کی مدہم مخملی گرمی -------- اس کی قوت حرکت شل ہو گئی۔ "تم میری طرف اس طرح کیوں گھورتے رہتے ہو۔ ہوں"؟ اس نے ایک پیار بھرا تھپیڑ مار کر کہا۔ بتاؤ بھی --------- ہوں"۔ قاسم نے پورا زور لگا کر سر اٹھا لیا۔ وہ انجانے جذبات کی شدت سے بھوت بنا ہوا تھا۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں منہ نبات کی طرح سُرخ اور سانس پھولا ہوا تھا۔ "ہیں! یہ تمہیں کیا ہوا"؟ وہ منہ پکا کر کے پوچھنے لگی۔ "کچھ بھی نہیں" قاسم نے منہ موڑ کر کہا۔ "خفا ہو گئے ہو کیا"؟ اس نے ازسرِ نو مشین چلاتے ہوئے پوچھا اور دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسی روکنے لگی۔ "نہیں نہیں کچھ بھی نہیں"۔ وہ بولا "اچھا اب میں جاتا ہوں"۔ اور باہر نکل گیا۔

اس کے بعد جب وہ اکیلے ہوتے قاسم اٹھ بیٹھتا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود منہ موڑ کر کھڑا رہتا اور وہ مسکراہٹ بھینچ کر کہتی۔ "اچھا۔ ایک بات تو سنو"۔ اور وہ معصوم انداز سے پوچھتا۔ "کیا بات ہے"۔ یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ وہ منہ پکا کر کے کہتی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اور بھی معصومانہ انداز سے پوچھتا۔ "کیا ہے" معاً حنائی ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور قاسم کا سر مخملی، معطر تکیہ پر جا ٹکتا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکنے لگتے۔ اس کے تن بدن میں پھلجڑیاں چلنے لگتیں۔ نسوں میں دھنکی بجنے لگتی۔ آنکھوں

میں سرخ ڈورے دوڑ جاتے سانس پھول جاتا ۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا ۔ ایک رنگین اضطراب اسے بیقرار کر دیتا اور وہ اٹھ بیٹھتا ۔ ”اب میں جاتا ہوں“ ۔ اور وہ نیچی نگاہ کئے مسکاتی ۔۔ مسکائے جاتی ۔

پھر نجانے اسے کیا ہوا ۔ ایک رنگین بیقراری سی چھا گئی ۔ وہ چارپائی پر بیٹھا دعائیں مانگتا کہ وہ اکیلے ہوں ۔۔ اس وقت آنکھیں یوں چڑھی ہوتیں جیسے پی کر آیا ہو ۔ جسم میں ہوائیاں چھوٹتیں جیناں نیچی نظر سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی ۔ اور پھر آنکھ بچا کر کوئی نہ کوئی شرارت کر دیتی مثلاً جب چچی یا بڑی بی کی نظر ادھر ہوتی تو جیناں جیسے بے خبری میں کوئی کپڑا اپنی گود میں ڈال لیتی اور نیچی نگاہ سے قاسم کی طرف دیکھ کر اسے تھپکنے لگتی اور قاسم ۔ اُف وہ بے چارہ تڑپ اٹھتا اور جیناں منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتی ۔ یا وہ دونوں ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر پھر اپنی گود کی طرف اشارہ کرتی گویا بلا رہی ہو ، اور جب چچی یا بڑی بی کا دھیان ادھر ہوتا تو جیناں بڑی سرگرمی سے کپڑا سینے میں مصروف ہو جاتی اور مزید چھیڑنے کے خیال سے اپنے دھیان بیٹھی پوچھتی ۔ قاسم آج اس قدر چپ بیٹھے ہو ۔ لڑ کر تو نہیں آئے اماں سے ؟

پھر جب وہ اکیلے رہ جاتے تو قاسم چپکے سے اٹھ کر آپ ہی آپ جیناں کے پاس آ بیٹھتا ۔ دو ایک مرتبہ ملتجی نگاہوں سے اس حنائی ہاتھ کی طرف دیکھتا ۔ جو شدت سے کام میں مصروف ہوتا اور پھر آپ ہی آپ اس کا سر جھک کر اس معطر سرہانے پر ٹک جاتا ۔ یا جب وہ اس کے پاس آکر بیٹھتا تو وہ منہ پکا کر کے کہتی ۔ ”کیوں ؟ کیا ہے“ اور پھر جب اس کا سر وہاں ٹک جاتا تو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی ۔ ”بہت شریر ہوتے جا رہے ہو ۔ کوئی دیکھ لے تو ۔ کچھ شرم کیا کرو“ ۔

ایک دن جب وہ سر ٹکائے پڑا تھا وہ بولی ۔ قاسی کیا ہے تمہیں ۔ یوں پڑے رہتے ہو ۔ گم سم ۔ مزہ آتا ہے کیا“ اس روز سر اٹھا لینے کی بجائے نہ جانے کہاں سے اسے زبان مل گئی ۔ بولا ”مجھے تم سے محبت ۔۔۔۔۔۔“ معاً جیناں نے اس کا سر دبا کر اس کا منہ بند کر دیا ۔ ”چپ“ وہ بولی ۔ کوئی سن لے

تو ۔ بیاہتا سے پیار نہیں کرتے ۔ انہیں پتہ چل جائے تو میری ناک چوٹی کاٹ ، گھر سے نکال دیں ۔ سنا بلّو“ ۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن اس روز دوڑتے ڈوروں کی بجائے اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ ”اب میرا کیا ہوگا“ ۔ آنسوؤں نے اس کا گلا دبا دیا ۔ اور جیناں کے بلانے کے باوجود وہ چلا گیا ۔ اور حسبِ معمول چوری چوری غسل خانے میں منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا ۔

نہ جانے ان مخملی ، معطر رانوں نے کیا کیا ۔ چند ماہ میں ہی وہ قاسی سے قاسم بن گیا ۔ گردن کا منکا اُبھر آیا ۔ آواز میں گونج پیدا ہو گئی ۔ چھاتی پر بال اگ آئے ۔ اور دونوں جانب گلٹیاں سی ابھر آئیں ۔ جن پر ہاتھ لگانے سے میٹھا سا درد ہوتا ۔ منہ پر موٹے موٹے دانے نکل آئے ۔

پھر ایک دن جب وہ ادھر جانے کی خاطر اٹھا تو ماں بولی ۔ ”کدھر جا رہا ہے تو ؟“ کہیں بھی نہیں ۔ وہ رک کر بولا ۔ ”ادھر جیناں کی طرف اور کہاں منہ پر داڑھی آ چکی ہے پر ابھی اپنا ہوش نہیں تجھے ۔ اب وہاں جا کر بیٹھنے سے مطلب نہ جانے لوگ کیا سمجھنے لگیں ۔ مانا کہ وہ اپنی ہے پر بیٹا اس کی عزت ہماری عزت ہے اور لوگوں کا کیا اعتبار‘ قاسم دھک سے رہ گیا اور وہ چپ چاپ چارپائی پر جا لیٹا ۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو پڑے ۔

شاید اس لئے کہ قاسی نہ آیا تھا یا واقعی اسے کالے دھاگے کی ضرورت تھی ۔ جیناں مسکراتی ہوئی آئی ”بھابھی“ اس نے قاسم کی ماں کو مخاطب کر کے کہا ۔ ” کالا دھاگا ہوگا تھوڑا سا“ ۔ اور پھر باتوں ہی باتوں میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی ۔ قاسم کہاں ہے نظر نہیں آیا آج ۔ کہیں گیا ہو گا ۔ ”اندر بیٹھا ہے“ ۔ قاسم کی ماں نے جواب دیا ۔ ”ادھر نہیں آیا آج“ ۔ جیناں نے جھجک کر پوچھا ۔ ”خیر تو ہے“ میں نے ہی منع کر دیا تھا ۔ بھابھی بولی ” دیکھ بیٹی اللہ رکھے اب وہ جوان ہے ۔ نہ جانے کوئی کیا سمجھ لے ۔ بیٹی کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا اور محلے والیوں کو تو تم جانتی ہو ۔ وہ بات نکالتی ہیں جو کسی کی سدھ بدھ میں نہیں ہوتی ۔ اور پھر تمہاری عزت ہوئی ۔ کیوں بیٹی ۔ کیا برا کیا میں نے جو اسے جانے سے روک دیا ۔ ایک ساعت کے لئے وہ چپ سی ہو

گئی ۔ لیکن جلد ہی مسکرا کر بولی ۔ ”ٹھیک تو ہے بھابھی ۔ تم نہ کرو میرا خیال تو کون کرے تم سے زیادہ میرا کون ہے ۔ تم بڑی سیانی ہو بھابھی“ ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ ”کہاں چھپا بیٹھا ہے“ ! اور اندر چلی گئی ۔ قاسی کا منہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں اسے یوں چپ دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے بولی ۔ ”چپ“ پھر باآواز بلند کہنے لگی ۔ ”مجھے ڈی ۔ ایم سی کا ایک ڈبہ لا دو قاسی ! سبھی رنگ ہوں اس میں“ اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر کاٹ لیا ۔ قاسی ہنسنے لگا تو منہ پر انگلی رکھ کر بولی ۔ ”چپ“ اب تو زندگی حرام ہو گئی ۔ ' قاسی نے اس کے کان میں کہا ۔ اب میں کیا کروں گا میرا کیا بنے گا“ ”ہونہہ زندگی حرام ہو گئی ۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئے“ پھر وہ باآواز بلند کہنے لگی ۔ ”ڈبے میں لال گولا ضرور ہو مجھے لال تاگے کی ضرورت ہے ۔ جیناں نے یہ کہہ کر اس کے کان سے منہ لگا دیا ۔ ”رات کو ایک بجے بیٹھک کی تیسری کھڑکی کھلی ہوگی ضرور آنا“ ۔ ایک آن کے لئے وہ حیران رہ گیا ۔ ”ضرور آنا“ ۔ وہ اس کا سر اپنے بدن سے مس کرتے ہوئے بولی ۔ اور پھر باآواز بلند اسے ڈبے کے لئے تاکید کرتی ہوئی باہر نکل آئی ۔ ”آج نہ سہی ، کل ضرور لانا“ ۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی ۔

اس رات محلے بھر کی آوازیں گلی میں آ کر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بجتیں عجیب سی ڈراؤنی آوازیں اس رات وہ آوازیں ۔ ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہہ رہی تھیں ۔ بہے جا رہی تھیں ۔ محلہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا ۔ بچے کھیل رہے تھے ، ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا ۔ نہ جانے مائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں ۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آوازیں مدہم ہوتی گئیں ۔ پھر دور محلہ کی مسجد میں ملا کی اذان گونجی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی چیخیں مار مار کر رو رہا ہو ۔ کس قدر اداس آواز تھی جسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا ۔ ایک ساعت کے لئے خاموشی چھا گئی ۔ کراہتی ہوئی خاموشی ۔ دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے ۔ اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے گویا رینگ رینگ کر شکایت کر رہے ہوں ۔

کیا کھڑکی بھی کھلتے وقت شور مچائے گی ۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ نمازی واپس آ رہے تھے ۔ ان کے ہر قدم پر اس کے دل میں ”دھک“ سی ہوتی توبہ ! اس گلی میں چلنے سے محلہ بھر گونجتا ہے ”چرر“ ۔ چوں ۔ ”دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے ۔ نجانے کیا ہو رہا تھا اس روز گویا تمام محلہ تپ دق کا بیمار تھا ۔ ”اکھڑ کھڑدم“ اہم ۔ اہم ۔ آہہیم ۔ تھو ۔ ”یا شاید وہ سب تفریحاً کھانس رہے تھے ۔ تمسخر بھری کھانسی جیسے وہ سب اس بھید سے واقف تھے ۔

”ٹن ٹن ------ بارہ ---------- اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا ۔ لیکن آوازیں تھیں کہ تھمتی ہی نہ تھیں ۔ کبھی کوئی بچہ بلبلا اٹھتا ۔ اور ماں لوری دینا شروع کر دیتی ۔ کبھی کوئی بڈھا کھانس کھانس کر محلے بھر کو ازسرِ نو جگا دیتا ۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے ، یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے ۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کروٹوں سے چارپائی چٹخ رہی تھی ۔ اماں کیوں یوں کروٹیں لے رہی تھی ۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں ۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں اس کا دل دھک سے رہ جاتا ۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا ۔ اف وہ کتے کیسی بھیانک آواز میں رو رہے تھے ۔

شاید اس لئے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا ۔ مجھے تجھ سے محبت ہے ۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا ۔ اور وہ حنائی ہاتھ پیار سے اسے تھپکتا رہا ۔ اور وہ آوازیں گونجتی رہیں یا شاید اس لئے کہ وہ سارا سارا دن آہیں بھرتا ۔ کروٹیں بدلتا ۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا رات کو علیحدہ کمرے میں سونے پر ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی ایم سی کا گولا منگوانے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے ۔ آنکھیں جھومتیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس محلے والیاں بیٹھی ہیں ۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے ۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا اتنا رکھ رکھاؤ کرتی تھی پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی ۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا ۔ گویا وہ توجہ صرف دکھلاوا تھی اور وہ روز بروز ان سے بے پروا ہوتی جا رہی تھی ۔ ممکن ہے

اس کی وجہ محلے کی دیواریں ہوں جو اس قدر پرانی اور وفادار تھیں کہ جیناں کا یہ رویہ برداشت نہ کر سکتی ہوں ۔ اس لئے انہوں نے وہ راز اچھال دیا ۔ بہر حال وجہ چاہے کوئی ہو بات نکل گئی ۔ جیسا کہ اسے نکل جانے کی بری عادت ہے ۔

پہلے دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں ۔ "یہ اپنا قاسم ، نواب بی بی کا لڑکا ! اے ہے ایسا تو نہیں دکھے تھا" ۔ "پر چاچی جیناں تو راہ چلتے کو لپیٹ لیتی ہے ۔"

نہ بڑی بی ! میرے من تو نہیں لگتی یہ بات ۔ ابھی کل کا بچہ ہی تو ہے اور وہ اللہ رکھے ، بھری مٹیار ! اونہوں" ۔ "میں کہتی ہوں بی بی ، جب بھی جاؤ اتنی آؤ بھگت سے ملتی ہے کہ کیا کہوں ۔ لوگوں کا کیا ہے جسے چاہا اچھال دیا" ۔ "پر بھابھی ! ذرا اسے دیکھو تو ، اللہ مارے لٹھے کی شلوار ہے ۔ ساٹن کی قمیض ہے اور کیا مجال ہاتھوں پر مہندی خشک ہو جائے ۔ "ہاں بہن رہتی تو بن ٹھن کر ہے ۔ یہ تو مانتی ہوں میں ۔ اللہ جانے سچی بات منہ پر کہہ دینا میری عادت ہی ایسی ہے" ۔ تو اس کے میاں کی بات چھوڑ ، میں کہتی ہوں ۔ وہ تو بدھو ہے بدھو ، وہ کیا جانے کہ بیوی کو کیسے رکھا جاتا ہے ۔ "اے ری کیا ہو گیا زمانے کو" ۔

قاسم نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں پہلے تو وہ شرمندہ سا ہو گیا ۔ پھر اسے خیال آیا ۔ کہیں بیٹھک کی تیسری کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند نہ ہو جائے ۔ اس کا دل ڈوب گیا ۔ لیکن جُوں جُوں محلہ میں بات بڑھتی گئی ۔ جیناں کی مسکراہٹ اور بھی رسیلی ہوتی گئی ۔ اور اسکی "چپ" اور بھی دلنواز ! "بس ڈر گئے" وہ ہنستی ۔ ہم کیا ان باتوں سے ڈر جائیں گے ؟" اس کا حنائی ہاتھ اور بھی گرم ہوتا گیا ۔ اور اس کا سنگار اور بھی معطر ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود قاسم کے دل میں ایک پھانس سی کھٹکنے لگی ۔

جب کبھی کسی وجہ سے بیٹھک کی تیسری کھڑکی نہ کھلتی تو معاً اسے خیال آتا کہ وہ اپنے میاں کے پہلو میں پڑی ہے اور وہ معطر گود کسی اور کو گھیرے ہوئے ہے ۔ وہ حنا آلود ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے ۔ اس خیال سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رات کاٹ دیتا ۔ پھر جب کبھی وہ ملتے تو

شکوہ کرتا رو رو کر گلہ کرتا ۔ لیکن وہ ہاتھ تھپک تھپک کر اسے خاموش کر دیتا ۔

ادھر قاسم اور جیناں کی باتوں سے محلہ گونجنے لگا ۔ مدہم آوازیں بلند ہوتی گئیں ۔ سرگوشیاں دھمکی کی صورت میں ابھر آئیں ۔ اشارے کھلے طعنے بن گئے ۔ "میں کہتی ہوں چاچی ، رات کو دونوں ملتے ہیں ۔ مسجد کے ملّا نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔" تم اس کے میاں کی بات چھوڑو بی بی "آنکھ کا اندھا نام چراغدین" اسے کیا پتہ چلے گا کہ بیوی غائب ہے ۔ سنا ہے چاچی ایک روز میاں کو شک پڑ گیا پر جیناں ؟ توبہ اس کے سر پر تو حرام سوار ہے نہ جانے کیسے معاملہ رفع دفع اور ایسی بات بنائی کہ وہ بدھو ، ڈانٹنے ڈپٹنے کی جگہ الٹا پریشان ہو گیا پیٹ میں درد ہے کیا تم چلو ، میں ڈھونڈ لاتا ہوں دوا ۔ اب طبیعت کیسی ہے ہونہہ ! وہاں تو اور ہی درد تھا بھابھی ۔ جبھی تو پھاہا رکھوانے آئی تھی ۔ مسجد کا ملّا کہتا ہے بڑی بی ۔۔۔۔ اے ہے اس کا کیا ہے ، اپنی حمیداں کہتی ہے بی بی ! میں تو ان کی آوازیں سنتی رہتی ہوں کان پک گئے ہیں ۔ پڑوسن جو ہوئی ان کی اور پھر دیوار بھی ایک اینٹی ہے ۔۔۔۔۔ توبہ ، اللہ بچائے حرام کاری کی آوازوں سے ۔ نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں دونوں ؟ کبھی ہنستے ہیں ، کبھی روتے ہیں ۔ اور کبھی یوں دنگا کرنے کی آواز آتی ہے جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو ۔" "پر مامی ! اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب ۔ "تو چھوڑ اس بات کو ۔ میں کہوں چوری کا مزہ چوری کا ۔ سر پر حرام چڑھا ہے" ۔ "پر مامی تو چھوڑ اس بات کو دلہن ! تجھے کیا معلوم کیا مزہ ہے اس "چپ"، میں اللہ بچائے ۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے ، پر میں کہوں یہ "چپ" کھا جاتی ہے بس اب تو سمجھ لے آپ ہی ۔"

پھر یہ باتیں مدہم پڑتی گئیں ، مدہم تر ہو گئیں ۔ حتےٰ کہ بات عام ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔ غالباً لوگوں نے اسے ایک کھلا راز تسلیم کر لیا ۔ اور ان کے لئے مزید تحقیق میں دلچسپی نہ رہی نہ جانے جیناں کس مٹی سے بنی تھی اس کی ہر بات نرالی تھی ۔ جوں جوں لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے گئے ۔ اس کی مسکراہٹیں اور بھی رواں ہوتی گئیں ۔ حتےٰ کہ وہ محلے والیوں سے اور بھی ہنس ہنس کر ملنے لگی ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرتی

ہیں اور قاسم ؟ قاسم سے ملنے کی خواہش اس پر حاوی ہوتی گئی ۔ ہنس ہنس کر اسے ملتی ۔ اس کے خدشات پر اسے چڑاتی ۔ مذاق اڑاتی ۔ اس کی ریشمیں گود اور بھی گرم اور معطر ہوتی گئی ۔

مگر جب بات عام ہو گئی اور لوگوں نے اس میں دلچسپی لینا بند کر دی تو نہ جانے اسے کیا ہوا؟ اس نے دفعتاً قاسم میں دلچسپی لینا بند کر دی ۔ جیسے لوگوں کی چپ نے اس کی "چپ" کو بے معنی کر دیا ہو ، اب بیٹھک کی تیسری کھڑکی اکثر بند رہنے لگی ۔ آدھی رات کو قاسم اسے انگلی سے ٹھوکتا ۔ اور بند پاتا تو پاگلوں کی طرح واپس لوٹ آتا اور پھر بار بار جا کر اسے آزماتا ۔ اس کے علاوہ اب جیناں کو ڈی ۔ ایم سی کے تانگے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ۔ اس لئے وہ قاسم کے گھر نہ آتی ۔ جب سے کھڑکی بند ہونا شروع ہوئی قاسم پاگل سا ہو گیا ۔ وہ رات بھر تڑپ تڑپ کر گزار دیتا ۔ اور جیناں کا میاں تو ایک طرف ، اسے ہر چلتا پھرتا راہ گیر جیناں کے نشے کی شلوار کی تہوں میں گیند بنا ہوا دکھائی دیتا ۔ تعجب یہ تھا کہ اب جب اسے جیناں کی لاپروائی کا شکوہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ بے پروائی سے کہتی "کوئی دیکھ لے گا تبھی چین آئے گا تمہیں ۔ مجھے گھر سے نکلوانے کی ٹھان رکھی ہے کیا ؟ کیا کروں میں وہ ساری رات جاگ کر کاٹتے ہیں" ۔

دو ایک مرتبہ ڈھیٹ بن کر کسی نہ کسی بہانے وہ جیناں کی طرف گیا بھی ۔ اول تو وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھی ہوتی اور جب نہ ہوتا تو بھی جیناں سینے کے کام میں اس قدر مصروف ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی ۔ ایک دن جب وہ ادھر گیا ۔ تو دیکھا کہ جیناں کے پاس اس کا اپنا ماموں زاد بھائی مومن بیٹھا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کبھی وہ خود بیٹھا کرتا تھا ۔ اس نے محسوس کیا کہ مومن کا سر بھی کسی ریشمیں ، معطر تکیہ سے اٹھا ہے ۔ اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا اور جیناں کے بلانے کے باوجود چلا آیا اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کھمبے سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لے ۔

ناگاہ وہ واقعہ پیش آیا ۔ نہ جانے ہوا کیا ؟ آدھی رات کو جیناں کی چیخیں سن کر محلے والیاں اکٹھی ہو گئیں ۔ دیکھا تو جیناں کا خاوند پسلی کے درد سے

تڑپ رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی آنسو بہا رہی ہے ۔ ڈاکٹر بلوائے گئے حکیم آئے ۔ مگر بے سود صبح دس بجے کے قریب میاں نے جان دے دی ۔ اور جیناں کی پُر درد چیخوں سے محلہ کانپ اٹھا ۔ لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی سرگوشیاں ازسرِنو جاگ پڑیں ۔ کوئی بولی ۔ "اب قدر جانی ہے جب وہ مر گیا" ۔ کسی نے کہا ۔ "ابھی کیا ہے ابھی تو جانے گی ۔ بیچارہ ایسا نیک تھا ۔ اُف تک نہ کی اور یہ بی بی ہولی کھیلنے میں مصروف لگی رہی" ۔ چاچی نے سر پیٹ لیا کہنے لگی ۔ "آئے ہائے ری ۔ تم کیا جانو ــــــــــ اس کے لچھن ، میں کہتی ہوں ۔ نہ جانے کچھ دے کر مار دیا ہو ۔" "ہیں چاچی بس" تو چپ رہ ۔ ہائے ری ، جوان میاں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ۔ وہ کیا منع کرتا تھا ۔ اسے ۔ اس کے سامنے تو کھیلتی رہی اپنے کھیل ۔ پھر جان لے لینا ! ؟" یااللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے ہم تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے محلے کی ناک کاٹ دی ۔ میں کہتی ہوں اگر سرکار کو پتہ چل گیا تو ۔ وہ تو قبر بھی کھود لیں گے ۔" "بس بھابھی بس تو چھوڑ اب اس بات کو ، دفع کرو ۔ سمجھ ! کچھ ہوا ہی نہیں ۔"

جب قاسم کی ماں نے سنا کہ بیٹا جیناں سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا ۔ اپنا سر پیٹنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی ۔ قاسم اب جوان تھا ۔ اپنی نوکری پر تھا ۔ ہر ماہ سو پچاس اس کی جھولی میں ڈالتا تھا ۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی ۔ مگر بیٹا تو گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار تھا ۔ اس لئے وہ چپ ہو گئی ۔ اگرچہ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور جیناں کے متعلق ایسی دعائیں مانگنے لگی کہ اگر وہ پوری ہو جاتیں تو قاسم سر پیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتا ۔

جب محلے والیوں نے سنا کہ قاسم کا پیغام جیناں کی طرف گیا ہے تو چاروں طرف پھر سے چرچا ہونے لگا ۔ "کچھ سنا تم نے چاچی ۔" ـــــ ۔ "بس تو چپ کر رہ ۔ آج کل تو آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہو کر بیٹھ رہو تب گزارہ ہوتا ہے ۔" پر چاچی کبھی سننے میں نہ آیا تھا ۔ کہ بیوہ کو کنوارہ لڑکا پیغام بھیجے ۔ ـــــ ۔ میں کہتی ہوں بیوہ مر جاتی تھی ، مگر دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی ۔ اور اگر کوئی پیغام لاتا بھی تو اس کا منہ توڑ دیتی ۔

لیکن آج نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے ۔ پر چاچی وہ تو لڑکے سے ساتھ آٹھ سال بڑی ہوگی ۔ اے اپنی فاطمہ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔“ آئے ہائے کیا کہتی ہو تم ۔ دکھنے کا کیا ہے بہن ۔ ہار سنگار کر کے بیٹھ جاؤ ۔ منہ پر وہ اللہ مارا کیا کہتے ہیں اسے آٹا لگا لو ۔ تو تم بھی چھوٹی دکھو گی ۔ دکھنے کا کیا ہے ۔ اس سے تو عمر چھوٹی نہیں ہو جاتی ۔

قاسم کا خیال تھا کہ جب جیناں بیاہ کا پیغام سنے گی تو اٹھ کر ناچنے لگے گی

لیکن جب اُس نے دیکھا کہ وہ سوچ میں پڑگئی ہے تو جل کر راکھ ہوگیا . . . . . .

اسے مومن کا خیال آیا ۔ اور غصے سے منہ لال ہوگیا ۔ صاف انکار کیوں نہیں کر دیتی تم ، اس نے گھور کر جیناں کی طرف دیکھا ۔ جیناں مشین چلانے میں لگی رہی ۔ پھر آنکھ اٹھائے بغیر کہا ۔ ”تم تو قاسی ہی رہے“ ۔ ”قاسی رہتا تو تم اس قدر لاپرواہ کیوں ہو جاتیں ؟“ وہ بولا ”میں تو لاپرواہ نہیں“ اس نے سوئی میں دھاگا پروتے ہوئے کہا ۔ مجھے جواب دو ۔“ وہ بولا اس کی آواز میں منت کی جھلک تھی ۔ ”جواب دو ۔ میں یوں انتظار میں گھل گھل کر مرنا نہیں چاہتا ۔“

”اچھا“ جیناں نے آہ بھر کر کہا کہ تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی ۔“ جیناں ۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ !! اس کا سر اس ریشمیں تکئے پر جا ٹکا ۔ اے ہے کوئی دیکھ لے گا ۔“ وہ بولی ”دیکھ لے“ اس نے جیسے نیند میں کہا ۔ ”کہیں مومن نہ آجائے ۔“ جیناں نے سرسری طور کہا ۔ ”مومن“ !! اس کے دل پر تیر سا لگا ۔ اور وہ اٹھ بیٹھا ۔ ”مومن آ جائے تو اسے جان سے نہ مار دوں“ ۔ وہ غرایا ۔

اس کے نکاح پر محلے والیوں نے کیا کیا نہ کہا ۔ کوئی بولی ۔ لو ”یہ یوسف زلیخاں کا قصہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ۔“ کسی نے کہا ۔ ”ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے ۔ ابھی تیل دیکھو ، تیل کی دھار دیکھو ۔“

کسی نے کہا ۔ ”اے ہے جیناں کیا اسے گود میں کھلائے گی ۔ میاں نہ ہوا ۔ لے پالک ہوا“ ۔ چاچی ہنسی ، بولی ”تو چھوڑ اس بات کو بی بی ۔ آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چسکا پڑا ہوا ہے ۔ جورو کو ماں بنا لیتے ہیں ،

ہاں ! ۔۔۔۔۔۔۔۔“ کوئی کہنے لگی ۔ ”خیر چاچی حرام سے تو اچھا ہے کہ نکاح کر لیں ۔ کیوں بڑی بی ! ہے نہ یہ بات ؟ میں تو سچی کہوں گی ۔ ہاں بہن نہ جانے کب سے کٹے ہوئے تھے ایک دوسرے سے “

نہ جانے بیاہ کے بعد کیا ہوا ۔ انہیں ، جیناں تو گویا گھر گرہستی عورت بن گئی ۔ اس کے نشے کے پاجامے عام پاجامے نظر آنے لگے جو محض جسم ڈھانپنے کے لئے پہنے جاتے ہیں ۔ اور خس کی خوشبو تو گویا اڑ ہی گئی ۔ حالانکہ اب بھی وہ خس کا عطر لگاتی تھی اس کے اٹھے اور گرے ہوئے پائنچوں میں چنداں فرق نہ رہا ۔ البتہ جب کبھی قاسم اس کا پائنچہ اٹھا ہوا دیکھتا تو معاً اس کی آنکھوں تلے مومن آ جاتا اور پھر جیناں کا حنائی ہاتھ اٹھتا ۔ پھر وہ بے قرار ہو کر اندر چلا جاتا ۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا ۔ شروع میں وہ اکثر جیناں کے پاس آ بیٹھتا ۔ لیکن اب جیناں کا حنائی ہاتھ شدت سے کام میں لگا رہتا اور اس کی گود بند رہتی ۔ اگر کبھی قاسم کا سر وہاں ٹک بھی جاتا تو وہ اپنے کام میں مگن یوں بیٹھی رہتی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو کبھی چڑ کر کہتی ”کیا بچوں کی سی باتیں ہیں تمہاری“ اس پر وہ محسوس کرتا ۔ گویا وہ گود کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی ہو اور تھپکنے والا حنائی ہاتھ کسی اور کا منتظر ہو ۔

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگتا کہ دونوں بیٹھے ہیں ۔ وہ اور مومن اور اس کا سر ریشمیں تکئے پر ٹکا ہوا ہے ۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو ڈھونڈتا تو دیکھتا کہ جیناں یوں مگن بیٹھی ہے ۔ گویا پرانے خواب دیکھ رہی ہو ۔ کسی رنگین ماضی کے دھیان میں مگن ہو یا شاید کسی متوقع مستقبل کے ۔ وہ چپ ہوجاتا ۔ اسے یوں دیکھ کر جیناں مسکرا کر کہتی ”کیا ہے آج سرکار کو ؟“ اور وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ۔ ”ہماری جیناں کھو گئی اب کیا ہوگا ؟“ اور وہ ہنسنے لگتی ”پائی ہوئی چیز کو کھونے کا بہت شوق ہے سرکار کو ؟ پائی ہوئی“ وہ ہنستا ۔ جسے رنگین خواب میسر ہوں وہ بھلا تلخ حقیقت کو کیوں دیکھے ۔ اسے جاگنے کی کیا ضرورت ۔ جاگ کر دکھتا ہی کیا ہے بس چپ چپ سنائی دیتا ہے ۔ ان دنوں تو ”چپ“ میں بہت مزہ تھا ۔ اب ہماری چپ بھی پسند نہیں ۔ اور وہ چڑ کر جواب دیتی ”کہاں وہ ”چپ““

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

اور کہاں یہ ــــــــــــ‘ وہ غصہ میں آ جاتا ”نہ جانے کس کس سے “چپ” کا کھیل کھیلا ہو گا“ ”بس“ کھا لیا شک نے ”وہ جل کر کہتی ”جی !“ قاسم طنزاً جواب دیتا ۔ ”ہم تو ٹھہرے شکی اب مومن کیسے بنیں ! ؟“

یا کسی روز دفتر سے واپسی پر وہ کہتا ”کس کے انتظار میں بیٹھی تھی ؟ اور وہ جل کر بولتی ”کوئی بھی جو آ جائے“ اوہو ! وہ سنجیدگی سے چھیڑتا ”ہم تو غلطی سے آ گئے“ ”تو واپس لوٹ جاؤ“ وہ جل کر کہتی ۔

اس طرح مذاق ہی مذاق میں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے ۔ جیناں کام میں منہمک رہنے لگی ۔ لیکن شاید کام تو محض ایک دکھاوا تھا ۔ ایک پس منظر ، ایک اوٹ جس میں ماضی کے خواب دیکھتی تھی ۔ اس کے خواب قاسم کو اور بھی پریشان کرتے اسے اس بات پر غصہ آتا کہ وہ خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دے رہی ہے ۔ پھر اسے خیال آتا کہ شاید کوئی اور خواب ہوں ۔ جن کا اس سے تعلق نہ ہو ۔ اس خیال پر اسے جیناں کے خوابوں میں مومن کی تصویر نظر آنے لگتی ۔

البتہ ان دنوں جب قاسم کے ماں باپ چند دن کے لئے ان کے پاس آئے تو قاسم نے محسوس کیا کہ جیناں وہی پرانی جیناں تھی ۔ اس روز جب اماں سے باتیں کر رہا تھا تو جیناں نے آکر اندھیرے میں اس کی کمر پر چٹکی بھر لی ۔ اور جب وہ گھبرا کر کچھ بولنے لگا ۔ تو بولی ”چپ“ اور ایک حنائی ہاتھ نے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا ۔ پھر اس دن جب وہ ابا کے پاس دیوان خانے میں سویا ہوا تھا کسی نے اس کے کان میں تنکا چبھو کر اسے جگا دیا ۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ دو ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل گئے ۔ اور پھر ایک ہلکا سا پیارا تھپڑ گال پر پڑا ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں پر آ رہی ۔ ”چپ“ اس معطر اندھیرے میں سے پیاری سی آواز آئی ۔ بیشتر اس کے کہ قاسم اسے پکڑ سکتا وہ جا چکی تھی ــــــ پھر ایک روز غسلخانے میں جب وہ نہانے لگا تو معاً کوئی دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر اس سے چمٹ گیا ۔ وہ گھبرا کر چلّانے لگا ۔ مگر دو حنائی ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا ۔ ”چپ“ وہ دیوانہ وار ان حنائی ہاتھوں کو چومنے لگا پھر جب اس نے جیناں کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ منہ پکا کر کے

بولی ۔ ”شور مچا دوں گی ، تو ابھی اماں آکر سمجھ لے گی تم سے ۔“ جب اس کے والدین نے جانے کی تیاری کی تو قاسم نے اس خیال سے انہیں نہ روکا کہ ان کے چلے جانے پر اس کی کھوئی ہوئی جیناں مکمل طور پر اسے مل جائے گی ۔ حالانکہ جیناں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں روکنے کی کوششیں کی ۔ اس کی منتیں سن کر یوں گمان ہوتا تھا ۔ جیسے کوئی ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا ہو ۔ مگر وہ چلے گئے ۔ اور جیناں ہار کر بیٹھ گئی ۔

ان کے چلے جانے کے بعد قاسم نے ہزار کوششیں کیں ۔ لیکن اپنی جیناں کو پانے کی جگہ اور بھی کھوئے چلا گیا ۔ اس بات پر قاسم کے شکوک ازسرِ نو چمکے ۔ ان شکوک نے جیناں کو اور بھی چڑا دیا ۔ جیناں کے چڑنے نے اس کے شبہات کو ہوا دی اور وہ چپ چپ رہنے لگا ۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے سے اور بھی بیگانہ ہو گئے ۔ پھر ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس نے دیکھا کہ جیناں بن ٹھن کر مشین پر کام میں لگی ہوئی ہے اور پاس مومن بیٹھا ہے ۔ جیسے اس نے ابھی اس معطر گود سے سر اٹھایا ہو ۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی ۔ مومن کے جانے کے بعد وہ غرّایا ۔ مومن اس مکان میں نہیں آئے گا سنا تم نے ! اس مکان میں کوئی جوان لڑکا نہ آئے ؟“ تمہارا ہی لگتا ہے کچھ ۔ میں کیا جانوں کون ہے ؟“ وہ بولی ۔ ”اپنی گود سے پوچھ لو کہ کون ہے ۔“ اس نے غصے سے کہا ”جی ہاں !“ وہ غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔ ”پھر نہ کہنا یہ بات“ ۔ کہنے کی کیا ضرورت“ وہ بولا ۔ ”اب کے آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا ۔“ وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی ۔ ”ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو ۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے کون ہو؟“ قاسم کی نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔ اس کا ہاتھ اٹھا ــــــــ محلے والوں نے جیناں کی چیخیں سنیں ۔ کوئی گرج رہا تھا ۔ ”مومن ! مومن“ !! وہ چیخ رہی تھی ۔ ”بس میں اس گھر میں ایک منٹ نہ رہوں گی“ ۔

”سنا تم نے اب مومن کا جھگڑا ہے ۔ توبہ“ ”یہ عورت کسی لڑکے کو لپٹے بنا چھوڑے گی بھی“ ــــــــ میں کہتی ہوں اس کے سر پر حرام سوار ہے ۔ ہاں ۔“ ”میں کہتی ہوں ، اچھا کیا جو میاں نے ہڈیاں سینک دیں ذرا“ ــــــــ پر چاچی ، کہاں مومن کہاں جیناں ۔ مومن تو اس کے بیٹے

سمان ہے ۔ " "اللہ تیرا بھلا کرے ! جبھی چھاتی پر لٹار کھتی ہو گی نا" ؟ "اب خاوند سے لڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی ہے" ۔ ۔ ۔ "نہ جانے وہاں کیا گل کھلائے گی ؟ ۔۔۔ "میں جانوں اچھا ہوا ۔ خس کم جہاں پاک مرد ہوتا تو جانے نہ دیتا ۔ کمرے میں بند کر دیتا ۔ اچھا نہیں کیا جو اسے جانے دیا ۔" "بلکہ وہ تو اور بھی آزاد ہو گئی" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنا ہے چاچی خط آیا ہے ہاں ! طلاق مانگتی ہے" "بڑی آئی طلاق مانگنے والی" میری مانے تو ۔۔۔۔۔ ساری عمر بٹھا رکھے ۔۔۔۔۔ "خیر بی بی یارانے کے بیاہ کا مزا تو پا لیا" ۔ میں پوچھتی ہوں ۔ اب اور کسے پھنسائے گی ۔ تمہیں کیا معلوم ۔ اسی روز سے اپنا مومن غائب ہے ۔" "جبھی تو قاسی سر جھکائے پھرتا ہے ۔ دنیا کو منہ کیسے دکھائے" ۔۔۔ میں کہتی ہوں بس ایک طلاق نہ دے اور جو جی چاہے کرے" ۔۔۔۔۔۔ ہونہہ ! ان تلوں میں تیل نہیں ۔ اپی فاطمہ بتا رہی تھی کہ کاغذ خرید لیا ہے" ۔

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا ۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئی ۔ محبت پر اعتبار نہ رہا "عورت ؟" وہ دانت پیس کر کہتا "عورت کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں ۔ ناگن صرف ڈسنا جانتی ہے صرف ڈسنا ! اگر اس نے طلاق لکھ بھیجی تھی ۔ تو صرف اس لئے کہ محلہ کے لوگ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتیں تھیں ۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے اور اپنی زندگی ازسرِ نو شروع کرے ۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جیناں نے مومن سے نکاح کر لیا ہے ۔ تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جیناں کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا ۔ تڑپ کر رہ گیا ۔ حالانکہ وہ ہر وقت جیناں سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا ۔ اسے برا بھلا کہتا ۔ بے وفا فاحشہ سمجھتا ۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گود آ کر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر ٹکا دے ۔ وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکے اور وہ تمام دکھ بھول جائے پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آ کھڑا ہوتا ۔ دو ہونٹ کہتے "چپ" اگرچہ اس وقت وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تھا ۔ لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں اور وہ اور بھی کھو جاتا ایک سال کے بعد جب جیناں اور مومن محلے میں آئے تو

پھر چرچا ہونے لگا ۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلہن کو دیکھنے لگیں ۔ اگرچہ ان کی مبارکباد طعنہ آمیز تھی ۔ لیکن آخر مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھی ۔

اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جیناں محلے میں داخل ہوئے ۔ عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا ۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کیلئے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا ۔ "ہاں چاچی سرکاری کام ہے کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا ۔" پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کیا دیکھتا ہے ۔ جیناں کھڑی مسکرا رہی ہے ۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا ۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔ اور وہ بھاگا ۔ حتیٰ کہ اسٹیشن پر جا کر دم لیا ۔

اس روز دن بھر وہ جیناں کے بارے میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا ۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا ۔ مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا ۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لئے بے تاب ہو ۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا ۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی ۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے ۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں ۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بجنے کی آواز آئی "ٹن" معاً وہ دبے پاؤں چلنے لگا ۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو ۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسی تھا ۔ دفعتاً ایک ریشمیں معطر گود اس کی نگاہ تلے جھلملائی ۔ دیکھوں تو بھلا ۔ اس کے دل میں کسی نے کہا اور دل دھڑکنے لگا ۔ نگاہ بیٹھک کی تیسری کھڑکی پر جا کر ٹکی ۔ انگلی سے دبایا تو پٹ کھل گیا ۔ اور وہ اندر چلا گیا ۔ معاً سامنے سے اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی ۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی ۔ "ہاں وہی" سیڑھیوں میں جیناں کھڑی مسکرا رہی تھی "تم ؟" وہ غصے سے چلایا ۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آ چکی تھیں ۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا ۔ "چپ" جیناں نے منہ پر انگلی رکھ لی ۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو نوچ لے ۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے ۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ بڑھا ۔ "میں جانتی تھی تم آؤ گے ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی" ۔ قاسم کا سر ایک رنگین معطر گود پر جا ٹکا ۔ جس کی مدہم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھپکنے لگی ۔ قاسم نے ایک دو مرتبہ جوش

Engr. Feraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

سیں آ کر اٹھنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ خوشبو ریشمیں بدن ، مدہم گرمی اور حنائی ہاتھ ۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ اس کا غصہ ، آنسو بن کر بہہ گیا ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اور خوشبو اسے تھپک رہے تھے

"چپ" جیناں منہ پر انگلی رکھے مسکرا رہی تھی !

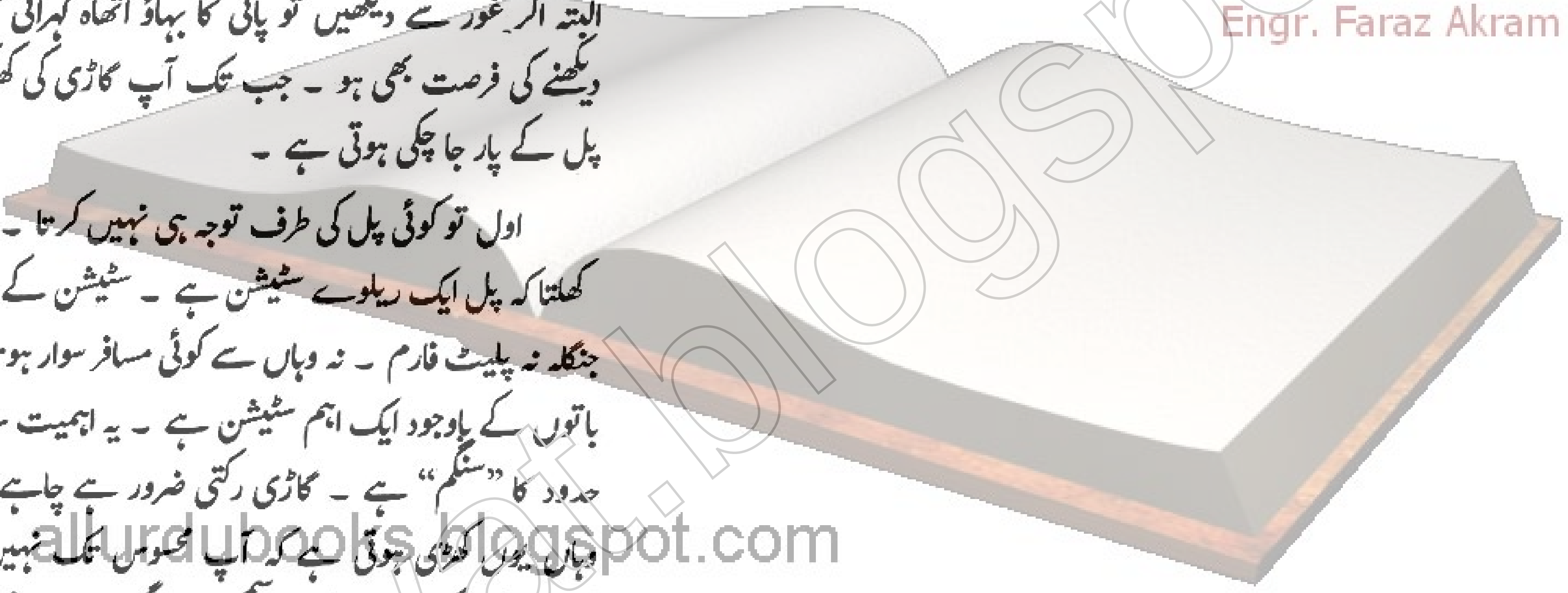

پُل

آپ پُل کو نہیں جانتے ۔ بھلا جانیں بھی کیسے جب کہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے ۔ اور نہ ہی کوئی گاؤں ۔ بس دریا پر اک عام سا پل بندھا ہے ۔ جس پر ریل کی لائن بچھی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے ۔ وہ ایک عام سا پل ہے ۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالا نظر آتا ہے ۔ البتہ اگر غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتھاہ گہرائی کا غماز ہے ۔ لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو ۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالتے ہیں گاڑی پل کے پار جا چکی ہوتی ہے ۔

اول تو کوئی پل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا ۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز نہیں کھلتا کہ پل ایک ریلوے سٹیشن ہے ۔ سٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں ۔ نہ آہنی جنگلہ نہ پلیٹ فارم ۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے ۔ باتوں کے باوجود ایک اہم سٹیشن ہے ۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے ۔ وہ دو حدود کا "سنگم" ہے ۔ گاڑی رکتی ضرور ہے چاہے رکتے ہی چل دے ۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے ۔ بفرض محال آپ محسوس بھی کر لیں تو آپ سمجھیں گے۔ گاڑی محض رک گئی ہے کھڑی نہیں ہوئی ۔ نہ جانے کیوں ۔ کوئی بات ہو گئی ہے ۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں ۔ میرا مطلب ہے وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں ۔

مصیبت یہ ہے کہ سٹیشن ایک بڑے جنکشن کے قریب ہے ۔ اس قدر قریب کہ آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک سٹیشن دوسرے سٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے ۔ جنکشن کی افراتفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے ۔ تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ

کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ پل آتا ہے گزر جاتا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک اہم سٹیشن گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے اور آپ غیر علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں ۔

پل سے دو فرلانگ ورے دو مختصر سے کوارٹر گال سے گال جوڑے بیٹھے ہیں ۔ جیسے تیز جھکڑ میں مرغیاں بیٹھ جایا کرتی ہیں ۔ لیکن جنکشن کی گذشتہ افراتفری کے اثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو ان کوارٹروں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی ۔ دیکھ بھی لیں تو انہیں کوارٹر نہیں سمجھتے آپ ، اور سمجھ بھی لیں تو آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ آباد ہیں اور پل سے متعلق ہیں ۔

ان کوارٹروں میں سٹیشن کے ماسٹر اور نائب رہتے ہیں ۔ موجودہ سٹیشن ماسٹر اقبال کو وہاں رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں ۔ لیکن نائب کو صرف مہینہ گزرا ہو گا ۔ اسی طرح چار سال پہلے اقبال نائب ہو کر آیا تھا ۔ ان دنوں بس ایک وہ خود اور ایک اس کی نئی بیاہتا بیوی برجیس تھی ۔ برجیس اس ویرانے میں آکر کس قدر ڈر گئی تھی ۔ کہاں سکول کی رونق پھر بیاہ پر سکھیوں کا سنگ اور کہاں یہ ویرانہ ۔ لیکن آہستہ آہستہ جی لگ ہی گیا ۔ چونکہ پڑوس کا کوارٹر بچوں سے یوں بھرا پڑا تھا جیسے مٹر کی پھلیاں دانوں سے ۔ پھر ان کی ماں بڑی ملنسار تھی ۔ اس کے علاوہ دونوں کوارٹروں کے درمیان ایک کھڑکی تھی ۔ جس کی وجہ سے دونوں کنبے ایک گھر نظر آتے تھے ۔ چونکہ کھڑکی زمین سے اونچی تھی اس لئے بچوں کی خاطر دونوں طرف سیمنٹ کی سیڑھیاں بنی تھیں اور کھڑکی کا نچلا حصہ سیمنٹ کی محراب سی بن گیا تھا ۔ سب ازراہ مذاق اس کھڑکی کو پل کہا کرتے ۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ وہ کھڑکی دونوں گھروں کے درمیان پل کا کام دیتی تھی ۔

پڑوسیوں کی تبدیلی پر برجیس نے پریشان تو ہونا ہی تھا ۔ لیکن اس کی پریشانی ایسی شدید نہ تھی ۔ ایک تو اب اس مقام سے مانوس ہو چکی تھی اور دوسرے اب ان کے دو ننھے منے بچے تھے ۔ سعیدہ اور انور ۔

چق کی اوٹ میں نئے نائب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی ۔ ریل کا بابو تو وہ دکھتا ہی نہ تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کا کوئی لڑکا ہو ۔ بھرا ہوا

جسم ۔ سانولا رنگ ۔ کنڈل والے بال اور شربتی آنکھیں ۔ جو دور۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہیں تھیں ۔ خواب آلود آنکھیں ۔ جیسے کسی اور دنیا میں رہتی ہوں ۔ نہ جانے برجیس کو کیا ہوا ۔ بڑھ کر چق کا کونا سرکا لیا اور شگاف بنا کر دیکھنے لگی ۔

اس روز سلائی کا کام کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی ۔ لٹ کھسک کر ماتھے پر آ پڑی ۔ دوپٹہ سر سے سرک گیا ۔ کان کا آویزہ یوں لرزاں رہا گویا ۔ پل کے نیچے گہرے دریا میں کشتی ڈول رہی ہو ۔ مشین کی آواز میں ایک نغمہ رقصاں رہا ۔ شائد اس لئے کہ نائب اور اس کی نئی نویلی بیوی کو دیکھ کر اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ آپ نئی نئی پل پر آئی تھی ۔ وہ بھی کیا دن تھے ۔

اقبال گاڑی پاس کر کے جلدی جلدی گھر آتا ۔ اسے یوں کھوئی کھوئی دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا ۔ "کہاں ہو" ؟ وہ پوچھتا ۔ "کہیں بھی نہیں" وہ مسکراتی "اونہوں" وہ قریب تر سرک آتا "کہیں دور ۔ دور ۔ برج" وہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے قریب تر کھینچ لیتا ۔ "تم تو یوں کھوئی رہتی ہو جیسے کوئی اکیلا جزیرہ ۔ کھلے سمندر میں" "تو پھر میں کیا کروں" وہ شرما سی جاتی ۔ "اچھا" وہ ہنس کر کہتا "تو مجھے ہی کرنا پڑے گا" ؟ کیا "وہ بھولی بن کر پوچھتی" اس اکیلے جزیرے کو گھسے کر کنارے لگانا پڑے گا اور کیا ۔ چھوڑو بھی نا اب یہ کام" وہ اس کے ہاتھ سے کپڑا یا سویٹر چھین کر پرے پھینک دیتا ۔ کھویا کے بے تکلف ہاتھ پتوار بن جاتے اور ناؤ ڈولنے لگتی ۔ ۔ ۔ ڈولتی ڈولتی نہ جانے کس کنارے کی طرف بہہ نکلتی ۔ ۔۔۔۔۔ ۔

زن ۔ ۔ ۔ ۔۔۔۔ ۔۔ ۔ !! ۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔ گاڑی پل سے گزر جاتی ۔ اور مسافروں کو شبہ تک نہ ہوتا کہ دو سرحدیں مل رہی ہیں ۔

"تو یہ ہے نیا نائب" ۔ برج نے اقبال سے کہا ۔

"تم نے دیکھا ہے اسے' اقبال نے پوچھا

"معلوم نہیں" ۔ وہ مشین چلاتے ہوئی بولی ۔ "سٹیشن کی طرف سے آ رہا

kitaabghar.blogspot.com

تھا ۔ ریل کا بابو تو دکھتا ہی نہیں ۔ کنڈیالے بال ۔ سانولا رنگ کھوئی کھوئی نگاہیں“ ۔ ”ہاں“ اقبال مسکرایا ۔ وہی شاعر سا ۔ نیا نیا ہے نا ۔ آپ ہی بن جائے گا بابو ۔ بابو بنتے دیر لگتی ہے کیا“ ۔

”عجیب سی جوڑی ہے“ وہ مسکرائی

”کیوں“ ۔

”اس کی بیوی کی بات کر رہی ہوں“ ۔

”کیا ہے ، اسے ۔ بنتی تو نہیں ؟‘

”اونہوں ۔ ابھی تو بچی ہے ۔ بنے گی کیا ۔ بالکل لڑکی ہے وہ تو“ ۔

”تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی“ ۔

”عجیب تو کچھ نہیں ۔ ویسے بات کر رہی ہوں ۔ لڑکی کو دیکھو تو گلابی پنڈے کی چوکی بھری ہے اور میاں ۔۔۔۔۔۔ ۔ ۔ جیسے دور نہ جانے کونسی نگری میں بھٹک رہا ہو ۔ ۔۔ ۔۔۔۔ ۔ ۔ ۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا ۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا“ ۔

وہ ہنسنے لگا ۔ ”تمہاری تو عادت ہے برج ۔ تمہیں کوئی جوڑی ، جوڑی معلوم ہی نہیں دیتی ۔ یاد ہے مجھے کہا کرتی تھی تم ۔ ۔ ۔ آپ کو تو ہر وقت کنارے لگانے کی ہی فکر رہتی ہے ۔ کبھی جزیرے کو اپنی جگہ ڈولنے بھی دیا کیجئے ۔ ۔۔۔۔۔۔ ۔ پگلی اسی کو شادی کہتے ہیں ۔ شادی پل ہے پل ۔ دو مختلف علاقے جوڑنے والا پل ۔ جیسے تم ۔ ۔ ۔“

”میں ۔ ۔ ۔“ وہ شرما گئی ۔

”ہاں ۔“ تم بھی تو برج ۔۔۔ ”میرے دل کے زخموں کو جوڑ دیتی ہو نا ۔“

”لگے بھرمانے ۔ ۔ ۔“ وہ ہنسی ۔

”شادی اور ہے ہی کیا ۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا ۔ ایک دوسرے کو

بھرمانا ۔ اسی بندھن کا نام ۔ ۔ ۔“

”اچھا بندھن ہے“ ۔ وہ ہونٹ نکال کر بولی ”کہیں میاں حاضر اور بیوی کا کوسوں پتہ نہیں ۔ کہیں بیوی حاضر پر میاں نہ جانے کہاں“ ۔

”پگلی“ وہ قریب تر ہو بیٹھا ۔ ”اگر دونوں غیر حاضر ہوں تو بات کیسے چلے“ ۔ اس نے بات چلاتے ہوئے کہا ۔

”کوئی ایک بھی حاضر نہ ہو تو ۔ ۔ ۔ چھوڑو بھی“ وہ اپنا آپ چھڑا کر بولی ۔

”اونہوں ۔ حاضر ہونا ہی پڑے گا“ ۔ وہ ازسرنو پاس ہو بیٹھا ۔

ہائے میرے اللہ ۔ ایسی حاضری سے تو غیر حاضری ہی بھلی‘ ۔

”برج“ ۔ وہ اس کے کان سے منہ لگا کو بولا ۔ ”تم میری زندگی کے دکھی پانیوں پر ایک پل ہو ۔ نہ جانے کہاں رہتی ہو تم ۔ پاس ہوتے ہوئے بھی اتنی دور ۔ ۔ ۔ دور“ ۔

”دور رہنے والوں کو آپ کیا جانیں“ ۔ اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا ۔

”تمہیں قریب لانے کے لئے مجھے اتنی دور سے آنا پڑتا ہے“ ۔ وہ ہونٹ قریب تر لاتے ہوئے کہنے لگا ۔

”کون آتا ہے“ وہ دبی زبان سے گویا اپنے آپ سے بولی ۔

”میں جو آتا ہوں“ ۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے ۔

”خود آنے کے لئے نہیں دوسرے کو صرف اپنے پاس لانے کے لئے“ وہ پیچھے سرک کر گنگنائی ۔

لیکن اس کی آواز گاڑی کے شور میں دب گئی ۔ جو نہ جانے کسے لانے کے لئے آ رہی تھی ۔ جا رہی تھی ۔ پل ریل گاڑی کے پہیوں تلے جھول رہا تھا نیچے دکھی پانی کا گہرا بہاؤ جھوم رہا تھا ۔

Engr. Faraz Akram
alluurdubooks.blogspot.com

اس واقعہ کے بعد ان کے گھر میں نئے پڑوسیوں کی بات چل نکلی ۔ جب کبھی وہ اکٹھے بیٹھتے اور کوئی بات شروع ہوتی تو پتہ نہیں کیسے بات ہی بات میں نائب یا اس کی بیوی کا تذکرہ چھڑ جاتا ۔ مثلاً اسی روز شام کو برجیس بولی "آپ نے سنا" ۔ اور مسکرا دی ۔

"کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

'اس کا نام نظر ہے نظر ۔ ویسے کہتے ہیں نظراں"

"کس کا" وہ حیرانی سے پوچھنے لگ ۔

"اپنے نائب کی بیوی کا اور کس کا ۔ وہی بات ہے آنکھوں کی اندھی نام ۔ ۔ ۔"

"کیوں بیچاری کو ۔ ۔ ۔" وہ بات کاٹ کر بولا ۔

"ایمان سے بالکل بیچاری ہے" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ "سبھی باتیں ہیں اس میں بس ایک نظر نہیں" ۔

"اور جانتی ہو میاں کا کیا نام ہے ؟ شاعر ہے نا" ۔

"کیا نام ہے ؟"

"عجیب سا ہے ۔ نہاں رومانی" ۔

نہاں ۔ ۔ ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی "بی بی نظر میاں نہاں ۔ سبحان اللہ کیا جوڑی ہے" ۔

"کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہو" ۔

"خدا کی قسم مذاق نہیں ۔ آیئے نا ذرا ۔ دکھاؤں آپ کو ۔ برج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا ۔

"میں دیکھوں ؟ لا حول ولا قوۃ" ۔

"لا حول کی کیا بات ہے ، ویسی نظروں سے نہ دیکھنا بس" ۔

"وہ دیکھیے چولھے کے سامنے چوکی پر" ۔ برج نے کھڑکی کی درز سے لگ کر

کہا ۔ ۔ ۔ ۔ "ہے نا مجسم انتظار ۔ منتظر بیٹھی ہے ۔ توبہ ۔ خالص گوشت پوست ہے ۔ جیسے قدرت نے عورت کو تنگ کر دیا ہو" ۔

"ہاں" ۔ وہ مسکرایا ۔ اب چھوڑو بھی ۔" اور وہ واپس کمرے میں آ گئے ۔ 'ہاں واقعی عجیب جوڑا ہے' ، اقبال ہنسا

"یہ بیچاری جیسے راہ تکنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ ہو اور وہ جیسے راہ کھو کر سرگرداں ہو"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میاں کسی اور سے لَو لگائے بیٹھے ہیں ۔" اقبال مسکرایا ۔

"خواہ مخواہ کسی پر الزام دھرنا ۔ آپ تو" ۔ وہ چڑ کر بولی ۔

"شائد یہی بات ہو" ۔

"ہاں شائد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بی بی تو علانیہ منتظر بیٹھی ہے ۔"

"ہاں میاں کی منتظر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ مسکرایا ۔

"ہوں میاں کی ؟" اس نے بات کاٹ کر کہا ۔ "کسی کی بھی کیوں نہیں ؟"

"بھئی پھر کرے کیا ؟ میاں کسی اور جگہ لو لگا لیں تو بیوی کو بھی حق حاصل ہے کہ کسی کے انتظار میں بیٹھ جائے" ۔

"واہ" ۔ وہ تڑپ کر بولی "شادی نہ ہوئی مذاق ہوا" ۔

"میرا یہ مطلب نہیں کہ ضرور لو لگا لے کسی سے ۔ لیکن لگا لینے کا جواز تو مل جاتا ہے ۔ اخلاقی طور پر" ۔

"سچ ؟"

"ہاں ہاں انصاف تو یہی ہے" ۔ وہ سنجیدگی سے بولا ۔

"بڑے منصف تو دیکھو ۔ اپنے آپ پر بیتے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اللہ نہ کرے میں کسی سے لو لگاؤں" ۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔

"بڑے بگلا بھگت ! نہ جانے کس کس سے لگائی ہو گی" ۔ اس نے ہونٹ

نکال کر کہا ۔

"نہیں برج ۔ صرف تم ہو ۔ صرف تم" ۔ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا ۔

"اچھا" ۔ "مان لیا لیکن کل کی بات کون جانتا ہے" ۔

"ہاں کل کی تو کہہ نہیں سکتا لیکن آج تک ایک تم ہو ۔ تم" ۔ وہ پیار سے بولا ۔

"اچھا وہ مسکرائی آپ کو یقین ہے کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ؟"

"کیا" اس نے پوچھا ۔

"کہ میاں لگا لے تو بیوی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں وہ بولا ۔ انصاف کی بات تو یہی ہے

"مردوں کے انصاف کو" وہ ہنسی ۔ "کون نہیں جانتا مردوں کے انصاف کو"

"ٹھیک ہے ۔ ٹھیس تو لگتی ہے لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا ۔

چلو چھوڑیئے اس قصے کو کیا واہیات بات ہے ہمیں کیا غرض ۔ وہی جانیں بی بی منظراں اور بابو نہاں" وہ ہنسنے لگی ۔

پہلے چند روز تو اقبال حیران رہا ۔ بات ہی ایسی تھی ۔ کیونکہ اس سے پہلے برجیس کا برتاؤ قطعی طور پر مختلف تھا ۔ اگر اقبال کسی پڑوسن میں دلچسپی ظاہر کرتا تو وہ نیچے جھاڑ کر اس کے پنجے پڑ جاتی "خیر تو ہے بہت چمک رہے ہیں آپ" اگر کسی غیر عورت کی بات چھڑ جاتی تو اسے اجازت نہ تھی کہ اس کے متعلق دلچسپی کا اظہار کرے ۔ گھر میں کوئی آ جاتی تو اسے باہر جا کر ٹہلنا پڑتا ۔ صحن میں جانے کی تو بالکل اجازت نہ تھی اسے ، کیونکہ صحن میں کھڑکی کھلتی تھی ۔ اور پڑوسیوں کی بے پردگی کا احتمال رہتا تھا ۔ لیکن اب وہی برجیس اکثر آپ دعوت دیتی کہ وہ درز میں سے منظر کو دیکھے ۔ دوڑی دوڑی پاس آتی ۔ "آیئے آپ کو

کچھ دکھاؤں" اور اس کا بازو پکڑ کر لے جاتی ۔ آج تو حد ہو گئی ۔ آپ کی قسم ۔ "اگر وہ عذر پیش کرتا تو طنزاً چلاتی" ۔ بس اتنی ہمت ہے ۔ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کیا ۔ ایک آنکھ دیکھ کر چھلک جاتے ہیں یہ مرد ۔ ہم بھی تو پردے میں سے مردوں کو دیکھتی ہیں ۔ پر مجال ہے جو پاؤں ڈگمگا جائیں ۔

"اوہ میں سمجھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ فکر نہ کریں آپ" "فکر کیسا" وہ پوچھتا ۔ "بس ۔" وہ جواب دیتی ۔ "آخر کوئی ہوگا ہی نا ۔" حتٰی کہ وہ ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتا ۔ پھر وہ درز سے لگے کھڑے رہتے ۔ اس دوران میں برج زبان کی بجائے کہنی سے باتیں کرتی ۔۔۔۔ پھر ایک دن جب وہ برج کے کہنے پر کھڑکی سے جھانکنے کے لئے گیا اور درز میں سے دیکھا تو بوکھلا سا گیا ۔ "حد ہو گئی" اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا ۔ چونکہ سامنے منظر صحن میں نہا رہی تھی ۔ شربتی پنڈا ۔ جو چٹا سفید ہونے کے علاوہ جوانی سے بھرا ہوا تھا ۔ بوٹا سا قد ۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا لیکن دیکھا تو برج وہاں تھی ہی نہیں ۔ ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر اردگرد دیکھ ازسرنو شست باندھ کر کھڑا ہوگیا اور دیر تک دیکھتا رہا ۔

پھر وہ آپ ہی آپ موقعہ کی تلاش میں رہنے لگا ۔ جب کبھی موقعہ ملتا چپکے سے درز سے لگ کر منظر کو دیکھتا رہتا ۔ ایسی دلچسپی ہوگئی اسے ۔ بلکہ کئی مرتبہ وہ بھاگا بھاگا برج کے پاس جاتا "آؤ برج تمہیں کچھ دکھاؤں" ۔ ایک ساعت کے لئے برج کی آنکھ میں چمک لہراتی "آؤ بھی وہ چلاتا ۔ دیکھو تو چولہے کے سامنے بیٹھی ہونٹوں پر سرخی لگا رہی ہے ایک وہ ہے کہ بچاری کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں ۔ اور ایک تم ہو ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ آؤ بھی نا ۔

"آپ ہی دیکھیئے" وہ لاپروائی سے کہتی ۔ "وہ چلاتا ۔ "اونہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرخی لگانے سے کیا بنتا ہے وہ مشین چلاتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جاتی" ۔ جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا ؟"

"بہت جانتی ہو تم اس کی روح کو" وہ طنزاً کہتا ۔

kitaabghar.com

”جانتی تو نہیں پر سمجھتی ضرور ہوں“ ۔

”بہت روحانی طاقت ہے تم میں“ ۔

”آپ کیا جانیں“ وہ ہنستی ۔

”اب اٹھو بھی نا“ وہ کھسیانا ہو کر کہتا ۔

”میں تو روز دیکھتی ہوں ۔ آپ ہی دیکھیئے جا کر“ ۔

”نہیں برج“ ۔

”اوسان کھونے کی کیا ضرورت ہے“ ایک دن وہ لاپروائی سے طنزاً بولی ۔ ”ایسا شوق ہے تو ملا دوں دونوں کو“ ۔

”تم“ وہ چلایا ۔ ”تم اور ایسی بات ۔ پہلے تو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا“ ۔

”کیوں ؟“

”پہلے تو تم ایسی بات پر غصے سے بھوت بن جایا کرتی تھیں ۔ یاد ہے رحمت کی ماں کے متعلق کتنا پاکھنڈ مچایا تھا تم نے“ ۔

وہ مسکرا دی ۔

”اب بھی مذاق کر رہی ہو ۔ میں جانتا ہوں لیکن پہلے تو ایسا مذاق سہا نہ جاتا تھا تم سے“ ۔

”ہاں“ وہ ہنسی ۔ ”مجھے معلوم نہ تھا کہ جسم کے میل سے کیا ہوتا ہے ؟“ اس کی ہنسی میں مایوسی اور طنز کی جھلک تھی ۔

”لیکن اس کی عزت کا خیال نہیں کیا“ ۔ وہ نظراں کے گھر کی طرف ہاتھ چلا کر بولا ۔

”آپ ہی تو کہتے تھے ۔ میاں کسی اور سے لو لگالیں تو بیوی ۔۔۔۔۔۔۔ ۔“ وہ رک گئی ۔

”اچھا تو اب تم ہم دونوں میں پُل بنو گی“ وہ ہنسنے لگا ۔

”میں کیوں بنوں ۔ پل تو وہ ہے ۔ آپ کی نظراں“ ۔

”ہوں تو تمہارے حساب سے میں گاڑی ہوا ۔ مگر پل اور گاڑی ملائے گی کسے ۔ دو علاقے بھی تو ہوں“ ۔ اس نے مذاق سے کہا ۔

”بیچاری“ وہ اپنی ہی دھن میں بولی ۔ ”سارا سارا دن انتظار میں بیٹھی ہے ۔ کب گاڑی آئے اور اوپر سے گزرے“ ۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ پھر قریب ہو بیٹھا ۔ ”برج“ ۔ اس نے پیار بھری آواز میں کہا ۔ ”برج“ اس کے بے تکلف ہاتھ کسی پل نما ابھار کو ناپنے لگے ۔

”اونہوہ“ ۔ وہ چلائی ۔ ”نہ جانے آپ تو ہر سمے ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔“

اقبال نے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی ۔ وہ آواز اس کے کانوں میں پڑی ۔ کنپٹیوں میں تھرکنے لگی ۔

”برج“ وہ چلایا ۔ وہ جھجک کر اُٹھ بیٹھی ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ ”کیا کرتے ہیں آپ“ ۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ اور سامنے کھڑی گاڑی کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی ۔ ”دیکھیئے نا“ ۔ اس نے اقبال سے کہا ۔ ”سب مسافر اپنی اپنی دھن میں لگے ہیں ۔ کسی کو احساس نہیں کہ گاڑی رک گئی ہے“ ۔

”ہاں وہ ہنسا“ ۔ لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے ”ان کا مطلب تو پہنچنے سے ہے ۔ آخر پہنچ ہی جائیں گے“ ۔

”کون جانتا ہے“ ۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی ۔

”پگلی وہ ہنسا ۔ ”جو چل پڑے وہ پہنچ ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی ۔“

”سچ ؟“ وہ کھوئی کھوئی بولی ۔

”ہاں“ ۔ وہ پاس آ کھڑا ہوا ۔ اس کے بے تکلف ہاتھ پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے ۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی ۔ اور اس کی پہنچ سے دور ہو کر بولی ۔ "اونہوں ۔ اُدھر" اس نے نظر کے گھر کی طرف اشارہ کیا ۔

باہر سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکی اور کھڑکی میں سے دیکھ کر مسکرا دی ۔

"کون ــــــــــ ـ ـ نائب ہے" اس نے پوچھا ۔

"ہاں ۔ سیٹی کی آواز سنی آپ نے ۔ دور دیس کا رہنے والا بجا رہا تھا" ۔

"بیچارہ پرائے دیس گیا ہے نا" ۔

"ہاں" وہ ہنسی اور پھر اقبال کی بات دہرانے لگی "جو چل پڑے آخر پہنچ ہی جاتا ہے نا" ۔

ہاں تو دن رات وہ دونوں نظر اور نہاں باتیں کیا کرتے ۔ روز بروز اقبال کا شوق بڑھتا جاتا ۔ اور وہ درز میں سے نظر کو دیکھتا رہتا ۔ ادھر نظر میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ کوئی اسے چوری چوری دیکھتا ہے ۔ شائد اسی وجہ سے اسے احساس تنہائی اور انتظار کم ہوتا گیا ۔ روز بروز برجیس کی نگاہیں اور بھی پرے ہٹتی گئیں ــــ دور ــــــــــــ دور ــــــــــ

پھر نظر نے ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا ۔ حتیٰ کہ وہ سارا سارا دن برج کے پاس رہنے لگی ۔ اقبال کے ذکر پر نظر کی آنکھ میں چمک لہراتی ۔ برج منہ موڑ کر مسکراتی اور پھر نظر کی طرف ایسے معصوم انداز سے دیکھتی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو ۔ نہاں کی بات ہوتی تو برج انہماک سے کام میں مصروف ہو جاتی ۔ یا نہ جانے کیوں عین اس وقت مشین کی سوئی میں سے تاگا نکل جاتا اور اسے جھک کر تاگا پرونا پڑتا ۔ اگرچہ یوں کرنے سے اس کا کان نظر کے منہ کے قریب تیز ہو جاتا ۔ پھر دوپٹہ سر سے ڈھلک کر نیچے گر جاتا اور نیلا آویزہ ڈولتا ۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی ڈول رہی ہو ۔

اکثر جب ایسے سمے اقبال آ جاتا تو نظر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنا آپ چھپانے کی کوشش میں لگ جاتی ۔ "لاحول ولا قوۃ" اقبال کے منہ سے بیساختہ

نکل جاتا یا شائد خود ساختہ ۔ بہرحال وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا ۔ پھر نظر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی "توبہ باتوں میں پتہ ہی نہ چلا ۔ ان کے آنے کا ۔ نہ جانے مجھے یوں بیٹھے دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے دل میں" ۔ اور برج مسکراہٹ بھینچ کر کہتی ۔ "واہ اس میں کیا برائی ہے ۔ انہوں نے دیکھ لیا تو کیا یوں گھبرانے لگیں تم تو گزارہ کیسے ہو گا ۔" ایک دن وہ چڑ کر بولی ۔ "تو کیا سامنے آ جایا کروں ان کے ۔ پھر تم کیوں پردہ کرتی ہو اُن سے" ۔

"کہاں کرتی ہوں میں" ۔ وہ مشین میں تاگا پروتے ہوئے بولی ۔ اور مسکرائی ۔

"لیکن وہ تو کبھی آئے ہی نہیں ۔ تمہارے سامنے نظر آپ ہی آپ بولی ۔

"تو یہ میرا قصور ہے کیا" ۔ برج ہنسی ۔

"وہ آ بھی جائیں تو نہ آنے کے برابر ۔" نظر ہنستے ہوئے بولی ۔

"کیوں ؟"

"ان کی عادت ہی ایسی ہے ۔ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں ۔ نہ جانے کیا ہے انہیں" وہ منہ بنا کر گویا اپنے آپ سے گنگنائی ۔ اور پھر کسی گہرے خیال میں ڈوب گئی ۔

اس روز شام کو برج اداس بیٹھی کچھ سی رہی تھی ۔ پاس سعیدہ کھیل رہی تھی ۔ اقبال ابھی سٹیشن پر ہی تھا کہ نظر آئی اور بولی ۔ "ذرا سی شکر ہو گی ۔" برج کام کرتے ہوئے کہنے لگی ۔ "اندر باورچی خانے میں ہے ۔ سبز سا ٹین ہے ۔ خود ہی لے لو جا کر ۔" اس کے جاتے ہی اقبال آ گیا ۔ پیٹی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی ۔ آتے ہی پوچھنے لگا ۔ "میری دھوتی کہاں ہے ۔" ۔ عین اس وقت سوئی میں سے تاگا نکل گیا ۔ برج جھک کر تاگا ڈالنے لگی ۔ اس کا ہاتھ کانپا ۔ لٹ منہ پر گر پڑی ۔ کان میں نیلا آویزہ لرزنے لگا ۔ بولی "اندر باورچی خانے میں کھونٹی پر ہو گی ۔ ' "اچھا کہہ کر وہ باہر صحن میں نکل گیا ۔

برج نے منہ اٹھایا تو آنکھیں بھیگی سی تھیں ۔ منہ پر سرخی کی جھلک تھی ۔

"اماں" سعیدہ چلائی ۔ "روتی ہو تم" ۔

"اوں ہوں" اس نے مسکرا کر کہا ۔

"پھر یہ آنچھوں" ۔ سعیدہ نے اس کی گال پر انگلی رکھ کر کہا ۔

برج نے پیار سے سعیدہ کی انگلی چوم لی ۔

"نہیں نہیں ۔۔۔۔۔"

"سنظر ۔۔۔۔۔۔"

اندر سے آوازیں سنائی دیں ۔ برج کے کان میں نیلا آویزہ اور بھی لرزنے لگا ۔

"اوں آنچھو ہیں" سعیدہ تتلا کر بولی ۔

"کہاں ہیں ؟"

"کھوشی کے ہیں ؟" سعیدہ نے پوچھا ۔

برج سر ہلا کر مسکرا دی ۔

آیا ۔ "گاڑی "۔۔۔۔۔۔ سعیدہ گاڑی کو آتا دیکھ کر چلائی

برج نے اسے اٹھا لیا اور دروازہ میں جا کھڑی ہوئی ۔ اس وقت اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ دروازہ کی چک لپٹی ہوئی ہے ۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں ۔ ۔۔۔۔۔۔ اور نجانے کہاں دیکھ رہی تھیں ۔ دور ۔۔۔

"امی ۔۔۔۔ بابو" سعید نائب کو آتے دیکھ کر چلائی ۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی ۔

گاڑی میں مسافر منزل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ پل ایک سٹیشن ہے ۔ ایک اہم سٹیشن جو دو سرحدوں کو ملاتا ہے ۔ بلکہ وہ سٹیشن کے وجود ہی سے منکر تھے ۔ اور انہیں پتہ نہ تھا ۔ کہ ایک اہم

منزل گزر رہی ہے ۔ گزر چکی ہے یا وہ غیر علاقہ میں داخل ہونے والے ہیں ۔

البتہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا ۔

"ہائے میرے اللہ" وہ دفعتاً نائب کو دیکھ کر چلائی ۔ اور پیچھے ہٹی ۔

"ہائے میرے اللہ" باورچی خانے سے مدھم آواز سنائی دی ۔

"ہائے میرے اللہ ۔ ہائے میرے اللہ" گاڑی شور مچاتی ہوئی غیر علاقہ میں داخل ہو گئی ۔

* * *

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی ۔ احسان علی کی ۔ محلے میں کون تھا ۔ جو ان کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا ۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے ۔ جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی ۔ تو کھانسی کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے ۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا ۔ محلے کے کنوئیں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی ۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں ۔ مٹیار عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ۔ خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ کوئی بات کریں ۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں ۔

مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی ۔ ”یہاں کھڑے کسے تاڑ رہے ہو احسان علی ؟“

”یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے ۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا ۔

”اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو ۔“ بھابی کہنے لگی ۔ ”اللہ رکھے جوان ہوگیا ہے ۔“

”اور تو کیا اپنے لیے دیکھ رہا ہوں بھابی“ احسان علی مسکرایا ۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا ۔ احسان ہنس کر بولا ۔ ”دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی چاچی اپنے لئے دیکھوں تو لوگ گھورتے ہیں کسی اور کے لئے دیکھوں تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں ۔“

جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا ۔ ایسا جواب دیتے کہ سنکر مزا آ جاتا ۔

شاداں نے یہ سنکر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی ۔

”چاچی اس عمر میں اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا ۔“

احسان علی نے آہ بھری ۔ بولے ۔ ”کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں ۔“

”اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی ۔“ شاداں مسکرائی ۔ ”ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں ہٹی ۔“

”اچھا شاداں ایمان سے کہنا ۔“ وہ سنجیدگی سے بولے ” کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے ۔ ؟“

”ہائیں چچا ۔“ شاداں ہونٹ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی ۔ ”میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں ۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے ۔“ وہ ہنسے ۔ ”جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں ۔ لیکن جب جوان تھی توبہ جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں ؟ ۔“

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے ۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا ۔ ”توبہ بہن ، احسان علی اور بات کرنے سے چوکے ۔“

چاچی بولی ۔ ”ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی ۔ اب تو باتیں ہی باتیں ہیں ۔“

”لے بہن“ شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ ”اب کونسا حاجی بن گیا ہے اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے ۔“

”لیکن شاداں“ بھابی نے کہا ۔ ”شاباش ہے ۔ اس کو ۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی نظر سے نہیں دیکھا ۔“

”یہ تو میں مانتی ہوں ۔“ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری ۔

"یہ وصف بھی کسی کسی میں ہوتا ہے ۔" چاچی نے کہا ۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سنی تھی تو بولے ۔

"اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں"

"کیوں"۔ چاچی نے ہنس کر کہا ۔" یہ کیا جھوٹ ہے ۔ تمہاری یہ بات واقعی خوب ہے ۔ میں تو منہ پر کہوں گی احسان علی ۔"

"لو چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا ۔"

احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔"چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلّی کنوئیں میں گر گئی ۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے ۔ پھر بولی بہن آج کی رات یہیں بسر کریں گے ۔"

"یہ بلّی کا قصہ کیا ہوا ۔" چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا ۔" شاداں بولی ۔

"بس تو چھوڑ اس بات کو ۔" بھابی نے کہا ۔"احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا ؟"

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے ۔"چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے ۔بیچاری ایسی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے ۔ کیوں شاداں ؟"

"ہائے اللہ ۔ سنا تم نے چاچی ؟" شاداں چلائی ۔

"سمجھی بھی ہو اس کی بات ؟" بھابی مسکرائی ۔

"سب سمجھتی ہوں ۔" چاچی نے ہنس کر کہا ۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے ۔"شاداں بولی "کہ محلے والیاں ایسی ہیں ، پر میں پوچھتی ہوں ۔ چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی ریجھ جاتے اس پر ؟"

"تم اس کی باتیں سنو ۔" بھابی نے کہا ۔

"توبہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے "چاچی ہنسی ۔

"کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزا چکھا دیتی تمہیں چچا ۔"شاداں آنکھیں چمکا کر بولی ۔ "جوتا دکھا دیتی میاں کو ۔ کیوں بھابی ؟"

"واہ" احسان علی مسکرائے ۔ "شاداں جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی ۔"

"ہائے میں مرگئی ۔" شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ۔

"احسان علی تم پر خدا کی سنوار " چاچی نے ہاتھ چلایا ۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے ۔ ان کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے ۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی ۔ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں ۔ جوان مٹیاریں تو اب بھی پلا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔

جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا ۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا ۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی ۔ "ہائے میں مرگئی ۔ یہ تو اپنا احسان علی ہے ۔" ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی اسے مخدوش نگاہوں سے گھورتی تھیں ۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے ۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے ۔ اور یوں ہمکلام ہوتے جیسے فراخدلی کیوجہ سے ان کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے ہوں ۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں اکثر کہا کرتے ۔ "بوڑھا ہوگیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی ۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے ۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی"

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے ۔ باباجی ۔"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے ۔"

Engr. Fayaz Akram

kitaabghar.blogspot.com

”دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے ۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے کیا ؟ وہی چھیڑ خانی ۔ لاحول ولاقوۃ ۔“

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہو چکے تھے ۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں ۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی ۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو کر واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا امپائر بن کر کھڑے ہو جاتے ۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے ۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے ۔ چچا جی ہمارے آڑی بنیں گے ۔“ نہیں ہمارے ۔“ ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں ۔”لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں ۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی ۔ ”بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے“ سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی ”ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی ۔ شاہ نشین سے چاچی بولتی ۔ ”توبہ شاداں تو بھی کسی رخ چین لینے نہیں دیتی ۔ شکر کر کہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے ۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے ۔“ مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انہیں دیکھ کر ہنستا ”کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے ۔ اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو ۔“ احسان علی ہنس کر گنگناتے ”وقت پیوری گرگ ظالم می شود پرہیزگار ۔“ دوسرا آ کر کہتا ”دنیاداری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی ؟ صوم و صلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو ۔“ احسان علی کہتے ”باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا ۔“ ”لاحول ولاقوت ۔“ باباجی بڑبڑاتے ”لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آگیا ۔“ احسان علی ہنس ہنس کر لوٹ ہو جاتے ۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ ویران دکھائی دیتا تھا ۔ اگرچہ سردیوں میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر آزار بند بنا کرتی تھیں دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں ۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے ۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں ۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا ۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں

Engr. Fiaz Akram

پیدا کرتے ۔ تیلیاں ٹکراتیں ۔ آزار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی گلے ہوتے شکائیتیں کی جاتیں ۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے ۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی ۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی ۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے ۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے ۔ اولیا کرام کی حکایت سنائی جاتیں ۔ ہنگامہ تو رہتا مگر اس میں مزاح کی شرینی نام کو نہ ہوتی عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا ۔

پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آبسے ان کے بعد محلے کا رنگ ہی بدل گیا ۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آنکلتے اور آتے ہی ایسی بات کہہ دیتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا ۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے ۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سننے لگتے ۔ لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے ۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا ۔ اس پر احسان کھلکھلا کر ہنس پڑتے ۔ ”بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔“ احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی ۔

پھر ـــــــ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا ۔

چوگان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں ۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی ۔ کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو دیکھ لیا ۔ چاچی کو اشارہ کر کے با آواز بلند بولی ”چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے

بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں ۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں ۔"

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا ۔ "تم تو خواہ مخواہ اس بیچارے ۔۔۔۔۔"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا ۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی" شاداں نے پھر سے بات شروع کی ۔ "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی ۔"

"ہاں شاداں" چچی نے منہ بنا کر کے کہا ۔ "زمانہ ہی ایسا آیا ہے ۔"

اس کے بعد مجمع پر خاموشی چھاگئی ہر کوئی احسان علی کی بات سننے کی منتظر تھی ۔ اگرچہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو ۔

احسان علی آئے اور چپ چاپ ان کے پاس سے گزر گئے ۔

انہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران رہ گئیں ۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہے ؟" چاچی زیر لب بولی ۔

"میں تو آپ حیران ہوں "۔ شاداں ہاتھ ملنے لگی ۔

"کہیں گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے تھے ۔" شاداں نے پوچھا ۔

"لو ۔۔" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا ۔ "جس روز نواب بی بی سے لڑے ۔ اس روز تو اور بھی چمکا ہوا ہوتا ہے ۔ کیوں بھابھی یاد ہے ۔ کل کیسے ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سنا رہا تھا ۔

"ہاں ." بھابی مسکرائی جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا ۔

"اس کا کیا ہے" چاچی بولی "اس کے لیے تو ہر بات تماشہ ہے چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی ۔"

"ہائے چاچی کیسی اچھی طبعت ہے ۔ احسان علی کی ۔ کبھی ماتھے پر

تیوری نہیں دیکھی ۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا ۔"

"پر میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے ۔" بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی ۔

شاداں آزار بند لپیٹتے ہوئے بولی "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں ۔"

"اے ہے دو جوڑے تو چڑھا لینے دے" بھابی نے کہا ۔

"ہونہہ دو جوڑے اتنا لوبھ بھی کیا ۔" اس نے اٹھ کر بھابی کے آزار بند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی ، کہنے لگی ۔ "خیر تو ہے ۔ احسان علی کو کیا ہے آج ؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا ۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا ۔ اسے باہر جاتے ہوئے" بھابی نے کہا

"میں نے تو انہیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا ۔" شاداں بولی ۔ "میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا ۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی ۔ کہیں میری بات کا بُرا نہ مان لیا ہو ۔ توبہ میں نے بات ہی کیوں کی ۔

"اونہوں ۔" نواب بی بی نے کہا ۔ "برا ماننے والا نہیں وہ ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا ۔ جو یوں پاس سے گزر گیا ۔" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے" نواب بی بی نے کہا ۔ "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج "لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے ۔"

بائیں میں مر گئی" شاداں چلائی ۔ آپ اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے کیا ۔۔۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے ۔"

اس میں حرج ہی کیا ہے ۔" چاچی بولی اللہ رکھے جوان لڑکا ہے ۔ آپ کماتا ہے لکھدیا تو کون سی قیامت آگئی ۔"

”میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہیئے ۔ اس بات میں ۔“

”اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی ۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامرد کر دو ۔ لیکن ان کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں اتنی عمر ہو چکی ہے ۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی ۔“

”نہ بہن“ چاچی بولی ”مجھ سے تو آپ اس نے کئی بار کہا کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا اس کی شادی کر دیں گے ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔ آج کل یہ کام لڑکے کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتے ، بات بھی سچی ہے ۔“

”اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے ؟ شاداں چلائی

”سچ ؟“ بھابی ناک پر ہاتھ رکھ کر بولی ۔

”ہاں بھابی ۔“ نواب بی بی بولی ۔“ پہلے تو لڑکے کو اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اس نے اپنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو جزبز ہو رہے ہیں ۔“

کون ہے وہ ؟ چاچی نے پوچھا ۔

مجھے کیا معلوم ۔ اسکول میں استانی ہے ۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اسکی ۔“ ہم بھی تو دیکھیں“ شاداں نے منت کی ۔

”نواب بی بی اٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی ۔

”ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم ۔“ شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی ۔

”اے ہے ۔“ چاچی بولی ”ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں ۔“

توبہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے ۔“بھابھی ہنسی ۔

کتنی خوبصورت ہے ۔“شاداں بولی ۔ ”احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی ہے بھلا ۔

عین اس وقت احسان علی آ گئے ۔ شاداں کی بات سن کر وہ گھبرا گئے ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے ۔ پھر کمرے سے باہر جانے لگے ۔ لیکں شاداں کب

چھوڑنے والی تھی انہیں ”مبارک ہو چچا ۔“ وہ بولی نئی بہو مبارک ہو محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں ۔ اللہ رکھے لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ۔“

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا چہرہ فق ہو گیا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولا ۔”وہ تو بے وقوف ہے بے وقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں ۔ بیاہنے کے لئے نہیں بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا ؟“

”کیوں اس کو کیا ہے ؟“ شاداں بولی ”دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے ۔“

یہی تو مصیبت ہے ۔“وہ سر کھجلاتے ہوئے بولے ۔

”آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو ۔ احسان علی ۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا ۔“بھابی بولی ۔

”پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں ناں بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو یہ دیکھو لو یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے“وہ جوش میں بولے ۔ ”دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے ۔

”کیوں نواب بی بی کو کیا ہے ۔“ چاچی ہنسی ۔

میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے ۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی ؟“

”آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت بیوی ہو ۔ اس میں حرج ہی کیا ہے ؟“

شاداں مسکرائی۔

میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے ۔ لیکن چاچی یہ ستریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں ۔ بیاہنے کیلئے نہیں ۔“

”ہائیں ۔“شاداں نے ناک پر انگلی رکھ لی ۔ ”احسان علی تم نے تو حد کر دی ۔“

”کوئی محلے کی بیاہ لیتا ۔ پھر چاہے جہاں مرضی ہے یارانے لگاتا پھرتا ۔“

احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے ۔

”توبہ میری ۔ احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے ۔“چاچی بولی ۔

”لو اسے دیکھو نا ذرا“ احسان علی نے پھر تصویر ان کے سامنے رکھ دی ۔ ”یہ آنکھیں !! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں ۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا ۔“

”اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا ۔ بھلی اچھی تو ہے“ شاداں مسکرائی ۔

”مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہوتا ۔“ احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگے ۔

”اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو ۔“چاچی ہنسی

”بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا ۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں ۔ آخر مجھے بھی تو اس گھر میں رہنا ہے ۔“وہ مسکرائے ۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی ۔ ”ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا ۔“

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اسی طرح گم سم ہوگئے ۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے ۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھے ۔“ حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہیئے ۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے ۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھدے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں ۔“

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی ۔ چٹکلے سنائے ۔ اپنے تجربے اور مشاہدہ کو پیش کرنے کے لیے آپ بیتیاں بیان کیں ۔ لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا ۔ تو وہ دلیلوں پر اتر آئے ۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اس دھمکانا شروع کر دیا ۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی ۔ اس پر حمید بولا ۔ ”ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں ۔“ اس

وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا لگتا تھا ۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو ۔

دفعتاً وہ بھر جلال میں آگئے بولے ۔ ”اچھا بیشک بیاہ لاؤ اسے لیکن وہ ہمارے ہاں کبھی نہ آئے کبھی نہیں ۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے ۔“ اس پر حمید اٹھ بیٹھا بولا ۔ ”آپ کی مرضی ۔“ ”لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو ؟“ انہوں نے پوچھا ۔ ”میں مجبور ہوں ابا جی ۔“ حمید نے کہا ۔ ”ہماری شادی ہو چکی ہے ۔“ہو چکی ہے ؟“ وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے ۔ ”ہو چکی ہے ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟“

”یہ حقیقت ہے ۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے ؟“ ”ایک ہفتہ“ انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا

”یہ بات ہے تو پھر جھگڑا کیسا ۔“ وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اس کی ہنسی بے حد کھسیانی تھی ۔

حمید اٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا ۔ ”ایس !“

احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔”تم تو کہتے تھے یہ کمرا پڑوسیوں سے متعلق ہے ۔“ ”اور کیا کہتا ابا جی ۔“ حمید مسکرایا اور پھر با آواز بولا ۔ نسرین ۔ آجاؤ ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں ۔“ ”اوہ !“ احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ”تو یہ بات ہے ۔“

نسرین بڑے پُر وقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی ۔ ”سلام عرض کرتی ہوں ۔“ سریلی آواز کمرے میں گونجی ۔ وہ ایک ساعت کیلئے وہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے ۔ ”بیٹھیے تشریف رکھئے ۔ تشریف رکھئے ۔“ وہ گھبرا کر بولے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے ۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے ۔ اب کیا ہو سکتا ہے خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا ۔ فضول ۔ ”ہاں بھئی ۔“ وہ حمید سے مخاطب ہوئے تم انہیں محلے میں لاؤنا ۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا ۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے ۔“ ”سچ ؟“ حمید بولا ”کیا واقعی

آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں ؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں ۔ تمہیں چھٹی لینی چاہیئے ۔ ہاں ۔" چھٹی میں نے پہلے ہی لے رکھی ہے ۔" حمید مسکرایا ۔ "تو پھر یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ۔ کیا حماقت ہے ۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی ۔ "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں ۔ اچھا میں اب جاتا ہوں ۔ نسرین کو ساتھ لانا سمجھے ؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوگان میں جمع تھیں نسرین نے کالا ریشمیں برقع اتارا تو ایک ساعت کے لئے وہ جھجھک گئیں ۔ رسمی سلام ہوئے دعائیں دی گئیں ۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے ۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی ایک بولی ۔" لے بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل ۔" شاداں بولی ۔ "کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے ۔" تیسری نے کہا ۔" منہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو انگل چڑھا ہوا ہے ۔" چوتھی نے کہا ۔"ویسے تو چودھویں کا چاند ہے ۔ احسن علی کا گھر تو منور ہوگیا ۔" "ہاں بہن" شاداں نے آہ بھر کر کہا ۔ "اُسے محلے والیاں پسند نہ تھیں ۔" شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے ۔ بھابی بولی ۔ "سنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے ۔" "لاحول ولاقوۃ ۔" احسان علی کے منہ سے بیساختہ نکل گیا ۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں بولی "لو چاچی آج تو چچا کے منہ سے بھی لاحول سن لیا ۔"احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سرکنے وہاں سے شاداں نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا ۔ بولی "اب کہاں جاتے ہیں آپ ۔ میں تو گن گن کے بدلے لوں گی ۔ چاچی ہنسی بولی "کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے قرآن کے لفظ نکلے ۔ "پر چاچی" شاداں چلائی "ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی انہیں ۔" اے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو ؟" "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں ۔" شاداں چمکی "اس دن میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا ۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا ۔" "اب تو اسے جانے بھی دے گی یا نہیں ۔" چاچی چڑ کر کہنے لگی "گھر بہو آئی ہے اور تو نے اسے یہاں پکڑ رکھا ہے ۔"

اسی شام کو جب دولہا دلہن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسب معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا ۔ "خیر سے دلہن گھر میں آئی ہے آپ کو تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی ۔" جب کبھی شاداں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نا کوئی فقرہ چست کر دیا کرتے لیکن اس روز وہ بولے ۔" سچ ــــــ۔ اچھا شاداں تو بھی تو کیا کہے گی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی ۔ آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں ۔" یہ کہہ کر وہ حمام کے پاس جا بیٹھے اور وضو کرنے لگے پہلے تو وہ سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی ۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی کہ احسان علی نے نفل پڑھے "سچ" چچی بولی۔

"کیا واقعی ۔" بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ۔ "نہیں نہیں میں نہیں مانتی ۔"

"تمہاری قسم" شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

"مبارک قدم ہے دلہن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے" محلے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو اس پر بحث ہونے لگی ۔

"ابھی ہر بات کے لئے وقت مقرر ہے۔"

"میں کہتا ہوں کہ شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا ۔"

"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ ۔"

احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا "آخر آگئے نا راہ راست پر ۔"

"ہاں بھئی اب تو چھپ چھپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں ۔"

"احسان علی تو کہا کرتا تھا جب غلاظت کا احساس ہو تب ۔"

"آگئے نا عورتوں کی باتوں میں ۔" احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی کون ہے بابا جی جو عورت کی بات میں نہیں آتا ۔ سب مجھ سے ہیں ۔"

"لیکن اس میں بُرا کیا ہے ۔" بابا جی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا ۔"

دو دن تو احسان علی کے گھر ہنگامہ رہا ۔ عورتیں آتی جاتی رہیں ۔ محلے کے کمین میراثی ڈوم اور بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آموجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب نے کہا ۔ "اب کیا دلہن کے لئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے ۔ اور محلے والے ، انہیں تو ولیمہ کی دعوت دینی ہی ہوگی ۔"

پہلے تو احسان علی شہر جا کر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے ۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہوگیا ہے تو وہ گھبرا گئے ۔ "بولے حمید کا جانا ٹھیک نہیں ۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں ۔" "تو پھر میرے ساتھ کون جائے گا ؟ "نواب بی بی نے چڑ کر پوچھا "تو میں چلا جاتا ہوں ۔" وہ بولے ۔ اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابا جی ۔ آپ جو گھر ہیں نسرین اکیلی تو نہ رہے گی ۔" احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جا کر نہ جانے کیا کیا اٹھا لائیں گے ۔" "اوہ یہ بات ہے ۔" احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ اس بات پر نواب بی بی چلائی "اے ہے

دلہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں لوگ کیا کہیں گے ۔" احسان علی خاموش ہوگئے ۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لیکر دو روز کے لئے شہر چلا گیا ۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے ۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے لگے ۔ پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے ۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دلہن اور ان کے نفلوں کی بات چھڑ گئی ۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے ۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا تو لگے شور مچانے ۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے میں کھلتی تھی ۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آ کھڑے ہو گئے چوگان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا ۔ اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز

انہیں کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی بار بار کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے ۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی "بولی رات کے لئے کیا بنواؤں ۔" "جو تم چاہو ۔" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے ۔ "اوہ" ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔ نسرین چونک پڑی "کیا چاہیئے آپ کو ۔" "میں تو بھول ہی گیا ۔" وہ اپنی دھن میں بولے ۔ "کیا ۔"نسرین نے پوچھا ۔ کچھ نہیں کچھ نہیں وہ بڑبڑاتے" میرا مطلب ہے ۔" انہیں خود سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں ان کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں ۔ اطمینان کا سانس لیا جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو ۔ "میرا مطلب ہے ۔" وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے ۔" انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھا دی ۔ اور آپ پاس والی کرسی پر بیٹھ کر سوئیٹر بننے لگی ۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے ۔ ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا ۔ مڑ کر دیکھا ۔ نسرین بیٹھی کچھ بن رہی تھی ۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے "میرا مطلب ہے یعنی ابھی تو وقت ہے ۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی مسجد ہے ۔" یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے وہ باہر نکل گئے اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کیا ہوا ۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے ڈیوڑھی خالی پڑی تھی ۔ وہاں انہیں ہوش آیا ۔ سوچنے لگے ۔ پھر نہ جانے مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے ۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے ان کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ ایک بولا "اس کو بھولا نہ جانیئے جو صبح گیا گھر آوے شام ۔" دوسرا کہنے لگا ۔ "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے ۔ یہ سن کر معاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں ۔ عین اس وقت بابا جی آ گئے ۔ احسان علی کو پکڑ لیا "آخر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی ۔" وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے اس بات پر انہیں اطمینان سا ہوگیا بولے "یہ دیکھو میں تو نہیں آیا ۔ لایا جا رہا ہوں ۔" "چلو یونہی سہی ۔" بابا جی نے کہا ۔ تیسرا بولا ۔ " آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے نئی بہو کے دم قدم کو دعا دو بھئی ۔" چوتھے نے کہا "ورنہ کہاں احسان کہاں

مسجد ۔ "اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت ۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر بچھا لیا ۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی ۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے ۔ لیکن بار بار نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں ۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سرخ چپلی ان کی آنکھوں تلے ناچتی ۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا ۔ اف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے واہیات بو تھی ۔۔۔ ہاں وہ میری کتاب" آپ ہی آپ گنگناتے "کتاب ؟" نسرین کی آواز کمرے میں گونجی میں دیتی ہوں آپ کی کتاب ۔ "نہیں نہیں" وہ چلائے "میں خود لے لوں گا۔" وہ اٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی ۔ "لاحول ولاقوۃ" بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا ۔ دور ہی رک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں ۔" وہ نیلی کتاب بائیں طرف والی ۔" وہ چلائے "وہاں رکھ دو" انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا ۔ "وہاں ۔"

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے ۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں ۔ دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں ۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے ۔ انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں ۔ اور پھر چونکے "کیا چھتے نائی کی ماں نہیں آئی ۔" وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے ۔ کوئی کام ہے کیا ؟" نسرین نے پوچھا ۔ "نہیں نہیں ؟" وہ گھبرا گئے "ویسے ہی وہ سونے کو تو آئیگی نا یہاں" "اس کی کیا ضرورت ہے ؟" نسرین بولی "میں جو ہوں ۔" "اوہ" وہ از سرِ نو گھبرا گئے "میں جو ہوں ۔ میں جو ہوں" دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں ۔ ۔۔۔۔۔۔ "اوہ گیارہ بج گئے" انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں ۔" نسرین نے جواب دیا ۔ وقت ہی نہیں گزرتا ۔"

"وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا" گھڑی کراہنے لگی ۔

"وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے ۔

رات کو وہ گھبرا کر اٹھے ۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی ۔ چاروں طرف عجیب سی بُو پھیلی ہوئی تھی ۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی ۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے ۔ چینی چینی کسی نے تمسخر سے ان کے کان میں کہا سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں ۔ جن پر روغن چمک رہا تھا ۔ "فضول" انہوں نے منہ بنایا ۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے ۔ صحن میں چاندنی پٹکی ہوئی تھی ۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں ۔ بال گوری دے بچھیر کالے ۔ نہ جانے انہوں نے کیوں محسوس کیا ۔ جیسے ان کی زندگی کی تمام تر رنگینی ختم ہو چکی ہو ۔

اندر آ کر وہ سوچنے لگے ۔ "ہوں تو دو بجے ہیں ۔" "وقت گزرتا ہی نہیں وقت گزرتا ہی نہیں" گھڑی چلانے لگی ۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ جو ہونا تھا ہو گیا جو ہونا تھا ہو گیا ۔ انہوں نے سوچا ۔ حمید نے کس قدر فاش غلطی کی ہے ۔ بیوقوف انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا ۔ اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے ۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد نہ تھی ۔ میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آ رہی تھیں ۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے ۔

عین اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اتری ۔ "چپ ۔" شاداں زیرِ لب بولی "وہ سو رہے ہوں گے آج تو چچا احسان علی سے وہ مذاق کر کے رہوں گی کہ یاد کرینگے ۔" چاچی ہنس پڑی بولی ۔ "تجھے بھی تو ہر وقت شرارتیں سوجھتی ہیں ۔" "اور وہ کیا لحاظ کرتے ہیں میرا ۔" شاداں نے کہا ۔

"ہائیں" انہیں سجدے میں پڑتے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا "میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کی جا رہی ہے ۔"

"نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے ۔"

"بچ ۔" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی ۔

"اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو ۔"

احسان علی چونک کر اٹھ بیٹھے ۔ ان کے گال آنسوؤں سے تر تھے ۔

"ہائے میرے اللہ" شاداں نے پھر اپنے آپکو سنبھالا ۔

احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑگیا ۔ چہرے پر جھریاں لٹک آئیں جیسے یکلخت بوڑھے ہوگئے ہوں ۔

"احسان علی" ۔۔۔۔۔۔ شاداں چلائی۔

احسان علی سجدے میں گر گئے ۔

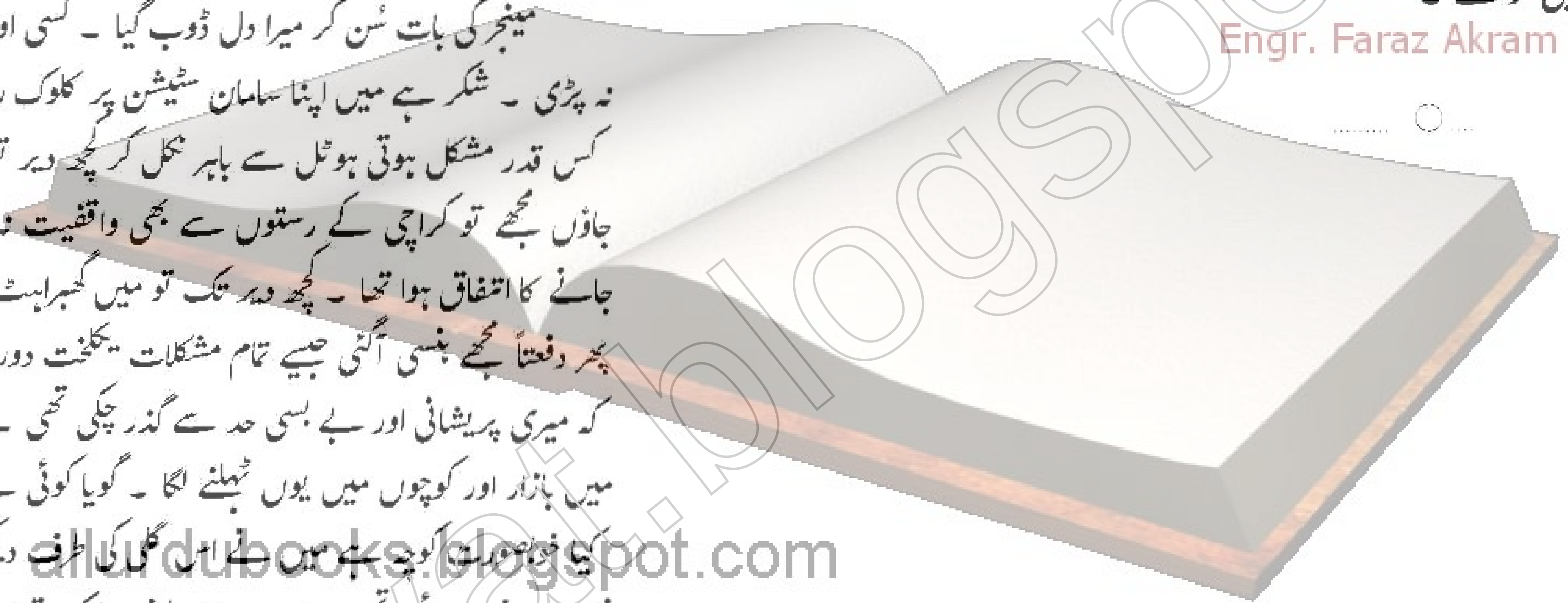

شائستہ

"کمرہ نہ سہی کوئی کونہ ہی ہو جس میں ایک چارپائی بچھائی جا سکے"۔ میں نے امید بھری نظر سے ہوٹل والے کی طرف دیکھا ۔ "جی نہیں" ۔ وہ لاپرواہی سے بولا ۔ "ذرہ بھر جگہ نہیں ہمارے یاں شاید کل تک ہو جائے' ۔ یہ چھٹا ہوٹل تھا مینجر کی بات سُن کر میرا دل ڈوب گیا ۔ کسی اور ہوٹل تک جانے کی ہمت نہ پڑی ۔ شکر ہے میں اپنا سامان سٹیشن پر کلوک روم میں رکھوا آیا تھا ۔ ورنہ کس قدر مشکل ہوتی ہوٹل سے باہر نکل کر کچھ دیر تو میں حیران کھڑا رہا ۔ کدھر جاؤں مجھے تو کراچی کے رستوں سے بھی واقفیت نہ تھی ۔ پہلی مرتبہ تو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا ۔ کچھ دیر تک تو میں گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا ۔ پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی جیسے تمام مشکلات یکلخت دور ہوگئی ہوں۔ شاید اس لیے کہ میری پریشانی اور بے بسی حد سے گذر چکی تھی ۔ تو صاحب نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ میں بازار اور کوچوں میں یوں ٹہلنے لگا ۔ گویا کوئی بے فکرا سیر کو نکلا ہو ۔ اف کیا خوبصورت کوچہ ہے میں نے اس گلی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ایک جانب فلیٹ بنے ہوئے تھے ۔ اور دوسری طرف پارک تھا ۔ جس میں بچے کھیل رہے تھے "کبیر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !"

دفعتاً میرے کان میں آواز پڑی میں نے مڑ کر دیکھا گلی خالی پڑی تھی ۔ یہاں میرا واقف کون ہوگا ۔ میں نے سوچا ۔ آخر اس نام کے اور لوگ بھی ہوں گے "کبیر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !" پھر آواز آئی ۔ میں نے اوپر دیکھا ۔ فلیٹ کے چھجے پر وہ کھڑی مسکرا رہی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا ۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی ۔ "یہ رہا زینہ" وہ بولی ۔ اس طرف دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف پہلا دروازہ میں نوکر بھیجتی ہوں" ۔

شائستہ میرے چچا زاد بھائی سکندر کی بیوی تھی میں جانتا تھا کہ وہ کراچی رہتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ سکندر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے ۔ لیکن کراچی کو روانہ ہوتے وقت اماں نے مجھے تاکید کی تھی کہ سکندر سے نہ ملوں ۔ اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے ۔ اور وہ میرے وہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں ۔ تو کسی بہانے ٹال دوں ۔ مجھے سکندر کے ہاں ٹھہرنے کی قطعی ممانعت تھی ۔ جبھی تو آتے ہوئے میں نے یہ جاننے کی بھی کوشش نہ کی تھی ۔ کہ وہ کس محلے میں رہتے ہیں ۔

محلے میں ایک نہیں تین لڑکے ایسے تھے جنہیں کراچی میں سکندر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا تھا ۔ اسلم تو وہاں صرف چند ایک دن ٹھہرا ہوگا ۔ پھر کسی بات پر وہ سکندر سے ناراض ہوکر چلا آیا یہ خبر جب محلے میں پہنچی ، تو بڑی باتیں ہوئیں ۔ عزیز کو سکندر نے وہاں ملازمت دلوائی تھی ۔ اس نے صرف ایک مہینہ ملازمت کی ہوگی ۔ پھر انہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگ آیا ۔ محلے میں آکر ماں سے کہنے لگا ۔ "میں ان کے یہاں نہ رہوں گا" ۔ "کیوں ان کے یہاں رہنے میں کیا تکلیف تھی" ۔ اس کی ماں نے پوچھا ۔ "نہیں اماں تکلیف تو نہیں تھی لیکن میرا ان کے پاس رہنا ناممکن ہے" ۔ چاہے ان کے پاس نہ رہتا ۔ " اماں نے کہا ۔ "پر نوکری چھوڑ کر تو نہ آتا" ۔ "تو رہتا کہاں ؟" اس نے چڑ کر جواب دیا ۔ ہر کوئی وہاں سے واپس آکر کانوں پر ہاتھ رکھتا اور کہتا ان کے گھر رہنا تو قیامت ہے ۔ قیامت ۔ صبح و شام لڑائی لگی رہتی ہے ۔ مہمان کی شامت آجاتی ہے ۔ اسلم عزیز اور سید تینوں کا خیال تھا ۔ کہ سکندر کی طبیعت شکی ہے ۔ بات بات پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ۔ عورتیں سمجھتی تھیں ۔ سارا فساد شائستہ کا ہے کس قدر بن ٹھن کر رہتی ہے ۔ ہر وقت اللہ مارا پاؤڈر کریم اور کاجل مسکرا مسکرا کر بات کرتی ہے ۔ نوجوان لڑکوں کا کیا ہے انہیں تو اللہ دے یہ بات ۔ ایسی عورت کے فریب میں پھنستے ہوئے دیر لگتی ہے کیا ۔ پھر خاوند نے تو جلنا ہی ہوا ۔ کیسے نہ ہو شکی مزاج نوجوان جہاں سکندر کے مزاج میں نقص نکالتے وہاں شائستہ کی محبت ، اخلاق

اور مہمان نوازی کی تعریفیں بھی کیا کرتے ۔ یہ سن کر عورتیں زیرِ لب مسکراتیں اور آپس میں اشارے کرتیں ۔ پھر جب وہ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو کوئی نہ کوئی کہتی ۔

"بس باہر کی کوئی آ جائے سبھی اس کے سبھاؤ کی دھوم مچا دیتے ہیں" ۔

"نہ جانے باہر والیاں کیا جادو کرتی ہیں" ۔

"آنکھیں مٹکانا جو جانتی ہیں وہ" ۔

"ہمیں تو نہ آیا آنکھیں مٹکانا ۔ کوئی آہ بھر کر کہتی" ۔

"اللہ نہ کرے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اس کے بغیر ہی اچھی ہیں" ۔ ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتی ۔ محلے کے بڑے بوڑھے شائستہ یا سکندر کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیتے اور کہتے اصل میں بات یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نے مل کر شک کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے ۔ تاکہ مہمانوں سے جان بچی رہے بھئی خوب طریقہ ہے ۔

نہ جانے کس کی بات سچی تھی ۔ آیا لڑکوں کا خیال درست تھا ۔ عورتوں کا یا بڑے بوڑھوں کا ۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی ۔ کہ اب کوئی محلے دار سکندر کے پاس ٹھہرنے کو تیار نہ تھا ۔ اگر کسی کو کراچی جانا ہوتا تو سبھی یک زبان ہو کر اسے نصیحتیں کرتے ۔ "مانا کہ وہ اپنے ہیں پر ان کے گھر نہ ٹھہرنا بھئی میں تو تمہیں یہ مشورہ نہ دوں گی" ۔

"آخر ہوٹل بھی تو ہیں وہاں"

"کیا نہیں وہاں ۔ ہوٹل ہیں سرائے ہیں ۔ سنا ہے بڑا بھاری شہر ہے" ۔

"تو تو آپ سیانا ہے کبیر ۔ بھلا ہو ہنستے کھیلتے رہتے بستے میاں بیوی کی خوشی کو حرام کر دینا ۔ کیا یہ اچھی بات ہے" ۔ آپ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے ۔ کہ اُن کی نصیحتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کی وجہ سے سفر کے دوران بار بار میرے دل میں سکندر سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی اگر وہ مجھ سے مل گیا تو ؟ ۔۔۔۔۔ اس پر میں گھبرا کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش

کرتا ۔ لیکن خواہ مخواہ مجھے شائستہ کا خیال آ جاتا ۔ بدن میں سنسنی دوڑ جاتی اور میرے لئے کسی اور بات کے متعلق سوچنا بھی ناممکن ہو جاتا خوبصورت تو وہ تھی ۔ لیکن اس کا حسن اکسانے کی بجائے مبہدت کر دینے والا تھا ۔ اس کے انداز میں خوشی کی جگہ وقار جھلکتا تھا ۔ وقار خلوص اور سنجیدگی ۔ یہ تینوں وصف میرے لئے چنداں دلفریب نہ تھے پھر نہ جانے کیوں محلہ والیوں کی باتیں سُن سُن کر دل میں ایک انجانا عزم پیدا ہو چکا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ مجھے ان کے یہاں رہنے کا موقعہ ملے ۔ اتفاقاً یہ دبی دبی خواہش کسی وقت مجھ پر حاوی ہو جاتی ۔۔۔۔۔۔ پھر میں پوری کوشش سے اسے اور بھی دبا دیتا ۔

شاید اسی لیے ہوٹلوں میں جگہ نہ پاکر میرے دل میں اطمینان پیدا ہوگیا تھا۔ شائستہ کے یہاں رہنے کا جواز تو مل چکا تھا ۔ اب صرف ان سے اچانک ملاقات ہو جانے کی کسر باقی تھی ۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی برسبیل تذکرہ سن پایا تھا ۔ کہ وہ ایک انگریزی وضع کے فلیٹ میں رہتے ہیں ۔ جس کے مقابل میں بچوں کے کھیلنے کا پارک بنا ہوا ہے ۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک صاف ستھرا شہر ہے اور آخری ہوٹل والے کا انکار سن کر پھرتے پھراتے دفعتاً وہ کوچہ میری نظر پڑا ۔ جس کے مقابل پارک بنا تھا ۔ اس کی بناوٹ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں بازار کو چھوڑ کر کوچے میں گھومنے لگا ۔ اس کی آواز میرے کان میں پڑی تو حیرت سے میں بھونچکا رہ گیا دل ڈر یا شوق کی شدت سے تڑپ کر جیسے گلے میں آ اٹکا اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی لبا لب ہو کر چھلکنے لگا ہو ۔

شائستہ مجھے بڑے تپاک سے ملی ۔ بار بار میری طرف دیکھ کر مسکراتی ۔ ماما کو میری تواضع کے متعلق ہدایات دیتی ۔ پھر مجھ سے باتیں کرنے لگتی ۔ "کس قدر خوشی ہے مجھے کہ تم آئے ہو ۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری ۔ اُف اتنی دیر ہوچکی ہے ۔ کوئی ہمارے یہاں نہیں آیا ۔ کوئی نہیں آتا ہمارے پاس ۔ جیسے محلّے والوں نے ہمارے یہاں نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہو ۔ سنا ہے رضا اور محبوب کراچی آئے تھے ۔ ہمیں صورت تک نہیں دکھائی ۔ نہ جانے کیا قصور ہوگیا ہم سے کہ محلے والوں نے ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے ۔ رفیع کو کئی بار کہا ۔

ان سے لکھوایا ۔ لیکن وہ بھی نہ آیا ۔ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے سیر کو آجاتا تو کیا حرج تھا ۔ نہ جانے بات کیا ہے کوئی بھی نہیں آتا ۔ کوئی بھی نہیں" ۔ وہ آہ بھر کر چپ ہوگئی ۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دی ۔ "شکر ہے تم آئے ہو بڑی مہربانی ہے تمہاری" ۔ اس کی آنکھیں پُر نم تھیں ایسا معلوم ہو تھا جیسے ابھی آنسوؤں کا تار بندھ جائے گا ۔ لیکن مجھے دیکھ کر ان پر نم آنکھوں میں مسکراہٹ چمکتی اور نمی جذب ہو جاتی ۔ شکر ہے تم آگئے تمہارے بھائی تو ہر وقت مطالعے میں کھوئے رہتے ہیں ۔ آدھی آدھی رات تک لائبریری میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ مجھے تنہائی نے مار دیا ۔ کبیر" اس نے مسکرانے کی کوشش کی کتنا ویران ہے ۔ یہ شہر کوئی ملنے ملانے والا نہیں ۔ اگر اپنے ہی نہ آئیں تو بیگانوں کو کوئی کیا کہے اور ان کا آنا بھی کس کام کا ۔ آئے بھی تو دو گھڑی باہر بیٹھ کر چلے گئے گھر میں اپنوں کے سوا کون آسکتا ہے ۔ خیر اب تو تم آہی آگئے ہو" ۔ وہ مسکرائی میری طرف دیکھ کر اس کی اداسی اور مایوسی کافور ہوجاتی مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی ڈوبتی ناؤ کو پتوار مل گئے ہوں اور وہ بہہ نکلی ہو ۔

شائستہ کی باتیں سن کر وہ امیدیں اور بھی استوار ہو گئیں جو محلے والیوں کی باتیں، سُن سُن کر خواہ مخواہ میرے دل میں پیدا ہوچکی تھیں ۔ لیکن اس کی آنکھوں کی اداسی ہونٹوں کی سنجیدگی اور وقار بھرا انداز مجھے پریشان کئے ہوئے تھا مجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ سب عجب ایسی باتیں کیوں کئے جارہی تھی ۔ کیا اپنی ملازمہ شمو کا بھی ڈر نہیں ؟ ۔ اگر سکندر آجائے تو ؟ باہر کا دروازہ بھی تو کھلا تھا لیکن وہ ان باتوں سے قطعی بے نیاز تھی ۔ اس بے نیازی کی وجہ سے مجھ پر خواہ مخواہ رعب چھائے جارہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کروں ۔ مذاق کروں ۔ چھیڑوں ۔ کوشش تو کرتا تھا ۔ لیکن بات گویا میری زبان پر آکر خشک ہو جاتی ۔ بدن میں چیونٹیاں رینگتیں اور میں چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہ جاتا ۔ اس وقت میری صرف ایک آرزو تھی کہ اسکی توجہ مجھ پر مرکوز ہو جائے ۔ اس کے قریب تر ہو جاؤں اس سے متعلق بے نام اُمیدیں میرے دل میں بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا رہی تھیں ۔ اور میں اس کے اشارے کا منتظر تھا ۔ صرف ایک اشارہ ۔ نوکرانی کے آنے پر دفعتاً چپ ہو جانا

یا دروازے کی طرف دیکھ کر کہنا اوہ ۔ دروازہ تو کھلا پڑا ہے ۔ شمو اسے بند کردے ۔ یا میرے کچھ کہنے پر مجھے پیار سے گھور کر ہونٹوں سے چپ کا اشارہ کر دینا ۔ کراچی آتے ہوئے گاڑی میں کئی مرتبہ میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا ۔ اس وقت میں یوں چپ چاپ نہ تھا ۔ میں نے کئی ایک دلچسپ باتیں کی تھیں ۔ اور باتوں ہی باتوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا تھا ۔ "شائستہ ۔" اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا مجھے جیسے کسی ہوائی کو آگ دکھا دی گئی ہو ۔ لیکن اب میرا ہاتھ آگے بڑھنے کی بجائے کوٹ کی جیب میں گھسا ہوا تھا ۔ اور میری زبان کچھ کہنے کی بجائے منہ میں ٹنگی ہوئی تھی

اوہ کبیر آیا ہے سکندر اندر داخل ہو کر چلائے وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک مجھ محلے والوں کے متعلق پوچھتے رہے اس دوران میں ، شائستہ گھر میں چاروں طرف گھومتی پھری ۔ شمو تم نے کبیر کے کمرے میں بلب نہیں لگایا" " شمو میں نے کہا ۔ یہاں ایک سائیڈ ریک رکھدونا ---------- شاید کبیر سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کا عادی ہو ۔ ان انتظامات کے دوران میں وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آتی اور کوئی نہ کوئی بات پوچھتی ۔ سکندر کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر مسکراتی اس کا سکندر کی موجودگی میں مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا میرے لیے بے حد پریشان کن تھا ۔ میں خواہ مخواہ جھینپ رہا تھا ۔ گھبرا رہا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ شائستہ کو اپنی طرف متوجہ کرکے ایسا اشارہ کروں کہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے کہ سکندر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں ۔ لیکن مجھ میں ہمت نہ پڑی ۔ اور وہ بار بار کہے جا رہی تھی ۔ شکر ہے تم آئے ہو کبیر ۔ بڑی مہربانی ہے تمہاری ۔ میں محسوس کر رہا تھا ۔ کہ کوئی پرائیویٹ بات عام کی جا رہی تھی ۔ سکندر کے سامنے اس کے وہ دلنواز اور رنگین فقرے اپنا مفہوم اور رنگینی کھوئے جا رہے تھے ۔ اس بات سے تنگ آکر میں نے تھکاوٹ کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا ۔

اگلے دن سکندر دفتر سے آئے تو ہم دونوں بالکونی میں کرسیاں جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے ۔ شائستہ بیٹھی کچھ بُن رہی تھی ۔ بُنتے ہوئے وہ مجھ سے مسلسل

باتیں کئے جاتی تھی ۔ جن کے دوران میں اکثر کنکھیوں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ۔ اس وقت میں سُر کئے ہوئے ساز کیطرح محض ایک ہلکی سی چھیڑ کا منتظر تھا ۔ شائستہ کی پتلی پتلی رنگین انگلیاں ایک اضطراب سے چل رہی تھیں ۔ میں انہیں متوقع نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ ابھی وہ روغنی انگلیاں بڑھتے بڑھتے مجھ تک پہنچ جائیں گی ۔ اور فضا میں دلنواز نغمے گونجنے لگیں گے ۔ وہ نغمے جو مجھ میں تڑپ رہے تھے ۔ جنہیں سننے کی مجھے توقع تھی ۔ امید تھی ۔ لیکن وہ انگلیاں اپنی ہی جگہ پیچ و تاب کھائے جا رہی تھیں ۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں ۔ میرا ہاتھ اٹھتا ۔ کہ ان مضطرب اور بھٹکی ہوئی انگلیوں کو اس بھنور سے چھڑا لے ۔ لیکن نہ جانے کیوں رک جاتا ۔ پھر خفت کے مارے جیب کے کونے کریدنے لگتا ۔

سکندر نے ہمیں یوں بیٹھے دیکھا تو ٹھٹھکے ۔ کچھ دیر کیلئے تو چپ رہے ۔ پھر کچھ کہنے کی خاطر بولے تم سیر کو نہیں گئے کبیر ۔ بس ابھی جانے کو تھا ۔ میں نے گھبرا کر کہا ۔ "میں نے ہی روک رکھا تھا اسے ۔" شائستہ بولی "میں نے کہا وہ آئیں گے تو تمہیں ساتھ لے جائیں گے ۔ اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا ۔ "کبیر کوئی بچہ ہے کیا"۔ ان کی ہنسی طنز آلود تھی ۔ "جو کھو جائے گا" ۔ اس بات پر شائستہ گھبرانے کی بجائے اور بھی چہکنے لگی ۔ سکندر کمرے میں چلے گئے ۔ اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے ۔ شائستہ پہلے تو مجھ سے یوں چہک چہک کر باتیں کرتی رہی ۔ جیسے سکندر کو سُنا رہی ہو ۔ تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں کس قدر رونق ہو گئی ہے کبیر ۔ گھر بھرا بھرا نظر آتا ہے ۔ آج کا دن تو آنکھ جھپکتے ہی بیت گیا ۔ پھر وہ دوڑی دوڑی سکندر کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی ۔ اور مسکرا مسکرا کر ان سے کچھ پوچھتی اور پھر وہیں سے کبیر کبیر چلاتی ہوئی میرے پاس آجاتی "یہ سُنا تم نے آج یہ باہر جانے سے بھی منکر ہیں ۔ تم بھی نہ جاؤ باہر ۔ جب یہ جائیں گے تبھی جانا ۔ کیوں ۔ پھر بھاگی بھاگی سکندر کی طرف جاتی ۔ سنا آپ نے کبیر کیا کہتا ہے ۔ کہتا ہے میں موٹی ہو گئی ہوں ۔ کیا واقعی موٹی ہو گئی ہوں ۔ میری طرف دیکھئے نا وہ ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے بچے کی طرح چلاتی ۔ دیکھئیے بھی نا ۔ پھر چلا کر کہتی

ان کی بات سنی تم نے کبیر کہتے ہیں کسی کے منہ سے تعریف کی بات سن کر تمہاری باچھیں کھلنے لگتی ہیں ۔ پھر ان سے مخاطب ہوکر مسکراتی ۔ آپ بھی کیجئے نا میری تعریف اور متوقع اور مسحور کن نگاہوں سے انہیں دیکھتی ۔ اس سمے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا ۔ جیسے دو زمینوں کے درمیان ایک منوّر چاند ڈول رہا ہو۔ شائستہ کا یہ رویہ دیکھ کر میرا دل بجھا جا رہا تھا ۔ امیدیں خاک میں ملی جا رہی تھیں ۔ اُف میں اُٹھ بیٹھا ۔ میں ذرا باہر ہو آؤں“ ۔ مجھے جانے پر تیار دیکھ کر وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آئی ۔

”باہر ہو آؤں ---- وہ زیر لب گھورنے لگی ۔ ذرا ٹھہرنا پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے چھپا کے بات کی تھی ۔ میرا دل از سر نو دھڑکنے لگا ۔ اور آنکھ امید کی روشنی سے چمکنے لگی ۔ ”میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں“ ۔ میں نے رازدارانہ انداز سے کہا ۔ اور سکندر کی طرف اشارہ کیا ۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھ کر منہ بنایا اور لا پرواہی سے زیر لب بولی ۔ ”ان کی تو عادت ہی ایسی ہے ۔ بُرا مان گئے کیا“ ۔

بازار میں گھومتے ہوئے بار بار مجھے وہ باتیں یاد آتیں جو شائستہ نے زیرِ لب مجھ سے کی تھیں ۔ نہ جانے ان باتوں میں کیا تھا۔ کس قدر مفہوم سے لبریز تھیں وہ زیر لب باتیں ۔ اسکی باتیں ہر لحظہ اور بھی زیر لب ہوتی گئیں ۔ سرگوشیاں بن گئیں پھر ان پر وعدوں کے رنگین پھول پھوٹ نکلے ۔ ان کی مہک سے مسحور ہو کر میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹ آیا ۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدید احساس ہوا کہ آج کچھ ہونے والا ہے ۔ رنگین انگلیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں ۔ آنکھیں میری طرف دیکھ کر ڈولتیں ۔ ہونٹ بولے بغیر کچھ کہتے ۔

اندر وہ دونوں بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر بولی“ ۔

”لو سنو کبیر مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ بسکٹی سویٹر مجھے بہت اچھا لگتا ہے ۔ کیوں کبیر کیا یہ رنگ مجھے سجتا ہے دیکھو بھی نا ----“ پھر وہ ان سے باتیں کرنے میں مشغول ہوگئی ۔ اور وہ دیر تک ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے رہے کبھی کبھار وہ مجھے وہیں سے آواز دیتی ۔ لیکن میرا جواب سُنے بغیر پھر سے اُن سے باتوں میں لگ جاتی ۔ ادھر میں اپنی خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی توقع میں بیٹھا تھا منتظر تھا کہ وہ آئے اور دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ کہے ۔ ”ان کی عادت ہی ایسی ہے“ یا کچھ اور لیکن وہ نہ آئی ۔ حتٰی کہ میں ہار کر لیٹ گیا ۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہوگیا ۔ سکندر کی غیر حاضری میں وہ کرسی سے کرسی جوڑ کر بیٹھ رہتی ۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی ہنستی ۔ میں بار بار اُٹھ بیٹھتا ۔ میں سیر کر آؤں ۔ وہ پیار سے مجھے گھورتی ”بیٹھو نا شام کو چلے جانا ۔ بس کوئی نہیں جانا وانا ---- چائے پی لو ۔ جب وہ آجائیں گے تو چلے جانا ۔ بیٹھو بھی نا کبیر ۔ میرے پاس بیٹھنے سے ڈرتے ہو کیا ؟“---- ہر بار میں مجبور ہو کر بیٹھ جاتا ۔ اسی طرح شام ہو جاتی اور سکندر آجاتے وہ ہمیں یوں بیٹھے دیکھ کر باری باری دیوار دروازے اور ماما کو گھورتے اور پھر اپنے کمرے میں جا داخل ہوتے ۔ ان کی خشمگینی دیکھ کر شائستہ مسکراتی ۔ پھر ان کے پاس جا بیٹھتی ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کرتی ۔ اس کی باتیں سن کر ان کا غصہ اور بھی چمکتا حتٰی کہ وہ اعلانیہ ہماری بے تکلفی پر آوازے کسنے شروع کر دیتے ۔ ان کی باتیں سن کر شائستہ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی ---- پھر کسی نہ کسی بہانے وہ چپکے سے میرے کمرے میں آ کر کہتی ”تم چپ کیوں ہوگئے کبیر ۔ ناراض تو نہیں ہو گئے ۔ خُدا کے لئے برا نہ مان لینا ۔ اُن کی تو عادت ہی ایسی ہے بات کئے بغیر نہیں رہ سکتے“ ۔ اس کی باتیں اس قدر رازدارانہ ہوتیں ۔ کہ میری امیدوں کے خشک دیئے میں تیل پڑ جاتا ۔ سکندر بُرا مانتا ہے تو پڑا مانے میں لا پروا ہو جاتا ۔ اگرچہ اس کی باتوں کے جواب میں میں صرف یہ کہا کرتا ۔ ”اچھا ۔ تمہاری مرضی“ ۔ اور پھر سیر کو نکل جاتا ۔

جب میں سیر سے لوٹتا تو دیکھتا کہ سکندر غصّے کی بجائے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے ۔ اور شائستہ اسے بھرما رہی ہے ۔ صبح سویرے وہ اٹھتے ہی پیار محبت کی باتیں شروع کردیتے ۔ پھر سکندر دفتر چلا جاتا ۔ اس کے چلے جانے کے بعد دفعتاً شائستہ کو احساس ہوتا کہ میں ابھی وہیں ہوں اور وہ بھاگی بھاگی میرے پاس آتی اور ایسی گرمجوشی سے ملتی گویا اپنی گزشتہ لاپرواہی کی تلافی کر رہی ہو۔ اپنی کرسی میرے پاس کھینچ لیتی ۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی ۔

وہی ترچھی نگاہیں ، وہی مسکراہٹ ، وہی بے تکلفی اُف وہ مسکراہٹ ہر بار میں محسوس کرتا کہ منزل آپ میری جانب بڑھے آرہی ہے ۔ شام کو جب میں سیر کو نکلتا تو دن بھر کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ۔ خواہ مخواہ مجھے احساس ہونے لگتا ۔ کہ منزل پر پہنچنے کے لیے صرف ایک قدم رہ گیا ہے ۔ ایک قدم اور ۔ لیکن واپسی پر میں محسوس کرتا کہ ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے ۔ اس احساس کی وجہ سے ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ۔ میں نے کہا ۔ آج میں واپس جا رہا ہوں ۔ ”جارہے ہو“ اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا ۔ نہیں نہیں وہ چلاّئی یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ابھی تو تمہیں یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں ۔ ”آج پانچواں دن ہے“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا ۔ ”تو پھر کیا“ ہوا وہ بولی“ ۔ نہیں آج مجھے جانا ہی ہوگا میں نے جواب دیا ۔ ”کبیر اس نے سویٹر کو پرے پھینک دیا ۔ نہیں نہیں تم مذاق کر رہے ہو ۔ تم ابھی نہیں جاؤ گے ؟ میں نے فیصلہ کر لیا ہے“ ۔ میں نے لاپرواہی سے کہا ”فیصلہ کر لیا ہے ؟ وہ چلاّئی ۔ کبیر اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئیے ۔ جونہی وہ گرم اور روغنی انگلیاں مجھ سے مس ہوئیں ڈز !! ـ ـ ـ ـ ـ کسی بوتل کا کاک اڑگیا ۔ سرخ شراب کے چھینٹے چاروں طرف اڑنے لگے ۔

عین اس وقت سکندر داخل ہوئے ۔ ہمیں دیکھ کر آنکھیں انگارہ ہوگئیں ۔ شائستہ نے انہیں دیکھا لیکن وہ جوں کی توں کھڑی رہی ۔ وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ چھڑالئے تھے ۔ ورنہ شاید وہ میرے ہاتھوں کو پکڑے رہتی ۔ شائستہ کی آنکھوں سے گھبراہٹ کی جگہ فتحمندی کی جھلک لہرا رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے شکاری پرندے کو اپنے آپ دام میں پھنسے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو ۔

”جانا وانا کوئی نہیں“ ۔ وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر آہستہ سے بولی ۔ اور پھر سکندر کے کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ ”اسے گود میں لے کر بیٹھ رہتی ہو شرم نہیں آتی تمہیں“ ۔ سکندر غرایا ۔ ”کیا کہے گا گھر جاکر ـ ـ ـ ـ یہاں سیر کے لئے آیا ہے ۔ یا تمہارے دام میں پھنسنے کے لئے“ ۔ میں نے سُنا تو میرے

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ سچ کہتی تھیں محلے والیاں ۔ میں نے کس قدر بھول کی جو یہاں آ ٹھہرا ۔ معاً میں نے اپنے کپڑے اکٹھے کئے ۔ اور ٹائم ٹیبل لے کر بیٹھ گیا ۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ صبح گیارہ بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہ جاتی تھی ۔ لاچار میں چارپائی پہ پڑگیا ۔ اندر نہ جانے وہ ایک دوسرے سے کیا کیا کہہ رہے تھے ۔ ان کی باتیں سننے میں اب مجھے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی ۔

اگلے دن صبح سویرے وہ میرے پاس آئی سرہانے کھڑی ہوکر ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کرلیں ۔ ”بوجھو کون ہے“ ۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو چھڑا لیا ۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی ۔ ”افوہ یہاں تو غصّے سے بھوت بنے بیٹھے ہیں“ ۔ پھر منت سے کہنے لگی خدا کے لئے آج نہ جانا صرف آج اور کل کا دن اور رک جاؤ ۔ پرسوں میں تمہیں نہ روکوں گی ۔ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے ۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ ان رنگین انگلیوں کے چنگل سے نکل جاؤں لیکن میری کوشش ناکام رہ گئی ۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں طرف وہ روغنی انگلیاں گھیرا کئے ہوئے تھیں ۔ میری طرف بڑھ رہی تھیں ۔ حتیٰ کہ میں ان کی گرفت میں آگیا ـ ـ ـ ـ پٹاخ !! کسی بوتل کا منہ پھٹ گیا ۔ کھولتا ہوا سرخ پانی چھلکا ۔ آنکھوں تلے سبھی کچھ سرخ دکھائی دینے لگا ۔ میرا سر جھکا ہونٹ ان انگلیوں پہ جیسے اسیر ہو گئے ـ ـ ـ ـ شائستہ !! مجھے زبان مل گئی ۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ کھینچ لیئے ۔ سرخ ابلتی ہوئی لہریں ریت بن کر رہ گئیں میں ٹھٹھک کر بیٹھ گیا ۔ اس نے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر اور بھی قریب آ بیٹھی ۔ ہنسنے لگی ۔ بڑی بہن سے مذاق کرتے ہو ہنستے ہنستے اس کے گال پر آنسو ڈھلک آئے ۔ بڑے مسخرے ہو تم کبیر !!

پہلے تو میں شرم سے پانی پانی ہوا بیٹھا رہا ۔ لیکن جب وہ میرے پاس آبیٹھی اور معصومیت اور محبت سے بولی ۔ صرف ایک دن اور رک جاؤ ۔ تمہیں تکلیف تو ہوگی ۔ لیکن میری خاطر اسے سہہ لینا ۔ کل بے شک چلے جانا ۔ اس کی معصومیت خلوص اور بے بسی کو دیکھ کر میری شرمندگی یک قلم کافور ہوگئی ۔ میں اس کی طرف دیکھ کر محسوس کرنے لگا ۔ جیسے اس روز میں نے اسے پہلی

مرتبہ دیکھا ہو۔ نہیں میں نہیں جاؤگا میں نے ہنس کر کہا اور پھر پیار سے اس کا سر تھپکنے لگا۔

دوپہر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا۔ گویا ہمارے درمیان کا آخری پردہ اٹھ چکا ہے۔ میں اس سے ایک پراسرار قرب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں منزل تک پہنچ چکا تھا۔ میرا دل دھڑک نہیں رہا تھا۔ زبان بند نہ تھی ہاتھ جیب کے کونے تلاش نہیں کر رہا تھا۔ اس کی رنگین انگلیاں رنگین تو تھیں مگر مکڑی کی ٹانگوں کی طرح چاروں طرف سے میری طرف بڑھنے کی بجائے اپنے ہی اردگرد رینگ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں کسی بے نام قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس روز میری گپیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مجھے نئی نئی باتیں سوجھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ شائستہ سکندر کی طبیعت کو کیا ہے؟ “ہے نا” وہ مسکرائی بڑی شکی طبیعت ہے۔ جانے کیوں”۔ تمہارا دل تو نہیں کڑھتا” میں نے پوچھا۔ اس نے آہ بھری۔ “ان دنوں بھی ایسے ہی تھے۔ ابھی تک اپنی عادت کا احساس نہیں انہیں۔ “کن دنوں”۔ میں نے ویسے ہی بات کو لمبا کرنے کے لئے پوچھا۔

“چپ ہماری شادی ہوئی تھی۔ ان دنوں کی یاد آتی ہے تو میں بے ساختہ ہنس دیتی ہوں” ۔۔وہ ہنس کر بولی تم سے کیا چھپانا ہے۔ میری اپنی خواہش تھی کہ میری ان سے شادی ہو جائے۔ “سچ؟” میں نے حیرانی سے پوچھا۔ “ہاں” وہ جھینپ کر بولی۔ ان دنوں سکندر صاحب اور میرے پھوپھی زاد بھائی کرامت دونوں ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رہنے کو مکان نہ ملتا تھا۔ اس لئے مجبور تھے۔ میرے بھائی کی سکندر صاحب سے بڑی دوستی تھی۔ اس لیے ہم سب ان کو اپنا ہی سمجھتے تھے۔ ان سے پردہ بھی اٹھا رکھا تھا۔

“تمہیں سکندر سے محبت تھی؟ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ شرما کر چپ ہوگئی۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولی۔ تم جانتے ہو مجھے ادب سے عشق تھا عشق اور یہ پورے ادیب تھے۔ مجھے پڑھایا کرتے تھے ان دنوں بس جی ہم تو ان سے پڑھنے ہی میں لٹ گئے اف کس قدر قابل ہیں۔ یہ

میں تمہیں کیا بتاؤں مجھ پر تو پہلے دن ہی ان کا رعب پڑگیا۔ چوری چوری انہیں دیکھا کرتی تھی۔ یہ پڑھانے میں مشغول ہوتے اور میں ان کے منہ کی طرف دیکھا کرتی۔ ان کی عادت تھی۔ کہ پڑھاتے ہوئے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے پھر میں نے بامعنی انداز سے پوچھا۔ “پھر کیا ہوا؟”

وہ مسکرائی۔ “ان کی بلا سے یہ تو ہر وقت اپنی کتابوں اور مطالعہ میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کی مصروفیات لامتناہی تھیں۔ اس بات پر میرا دل جلتا تھا۔ جی چاہتا تھا کسی طریق سے ان کی کتاب چھین لوں لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ خیر جتن تو میں نے بھی بہت کئے” وہ مسکرائی “لیکن کوئی بات نہ بنی اور یہ اپنے شغل میں منہمک رہے ۔۔۔ پھر اتفاق سے ایک ذریعہ نکل آیا”۔

“وہ کیا” میں نے شوق سے پوچھا۔

“میری عادت تھی کہ کرامت بھائی سے روز کھیلتی، گپیں مارتی اور لڑتی جھگڑتی رہتی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا نا۔ چھ ایک ماہ چھوٹا ہوگا۔ ہم دونوں بہت بے تکلف تھے۔ ایک روز ہم دونوں حسب معمول بیٹھے ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کہ سکندر صاحب آگئے۔ ہمیں اکٹھے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن سنبھل کر جلد ہی واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شام کو جب میں سبق پڑھنے کے لیے ان کے پاس گئی تو دیکھتی ہوں کہ منہ سوج کر کپا بنا ہوا ہے۔ خیر انہوں نے پڑھانا شروع کردیا۔ لیکن ایسی بے دلی سے پڑھا رہے تھے۔ میں تاڑ گئی۔ ایک روز پڑھاتے ہوئے انہوں نے مجھے بے توجہ پایا۔ تو تنک کر بولے “بس جی میں نہیں پڑھا سکتا تمہیں۔ اب اسی سے پڑھا کرو۔ اپنے کرامت سے جس سے سارا سارا دن خوش گپیاں ہانکتی ہو” میں نے ان کی طرف دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اس روز۔ پانی گرم تھا۔ صرف ایک جوش دینے کی ضرورت تھی۔ صرف ایک، کس قدر چوکھا رنگ آئے گا چائے کا۔ میں نے سوچا۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے اور بھی بے تکلفی شروع کردی۔ یہاں تک کہ اماں مجھے گھورنے لگیں۔ بھائی جان بھی گرم

ہوگئے ۔ اماں بولیں "بیٹی چاہے وہ اپنا ہے ۔ لیکن کرامت سے یوں دھینگا مشتی کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا"۔ میں نے اماں کے طعنے سنے ۔ بھائی کی نصیحتیں سنیں اور انہیں پی گئی ۔ پھر میں نے بڑی کوشش سے وہ کمرہ لے لیا ۔ جس کی ایک دیوار سکندر صاحب کے کمرے سے ملحق تھی ۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا ۔ ہماری آوازیں دیوار کے پار پہنچتی تھیں ۔ یہ تو بس آگ بگولہ ہوگئے کئی دن مجھے پڑھانے نہ آئے ۔ مجھ سے بول چال بند کردی ۔

ایک دن میں ان کے کمرے میں جا نکلی اور چھیڑنے کے لئے بولی ۔ "بھائی جان آپ چپ چاپ کیوں رہتے ہیں"۔ میں انہیں بھائی جان کہا کرتی تھی ۔ تمہیں اس سے کیا غرض ؟" یہ تلملائے ۔ "چاہے میں کیسا بھی ہوں ۔۔۔۔ "آپ سے پڑھتی جو ہوں"۔ نہیں ، میں نہیں پڑھاؤں گا تمہیں"۔ یہ غرائے ۔ "اچھا نہ سہی لیکن آپ میرے بھائی جان تو ہیں" ۔ نہیں میں نہیں بنتا "بھائی جان ، جل کر بولے ۔ "ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے ۔ تمہیں کیا چاہے میں مروں یا جیوں"۔ انہوں نے اپنی کتاب اٹھا کر دیوار سے دے ماری ۔ "بڑا اچھا کیا آپ نے"میں نے لاپرواہی سے کہا ۔ یہ کتابیں تو آپ کی جان کھا گئی ہین ۔ " یہ کتابیں جان کھا گئی ہیں یا ۔ یا۔۔۔۔۔ دفعتاً وہ چپ ہوگئے ۔ "یہ پنسل بھی پھینک دیجئیے نا ۔ میری انگلیاں ان کے ہاتھوں سے مس ہوئیں ۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اب جو دیکھتی ہوں تو گالوں پر آنسو ۔ شائستہ انہوں نے مشکل سے کہا ۔ "مجھے اس قدر عاجز نہ کرو" ۔

"پھر" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا !" شائستہ ہنسی ۔ مصیبت یہ تھی کہ کرامت بھائی کو اکثر دورے پر جانا پڑتا تھا ۔ ایک بار وہ پندرہ دن کے لئے دورے پر چلے گئے ۔ تو سکندر صاحب پھر ویسے ہی برف ہوکر رہ گئے ۔ اف کس قدر اداسی میں کٹے وہ دن ۔ میں بیٹھی کرامت کا انتظار کیا کرتی کہ کب وہ آئے اور اور ۔۔۔ " وہ مسکرا پڑی ۔ "آتے بھی تو وہ چند دنوں کے لیے ۔ اور پھر جب جانے لگتے تو میں ان کی منتیں کیا کرتی ۔ کرامت بھائی نہ جاؤ ۔ خدا کے لئے آج نہ ۔ " دفعتہ وہ چپ ہوگئی ۔

"اُف یہ میں نے کیا کردیا ہے" ۔ وہ چلائی ۔ "یہ دیکھو" اس نے سویٹر میرے سامنے رکھدیا ۔ "سارا الٹ بُن گئی ہوں ۔ میں بھی پاگل ہوں" ۔ باتوں ہی باتوں میں کھوگئی ۔ نہ جانے کیا بکتی رہی ہوں ۔" وہ مسکرائی ۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ عین اس وقت باہر سے سکندر کی آواز آئی ۔ وہ چونکی ۔ "وہ آگئے"۔ اور پھر میری طرف متوجہ ہوکر بولی "کبیر بھائی ! ؛ کوئی نہیں جانا وانا ۔۔۔۔۔"

'پرسوں میں نہ روکوں گی تمہیں ، پرسوں !"

نہ جانے اس وقت مجھے کیا ہوا ۔ میں نے محسوس کیا ۔ کہ میں پھیل رہا ہوں پھیلے جارہا ہوں ۔ تمام فضاؤں پر چھائے جارہا ہوں ۔ اردگرد کی چیزیں سمٹ رہی تھیں ۔ سمٹی جارہی تھیں ۔ وہ صحن ۔ دیواریں گڑیا کے گھر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں ۔ گڑیا میرے سامنے کٹ پتلی کی طرح بیٹھی تھی ۔ سامنے دروازے میں ایک گڈا دیوار ۔ صحن اور زمین کو گھو رہا تھا ۔۔۔۔۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا مجھے جیسے وہ ایک تماشا گاہ ہو ۔ جہاں کٹ پتلیاں ناچ رہی تھیں ۔

"پرسوں چلے جانا" ۔ گڑیا نے ماتھا ٹیک کر کہا ۔

"پرسوں" میں ہنسا ۔ "نہیں پرسوں نہیں" ۔

"تو کب ؟" وہ گھبرا کر بولی ۔

"اونہوں ۔ میں تو یہاں ایک مہینہ ٹھہروں گا ۔ تمہارے پاس" ۔ یہ کہہ کر میں باہر سیر کے لیے نکل گیا ۔ گڈا اندر بیٹھا غصے میں بڑبڑا رہا تھا ۔

باجی

کچھ دیر اچھا باجی کو متوقع نظروں سے دیکھتا رہا ۔

باجی کام میں مصروف تھی ۔ دوپٹہ شانوں پر گرا ہوا تھا ۔ بکھرے ہوئے بالوں میں کیوپڈ کی شکل کا کلپ لگا ہوا تھا ، اور وہ نیچی نگاہوں سے مسکرائے جا رہی تھی ۔ باورچی خانے کے دروازے میں بھائی جان کھڑے تھے ۔ ایک نظر باجی کے کلپ کی طرف دیکھتے اور پھر گھبرا کر اپنی عینک صاف کرنے لگتے ۔ اماں روٹی پکانے میں مصروف تھی ۔

"باجی ! اچھا چڑ کر چلایا ۔

"کیا ہے تجھے"۔ اماں بولی ۔

"مجھے تو نہیں باجی کو ہے"

"کیا ہے مجھے"۔ وہ ہنسی ۔

نہیں نہیں ۔ اچھا چمک کر بولا

بھائی جان جھینپنے لگے

"کچھ پتا ہی نہیں چلتا تمہارا ، کبھی کچھ ، کبھی کچھ ۔ ۔۔۔۔ ۔ آپ ہی کہا تھا بھائی جان کو باورچی خانے لے آ اور اب"۔۔۔۔۔ ۔ ۔

"کب کہا تھا میں نے ، باجی کا منہ سرخ ہوگیا ۔

"اوں کہا نہیں تھا"۔

"لو اماں ، میں نے تو کہا تھا کھانا تیار ہو جائے تو انہیں اطلاع دے دینا"۔

"اوں ۔ اطلاع دے دینا ۔ اور جو مجھے مٹھائی ۔ ۔ ۔۔۔۔"

"اچھے !! ، باجی نے شور مچایا"۔

"دو ، پھر مٹھائی مجھے"۔

بہت برا ہے تو ۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور اچھے کو گود میں لے کر اسے پیار سے پیٹنے لگی ۔

بھائی جان گھبرانے کے ساتھ مسکرا بھی رہے تھے ۔

"بہت باتیں بناتا رہتا ہے تو" ، باجی نے اچھے کو پیار سے گھورا اور ایک آڑی نظر بھائی پر ڈال کر بولی ۔ چاہے بھائی جان باورچی خانے آئیں نہ آئیں مجھے کیا ۔

اماں نے منہ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا ۔ تم آ بھی گئے نذیر ؟

"نہیں نہیں" ، بھائی جان چونک کر بولے ۔ "نہیں نہیں ۔ میں تو ویسے ہی آیا تھا"۔

جھوٹ ، اچھا باجی کی گود میں سے چیخنے لگا ۔

اماں چولھے میں منہ دے کر ہنسنے لگی ۔

"کیوں اماں میں نے بلایا تھا بھائی جان کو" ؟

"نہ ، میں نہیں دیتی تمہاری باتوں میں دخل"۔ وہ بولی ۔ تم جانو اور تمہارے بھائی ۔

"آپ اس شیطان کی باتوں میں نا آیا کریں بھائی جان"۔ باجی اپنے کلپ کو سنوارتے ہوئے بولی ۔

"نہیں نہیں" ، بھائی گھبرا گئے ۔

"نہیں نہیں"۔ اچھے نے ان کی نقل اتاری ۔

"نہیں نہیں ۔ اچھے" باجی اچھے کو گھور کر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔

انہیں نہیں نہیں کرتے دیکھ کر اماں بھی مسکرانے لگی ۔ وہ جانتی تھی گھر میں سبھی بھائی نذیر کو نہیں نہیں کہا کرتے ہیں ۔

باجی چپکے سے اچھے سے پوچھتی ۔ "اچھے وہ کہاں ہیں ؟" "وہ ؟" اچھا ، آنکھیں چمکا کر راز دارانہ انداز سے کہتا ۔ "نہیں نہیں ؟" باجی ہنس پڑتی ۔ تو اچھا اس سے پوچھتا ۔ "بلا لاؤں" نہیں ، نہیں" باجی اسے پیار سے گھورتی "ہاں ہاں" وہ جواب دیتا "نہیں نہیں کو"۔ "نہیں" باجی ہنستے ہوئے اسے ڈانٹتی اس پر اچھے کا منہ لٹک جاتا اور وہ جل کر کہتا ۔ "تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا باجی ، کبھی کچھ کبھی کچھ" اور باجی ہنستی ، ہنسے جاتی ۔

اچھا ، سچ کہا کرتا تھا ۔ "باجی کا کیا اعتبار ۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ اور"۔ باجی کی اس عادت پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے ۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتی ہوں ۔ اسی وجہ سے مجھے باجی ذرا اچھی نہیں لگتی ۔ وہ اچھے سے مل کر سارا دن شور مچایا کرتی ۔ یہ دیکھ کے میں چپکے سے بھائی جان کے کمرے میں جا بیٹھتی اور کتاب پڑھنے لگتی ۔ بھائی جان میری طرف دیکھتے اور مسکرائے جاتے ۔ ان کی خاموش مسکراہٹ کس قدر پر اثر ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے ۔ صرف ہونٹ ہی نہیں جیسے کہ باجی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا ۔ بھائی جان اپنی کرسی کھینچ کر میرے پاس آ بیٹھتے ۔

"بہت جی لگتا ہے تمہارا پڑھنے میں سگی" ۔ میری ہنسی نکل جاتی ۔ اس پر وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتے ۔ "عجیب انداز سے ہنستی ہو تم سگو ۔ بہت خطر ناک ہوتی جا رہی ہو۔" بھائی جان کی عادت ہی ایسی ہے چپ چاپ بات کر دیتے ہیں ، نہ بھی کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ بن بولے باتیں کر رہے ہوں ۔ اس کے باوجود باجی یہ سمجھتی ہے کہ وہ بات نہیں کرتے ۔ اور کریں بھی تو گھبرا جاتے ہیں ۔ میرے سامنے تو وہ ذرا نہیں گھبراتے ۔ ان کے کمرے میں چلی جاتی ہوں ، تو آپ ہی آپ بات چھیڑ دیتے ہیں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ توبہ ۔ میں ان کا مذاق نہیں اڑاتی نا ۔ اس لئے ۔ اور باجی ؟ باجی کو تو ہر وقت یہ فکر رہتا ہے کہ انہیں پریشان کرے ۔ پھر بھائی جان گھبرا جائیں تو ان کا قصور ؟ لیکن بھائی جان بھی تو حد ہیں باجی کے سامنے جا کر گویا سدھ بدھ نہیں رہتی ، منہ سے بات نہیں نکلتی ۔

اس روز جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے ۔ اماں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی کہ یکایک میں اور باجی اسکول سے آ پہنچیں ۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا اور یوں گھبرا گئے جیسے کسی غیر کے آنے پر کوئی لڑکی گھبرا جاتی ہے ۔ ہم بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئیں ۔ اور جلدی سے باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں ۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ہم نے اماں کی ہنسی سنی ۔ "اے ہے اپنی منیر اور صغیر ہیں" ۔ "منّی ؟" بھائی جان نے حیرانی سے دہرایا ۔ "اتنی بڑی ہوگئی ہے ؟ ۔ اماں ہنس کر بولی "دسویں میں ہے ۔" پھر اس نے باجی کو آواز دی "منیر بیٹی یہاں آ ۔ تیرے بھائی آئے ہوئے ہیں ۔" باجی باورچی خانے میں داخل ہوئی تو بھائی جان پھر سے گھبرا گئے ۔ "السلام علیکم ۔" وہ مسکرائی جیسے کہ اس کی عادت ہے ۔ "ایک دم اتنی بڑی ہوگئی ہو ۔" وہ عینک صاف کرتے ہوئے بولے "ان لڑکیوں کو بڑھتے ہوئے دیر لگتی ہے کیا ؟" اماں کسی کام سے باہر جاتے ہوئے بولی ۔ اماں کے جانے کے بعد بھائی جان اور بھی گھبرا گئے ۔ کچھ کہنے کی خاطر بولے "دسویں میں ہو ؟" "ہوں" باجی نے شان سے کہا ۔ "اور تم ؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ۔ "آٹھویں میں" میں نے جواب دیا ۔ پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے ۔ بار بار عینک صاف کرتے ۔ چوری چوری باجی کی طرف دیکھتے اور گھبرا کر مجھ سے کوئی سوال پوچھ لیتے ، باجی ان کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے جاتی ۔ اس کی مسکراہٹ کو محسوس کر کے بھائی جان اور بھی پریشان ہو جاتے ۔

"سگو" انہوں نے آہستہ سے کہا ۔ "تمہاری باجی تو ایک دم منّی سے منیر بن گئی اور تم وہی سگی کی سگی رہیں ۔" اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا ۔ میں نے کہا کیوں میں کیا بچہ ہوں ؟ تیرھویں میں ہوں "نہیں نہیں" وہ ہنسے ۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا ، کیوں مون انہوں نے باجی کی طرف دیکھا ۔ "میں کیا مون ہوں ؟" باجی نے گھور کے کہا ۔ "تو اور کیا" ؟ بھائی جان کے ماتھے پر پسینہ آگیا "اے ہے ، ملتے ہی لڑنے بھی لگے" اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ۔ "دیکھ لو چاچی ۔" بھائی جان چمک کر بولے اس کی عادت ہی ایسی ہے ۔" اماں ہنسی "نہیں نہیں" بھائی جان گھبرا کر بولے "نہیں نہیں" اس پر باجی کھلکھلا

کر ہنس پڑی ۔ اتنے میں اچھا دوڑا دوڑا آیا اور اچک کر بھائی جان کی گود میں بیٹھ گیا ۔ باجی نے منہ پکا کر اچھے کو گھورا ۔ "نہیں نہیں اچھے ۔ نہیں نہیں" ۔ اور ہم سب ہنس پڑے ۔ "دیکھا بھائی جان یہ ہے میری باجی یہ سکول گئی ہوئی تھی اچھا آنکھیں چمکا کر بولا اچھی ہے نا ۔ یہ سن کر باجی گھبرا کر باہر نکل گئی ۔ دو ایک منٹ کے لئے تو وہ بیٹھے عینک صاف کرتے رہے پھر پسینہ پونچھ کر بولے "تمہاری باجی تو قصائی ہے" "قصائی ؟" اچھے نے دہرایا بھائی جان نے اچھے کو پچکار کر کہا ۔ "اونہوں چیخو نہیں" ۔ "چیخیں، تو کیا ہوتا ہے ؟" وہ بولا ۔ "قصائی بگڑ جاتا ہے" بھائی جان نے جواب دیا ۔ "پڑی بگڑے ، ہمیں کیا پروا" ۔ اچھے نے بے پروائی سے کہا ۔ "ہمیں تو ہے" بھائی جان مسکرائے ۔ "کیوں کیا بکرے ہو؟" اور چیختا ہوا باجی کی طرف بھاگا ۔ "باجی باجی بھائی جان بکرا ہیں" ۔ باجی یہ سن کر ہنسنے لگی "اور تم ؟" اچھے نے منہ پر انگلی رکھ کر کہا ۔ "تم قصائی" ۔ "چپ شیطان کہیں کا" ۔ باجی نے پیار سے اسے گھورا ۔ بھائی جان کو پاس سے گذرتے ہوئے دیکھ کر وہ اچھے سے کہنے لگی "ہمیں نہیں چاہیئے ایسا دبلا پتلا بکرا" "کیسا چاہیئے" ۔ اچھے نے پوچھا ۔ "موٹا ہو چربی والا ہو" وہ مسکرائی اچھا بھائی جان کی طرف بھاگنے لگا تو باجی نے ہنستے ہوئے اسے پکڑ لیا ، جیسے واقعی اسے روکنا چاہتی ہو ۔ توبہ باجی کو کیسے ڈھونگ رچانے آتے تھے ۔ میں کیا سمجھتی نہیں ۔ وہ تو بلکہ آپ چاہتی تھی کہ اچھا جا کر ساری باتیں بھائی جان سے کہہ دے ۔ اسی لئے تو وہ اچھے سے ایسی ایسی باتیں کیا کرتی ۔ اچھے سے کچھ کہنا اور پھر توقع رکھنا کہ وہ چیخ چیخ کر اسے دہرائے گا نہیں ۔

اگر اماں ولائیت کا ذکر نہ کرتی ، تو بات نہ بگڑتی ۔ لیکن اماں ! اماں کو کون سمجھائے !! وہ تو بن سوچے سمجھے بات کر دیتی ہے ۔ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے ۔ اماں بولی "نذیر اپنی شادی کا بھی کچھ فکر ہے" ۔ "شادی !" بھائی جان کا رنگ اڑ گیا ۔ باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "مجھے فکر کرنا ہے" ؟ "اے ہے" اماں بولی ۔ "ولایت اب جوان ہے ۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے" "ولایت !" باجی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔ "ہاں ہاں" اماں نے کہا ۔ "تمہارے پھوپھا کی لڑکی ۔ اس سے نذیر کی شادی ہوگی نا" "ولایت !" باجی کھلکھلا کر ہنس پڑی ولایت سے باجی کو چڑ تھی نا ۔ اس لئے ولایت کا نام آجاتا تو ایسا منہ بناتی جیسے کوئی پھس پھسی چیز منہ میں آپڑی ہو ۔ بات بھی ٹھیک ہے ، واقعی ولایت پھوہڑ اور بد مذاق ہے ۔ سارا سارا دن مصلےَ پر بیٹھ رہتی ہے ، مصلے سے اٹھی تو برتن دھونے لگی ۔ کپڑے دھونے سے تو اسے عشق ہے ۔ بات کرو تو مسئلے چھیڑ دیتی ہے اور چپ بیٹھی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تسبیح کر رہی ہو ۔

بھائی جان نے بہتیرا کہا کہ منگنی کوئی نہیں ہوئی ۔ ویسے ہی لوگوں نے بات چلا دی ہے ۔ لیکن اماں کب ماننے والی تھی بولی "مانا ڈھولک نہیں بجی باجے نہیں بجے ۔ لیکن بات تو پکی ہو چکی ہے" ۔ ادھر باجی ہنس ہنس کر چیخنے لگی ۔ "میں نے بھی کہا ۔ بھائی جان کو ولایتی چیزوں سے عشق کیوں ہے" ۔ اچھا چلایا ۔ "بھائی جان کا بیاہ ہوگا ۔ ابا بھائی جان کا بیاہ ہوگا" ۔ "نہیں نہیں" ۔ بھائی جان گھبرا کر بولے ۔ اور پھر دفعتاً چپ ہو گئے ۔ "نہیں نہیں" ۔ باجی نے اچھے کو مذاق سے گھورا ۔ "نہیں نہیں" دولھا بنیں گے میں جانتا ہوں" اچھا چیخنے لگا ۔ "گھوڑے پر چڑھیں گے" ۔ توبہ ان سب نے مل کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا ۔ اس پر بھائی جان کھسیانے ہو کر چلے گئے ۔

اگلے روز کھانے کے وقت حسب معمول اچھا باجی کے پاس آکر کہنے لگا ۔ "باجی بلاؤں بھائی جان کو" اوں ہوں" باجی نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا ۔ "وہ تو اپنے کمرے کو ولایت بنا کر بیٹھ رہتے ہیں" ۔ عین اس وقت بھائی جان آپہنچے ۔ باجی کی بات سن کر انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا ۔ اُف وہ ایک نظر جیسے گھور رہے ہوں ، فریاد کر رہے ہوں ۔ میرے بدن میں تو سوئیاں سی چبھنے لگیں ۔ لیکن باجی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے ۔ وہ اور بھی چہکی ۔ ہنستے ہوئے اچھے سے پوچھنے لگی ۔ "کیوں اچھے تم دیسی ہو یا ولایتی" "ولایتی ؟" ۔ اچھا سٹپٹا کر بولا "وہ کیا ہوتا ہے باجی ؟" ۔ "وہ جو ولایت میں بنے" باجی نے ایک انداز سے کہا ۔ "بھائی جان کیا ہیں ؟" اچھے نے پوچھا" ۔ "باجی نے ایک آڑھی نظر بھائی جان پر ڈالی ۔ "اور تم" اچھے نے پوچھا "ہم تو دیسی ہیں" باجی

مسکرائی ۔ ایک بار بھائی جان نے پھر اسی نظر سے باجی کی طرف دیکھا ۔ اف کتنی التجا تھی ، اس ایک نظر میں عین اس وقت اندر سے اماں کی آواز آئی ۔ ”تم اب آؤ گے بھی یا وہیں جھگڑتے رہو گے“ ۔

اس روز کھانے پر سبھی خاموش بیٹھے تھے ۔ بھائی جان پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ۔ باجی بھی کچھ سوچ رہی تھی ۔۔۔۔۔۔ اور اچھا ؟ حیرانی سے کبھی بھائی جان کی طرف دیکھتا ، اور کبھی باجی کی طرف ۔ ”کچھ اچھا بھی بنا ہے ؟“ اماں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔ اور پیشتر اس کے کہ بھائی جان جواب دیں ۔ باجی بولی ”اوں ہونہہ ۔ یہ شلغم کیوں پکا لئے اماں ۔ پکانے ہی تھے تو ولایتی پکاتیں“ ”ولایتی ؟“ اماں نے حیرانی سے باجی کی طرف دیکھا ۔ وہی جو پیلے سے ہوتے ہیں“ ۔ باجی نے کہا ۔ بھائی جان نے تڑپ کر باجی کی طرف دیکھا ، اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔ ”تو کہو نا انگریزی“ اماں باجی سے کہنے لگی ۔ ”ایک ہی بات ہے“ باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا ۔ ”بالکل اچھے نہیں لگتے تمہیں ؟“ اماں نے پوچھا ۔ ”مجھے ؟“ وہ معنی خیز نگاہوں سے بھائی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔ ”میں تو مزے سے کھا رہی ہوں بھائی جان سے پوچھئے“ ۔ بھائی جان کھسیانی ہنسی ہنسے اور پھر اور بھی چپ ہوگئے ۔

اگلے دن میں کئی ایک بار بھائی جان کے کمرے میں گئی ۔ دیر تک بیٹھی رہی لیکن انہوں نے مجھ سے بات تک نہ کی ۔ جیسے واقعی پڑھنے میں شدت سے مصروف تھے ۔ میں سب سمجھتی ہوں صاف دکھائی دے رہا تھا ۔ کہ وہ کھوئے کھوئے ہیں ۔ آنکھیں بھری بھری سی ۔ ماتھے پر تیوری ۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز کھائے جا رہی ہو ۔ میں نے جل کر پوچھا ”کیا ہے بھائی جان“ ؟ ”بھائی جان چونکے ”سگی ! کچھ نہیں ۔ مجھے تو کچھ نہیں“ ۔ انہوں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا ۔ ”ٹپ“ کتاب پر کچھ گرا ۔ ”بھائی جان !“ انجانے میں میرے منہ سے نکلا ”نہیں نہیں“ وہ چلائے ”میری آنکھیں خراب ہیں ، پانی گرتا ہے“ ۔ اچھا جو اس دوران میں اندر آچکا تھا ۔ چلا کر بولا ۔ ”جھوٹ آنکھ میں سے تو آنسو گرتا ہے“ بھائی جان نے بے بسی سے اچھے کی طرف دیکھا اور آہ بھر کر خاموش ہوگئے ۔ اچھا غل مچاتا ہوا باہر کی طرف بھاگا ۔ ”باجی باجی ۔۔۔۔۔۔“ ”تو پھر میں کیا کروں“ ۔

کچھ دیر بعد باجی کی آواز آئی اور بھائی جان کرسی سے اٹھ کر اوندھے منہ پلنگ پر لیٹ گئے ۔

اس کے بعد بھائی جان نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ وہیں کھانا منگوا لیتے ۔ اور پھر وہیں پڑھنا شروع کر دیتے ۔ شام کو اندر آکر گپیں مارتے اچھے سے کھیلنے کی بجائے وہ باہر سیر کو چلے جاتے اور آکر سو جاتے ۔ اندر آتے بھی تو اس وقت جب ہم دونوں اسکول میں ہوتیں ۔

ایمان کی بات ہے بھائی جان کی اس تبدیلی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔ اچھا ہوا وہ باجی سے الگ تھلگ ہوگئے ۔ باجی سے انہیں بھونڈے مذاق اور طعنوں کے سوا مل ہی کیا سکتا تھا ۔ ہر وقت کی کھی کھی اور شور شرابا ۔ لیکن مصیبت یہ تھی ۔ کہ بھائی جان نے باجی سے بات کرنا کیا چھوڑا انہوں نے تو بالکل ہی چپ کا روزہ رکھ لیا ۔

ایک دن میں ان کی چپ سے تنگ آ کر کمرے سے باہر نکل رہی تھی ، کہ باجی آگئی ۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی ۔ کیوں کہ اس سے پہلے باجی کبھی بھائی جان کے کمرے میں نہ آئی تھی ۔ نہ جانے کیا کہنے آئی ہے ۔ میں نے سوچا ۔ مذاق کی بات تو نہیں ہو سکتی ۔ کیوں کہ اس کے منہ پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ باجی کے ساتھ میں بھی اندر جاؤں ۔ مگر کیسے جاتی ۔ باجی کیا کہے گی ۔ بات سنے بغیر بھی تو نہ رہ سکتی تھی میں ۔۔۔۔۔۔ باہر نکل کر میں ادھر سے گھوم کر ادھر جا پہنچی ۔ جس طرف بھائی جان کے کمرے کی کھڑکی تھی اور لگی درز میں سے جھانکنے ۔ باجی بھائی جان کے سامنے طمطراق سے کھڑی تھی ۔ بھائی جان گھبرائے ہوئے کرسی پر بیٹھے چابیوں کے گچھے سے کھیل رہے تھے ۔ ”لیکن اماں تو یہی سمجھتی ہے“ باجی نے کہا ۔ بھائی جان کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں ۔

”اماں !“

”ہاں ۔ وہ کیا دیکھتی نہیں کہ آپ الگ الگ رہتے ہیں ۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ میری وجہ سے ناراض ہیں“ ۔

"نہیں نہیں" بھائی جان چلّائے اور پھر دفعتاً خاموش ہوگئے ۔ باجی کی ہنسی نکل گئی ۔ "آپ مجھے خواہ مخواہ ہنسا دیتے ہیں"۔ وہ بولی "چلو بھائی جان غصہ تھوک دو اب"۔

"تم سمجھتی ہو میں غصہ میں ہوں ۔ تم سے غصے میں ؟"۔ بھائی جان نے بصد مشکل کہا ۔

مجھے کیا پتہ ؟" باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا

"تمہیں پتہ نہیں مون ؟" بھائی جان کی آواز میں آنسو تھے ۔

"مجھے مون نہ کہا کیجئے"۔

"تو کیا کہا کروں" بھائی جان نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"مجھے نہیں معلوم"۔

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے منیر ۔ کبھی معلوم بھی ہوگا"۔

"نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ یہ ولایتی بولی ہماری سمجھ میں نہیں آتی"۔

"منیر !" بھائی جان تڑپ کر بولے "کیا تم کبھی نہ سمجھو گی ؟" انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں منت سے کہا ۔

"بھائی جان ! چپ !" وہ مسکرائی ۔ اتنے میں اچھا کہیں سے آنکلا اور اونچی آواز میں چلانے لگا ۔ "اماں دیکھو بھائی جان رو رہے ہیں ۔ اور باجی انہیں چپ کرا رہی ہے ۔ اتنے بڑے ہو کر روتے ہیں"۔ "اچھے ۔ اچھے" باجی اچھے کے پیچھے بھاگی ۔

شام کو جب ہم پڑھ رہی تھیں تو بھائی جان آئے اور چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھ گئے ۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے میری طرف دیکھا ۔ اور باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ لیکن ایمان کی بات ہے مجھے بے حد غصہ آیا ۔ آخر ایسی بھی کیا بات تھی جو میرے سامنے کہی نہ جا سکتی تھی ۔ بھائی جان تو بیکار باجی کے لئے دیوانے ہو رہے تھے ۔ اور

باجی ؟ باجی کو ان کی خاک پرواہ نہ تھی ۔ میں غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی ۔

جب میں اندر آئی تو باجی کے پاس ایک عجیب سا چمکدار پلاسٹک پڑا تھا ۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ۔ اس پر ایک خوبصورت بچے کی شکل بنی ہوئی تھی ۔ جس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا ۔ میں نے پوچھا باجی یہ کیا ہے "کیا ؟" باجی نے ٹھٹک کر پوچھا "یہ" میں نے پلاسٹک کی طرف اشارہ کیا ۔ بولی "یہ کلپ ہے" کلپ ؟ میں حیران ہو گئی "ہاں" باجی نے لاپرواہی سے کہا ۔ "میں نے بھائی جان سے کہا تھا ایک کلپ لا دو"۔ اس پر یہ تصویر کیسی ہے ۔ میں نے پوچھا ۔ "پتہ نہیں"۔ وہ مسکرائی ۔ "بس تصویر ہے"۔ توبہ باجی کو کتنے مکر کرنے آتے ہیں ۔ میں کیا جانتی نہیں کیوپڈ کی تصویر تھی ۔ میں نے کئی بار اسکول میں دیکھی تھی ۔ ہماری استانی نے سب کچھ بتایا تھا ہمیں ۔

اس کے بعد باجی ہر وقت وہ کلپ اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ۔ بھائی جان اسے دیکھتے اور مسکرانے لگتے ۔ اچھے نے کلپ کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہنے لگا ۔ "یہ کیا ہے باجی ۔ مجھے دو ۔ میں دیکھوں" اوں ہونہہ" باجی مسکرا کر بولی "یہ کھلونا نہیں" اچھا بسورنے لگا ۔ تو بھائی جان نے اسے پکڑ لیا بولے "آؤ ہم تمہیں ایسا اچھا کھلونا دیں گے"۔ "نہیں نہیں میں تو یہی لوں گا"۔ اچھا مچل گیا جیسے اس کی عادت ہے ۔ "واہ" بھائی جان بولے "یہ بھی کوئی چیز ہے ۔ بالکل بیکار ۔ اسے تو زمین پر لڑھکا بھی نہیں سکتے ۔ ہم تمہیں موٹر لا دیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے ، بھائی جان اچھے کو اٹھا کر باہر لے گئے ۔

اگلے روز جب باجی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں ۔ اماں بھاگی بھاگی آئی ۔ کہنے لگی ، منیر بیٹی اٹھ کے چاء تو بنا دے ۔ تیرا بھائی دلاور آیا ہے"۔ "دلاور"۔ باجی نے حیرانی سے پوچھا "ہاں ! تیری خالہ اور خالو بھی آئے ہیں "سچ ؟" وہ مسکرائی ۔ "ہاں" اماں بولی "دو ایک مہینے یہاں رہیں گے"۔ "افریقہ والی خالہ ؟" میں نے پوچھا"۔ افریقہ والی نہیں تو اور کونسی" ؟ اماں نے کہا ۔ شکر ہے بہن آئی ہے ۔ توبہ آٹھ سال وہیں افریقہ میں بیٹھی رہی ۔ مل تو لے مجھ سے ۔ "ہماری ایک باجی بھی ہے" باہر سے اچھے کی آواز آئی ۔ "پڑی

ہو“۔ دلاور بھائی کی بھدی آواز سنائی دی ۔ ”پڑی ہو نہیں“ اچھا چلایا ”ہے“۔ ”ہوگی“ وہ بولے ۔ اتنے میں اچھا بھاگتا ہوا آیا ”باجی باجی“ وہ بولا ”بھائی جان آئے ہیں وہ کہتے ہیں تمہاری باجی ہے ہی نہیں چلو“ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا ۔ ”چلو بھی نا“ ”نہیں نہیں اچھے“ باجی چڑ گئی ”نہیں نہیں ، نہیں“ اچھا اونچی آواز میں بولا ۔ ”دوسرے بھائی جان“۔ ”کون بھائی جان ؟“ باجی نے تنک کر باآواز بلند کہا ۔ ”وہ باہر بیٹھے ہیں“ اچھے نے کہا ۔ ”بیٹھے ہوں گے“ وہ ہنسی ۔ ”واقعی بیٹھے ہیں آؤ دکھاؤں“ اچھا بولا ”پڑے بیٹھے ہوں“۔ یہ سن کر اچھا باہر بھاگ گیا اور کہنے لگا ۔ ”باجی مانتی ہی نہیں کہ آپ بیٹھے ہیں“۔ ”نہ مانے“ وہ ہنسے ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے“۔

اماں کو آتے دیکھ کر اچھا پھر سے چیخنے لگا ۔ اماں دیکھو یہ بھائی جان میری باجی کو مانتے ہی نہیں“۔ اماں ہنسنے لگی ۔ تُو تو پاگلوں کی سی باتیں کرتا رہتا ہے“ اچھا بھائی جان سے مخاطب ہو کر بولا ۔ ”ہماری باجی دسویں میں ہے دسویں میں“ ”دسویں میں ؟ بھائی دلاور نے منہ بنا کر کہا ۔ ”پہلے کیوں نہ بتایا تم نے ؟“ ”آپ تو مانتے ہی نہ تھے“۔ اچھے کی آواز میں فتح کی گونج تھی ۔ ”تم تو کہتے تھے وہ باجی ہے“ بھائی جان نے اماں کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ ”باجی ہی تو ہے“ وہ بولا ”جو دسویں میں ہو اسے تو منی کہتے ہیں ۔ باجی نہیں“ ”منی ؟ “دلاور نے کہا“ اچھا سٹپٹا گیا ۔ اماں نے انہیں مشغول دیکھا تو بولی ”میں چاء لاتی ہوں“۔ اور باورچی خانے کی طرف چل دی ۔ ”منی کیا ہوتی ہے ؟“ اچھے نے دلاور بھائی سے پوچھا ۔ ”بھئی منی وہی ہوتی ہے نا ۔۔۔۔۔۔۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ منی کیا ہوتی ہے ؟“ ”بتاؤ نا“ اچھا شوق سے بے تاب ہو رہا تھا ۔ ”منی ہوتی ہے وہ جو دبلی پتلی ہو ۔ اتنی میلی میلی اور گندی کہ دیکھنے کو جی نہ چاہے ؟“ اچھا چمک کر بولا“۔ باجی تو اتنی چٹی گوری ہے ۔ ایسے اچھے کپڑے پہنتی ہے“۔

”ہونہہ منہ پر آٹا لگاتی ہوگی“ دلاور بھائی نے کہا ۔

”آٹا نہیں وہ تو پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر“

”وہی نا ولایتی آٹا ۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے ۔ ولائیتی آٹا وہی لگاتی ہیں جو میلی ہوں ۔ ورنہ ضرورت ہی کیا ہے“

”نہیں نہیں“ اچھا چڑ گیا ۔ باجی کو تو ولائیتی چیزیں ذرا پسند نہیں ۔ وہ تو دیسی ہے دیسی“۔

”دیسی ؟“ دلاور بھائی نے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا ۔ ”دیسی ؟“ آخ تھوہ“

اچھا بھاگا بھاگا باورچی خانے آیا ، بولا ”باجی باجی تم آتی کیوں نہیں“ باجی آپ ہی آپ بیٹھی ہنس رہی تھی ، اچھے کو دیکھ کر وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی ۔ ”اچھے“۔ اس نے گھور کر اسے خاموش کر دیا ۔ پھر کچھ سوچ کر گود میں اٹھا لیا اور پیار سے بولی ۔ ”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے“ وہ حیرانی سے باجی کی طرف دیکھنے لگا ۔ ”ہم اچھے کو چاء پلائیں گے ۔ بسکٹ دیں گے ۔ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی اور بسکٹ دے کر اسے بہلا لیا ۔

بھائی دلاور مجھے ذرا پسند نہ آئے ۔ موٹے موٹے نقش ، بھدا سا جسم اور دو گھورنے والی آنکھیں جو کبھی کبھی شرارت سے چمکتیں ۔ ان کے انداز میں لاپرواہی جھلکتی تھی ۔ بھائی نذیر کے مقابلے میں تو وہ پہلوان نظر آتے تھے نذیر بھائی کی کیا بات تھی ۔ نگاہوں میں مٹھاس ، برتاؤ میں نرمی ، گویا چیزیں اور لوگ بلور کے بنے ہوئے ہوں ، جنہیں وہ بڑی احتیاط سے چھوتے تھے ۔ دلاور بھائی تو سپاہی تھے سپاہی، تھے بھی تو فوج میں کپتان ۔ پہلے پہلے تو باجی نے اپنی عادت کے مطابق تیز باتیں چلانے کی کوشش کی ۔ مگر توبہ ہے جی ۔ ان کے سامنے ایسی باتیں کیسے چل سکتی تھیں پھر باجی چپ ہوگئی ۔ حتیٰ کہ اس کی مسکراہٹ بھی جاتی رہی ۔ ایمان سے مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ۔ بڑی بنی پھرتی تھی ۔ ہر کسی کو دبا لیتی تھی ، لیکن ہر کوئی بھائی نذیر سا تو نہیں ہوتا ۔

چاء پینے بیٹھے تو دلاور بھائی نے باجی کے سلام کے جواب میں کہا ۔ ”منیر تم تو ویسی کی ویسی ہو جیسے پہلے تھیں“ ”کیوں ؟“ اماں بولی ”اب تو ماشاءاللہ جوان ہے ، اتنا بڑا قد ہوگیا ہے ۔“ ”قد بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے“ بھائی نے جواب دیا ”باقی تو بالکل وہی ہے“۔ باجی کا منہ لال ہوگیا ۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی ۔ اماں نے شاید بات بدلنے کے لئے کہا ۔ ”اب کیا ہمیشہ کے لئے افریقہ بیٹھ رہو گے تم سب ؟“ ”افریقہ ؟ میں تو نہیں رہتا وہاں“۔ بھائی نے کہا ”وہ

تو رہتے ہیں نا“ اماں نے جواب دیا ۔ ”تو ان سے پوچھ لینا جب وہ آئیں گے“۔ بھائی نے ہنس کر کہا ، خالہ میں تو سپاہی ہوں سپاہی ۔ دو سال سے مارا مارا پھر رہا ہوں ۔ کبھی یہاں کبھی وہاں“ اماں بولی ”میں کہتی ہوں تم نے یہ نوکری کی ہی کیوں جان کو آرام نہ ہو تو پیسے کو کیا کرنا ہے ۔“ ”جان کو آرام کیوں نہیں“۔ بھائی نے اماں کی طرف دیکھا ۔ ”آپ ہی تو کہتا ہے تو ۔ مارا مارا پھرتا ہوں“۔ اماں بولی ”جسے مارا مارا پھرنے میں ہی مزہ آئے ، وہ کیا کرے خالہ“۔ بھائی مسکرا دیئے ۔ ”اپنا گھر نہ بساؤ گے کبھی ؟“ اماں نے پوچھا ”گھر بسانے میں دیر لگتی ہے کیا ۔ چار کلمے پڑھے اور گھر بس گیا ۔ پھر کوئی جہاں جی چاہے بھٹکتا پھرے“۔ وہ بولے ”تو کیا بیوی کو بھی ساتھ ساتھ لئے پھرو گے ؟“ اماں نے پوچھا ۔ ”اور کیا اسے کوٹھڑی میں بند کر جاؤں گا“۔ دلاور بھائی نے قہقہہ لگایا ”پھر تو دلاور ہاتھ ملتے ہوئے اماں نے کہا ۔ ”کوئی فرنگن ہی کرو گے ۔ یہاں کی لڑکیاں تو باہر نہیں پھرتیں“۔ ”نہ سہی کوئی زبردستی ہے ؟“ دلاور بھائی ہنسے ”ہائے ہائے“ اماں نے ناک پر انگلی رکھ لی ۔ ”فرنگن میں کیا برائی ہے خالہ“ بھائی نے ہنس کر پوچھا ۔ کیوں سگو ؟“ ”فرنگن کیا ہوتی ہے“ اچھا بولا ۔ ”یہی جو ولایت کی ہوتی ہے“ اماں نے جواب دیا ”ولایت کی“۔ اس نے دہرایا ”جو بنا سپتی ہوتی ہے ؟“ اس پر ہم سب کی ہنسی نکل گئی ۔ لیکن اور اچھا کب چپ رہنے والا تھا ۔ بولا ”دوسرے بھائی جان سے جو پوچھ رہی تھی“ باجی ۔“

عین اس وقت میں نے مڑ کر دیکھا بھائی نذیر دروازے میں کھڑے تھے دلاور بھائی سے رسمی ملاقات کرنے کے بعد وہ ابھی عینک لگانے نہ پائے تھے ۔ کہ اچھا چلانے لگا ۔ ”بھائی جان یہ سب ہنس رہے ہیں ۔ یہ نئے بھائی جان اور ، اماں اور سبھی ، یہ کہتے ہیں باجی باجی نہیں ۔ منی ہے“۔ ”اچھے“ اماں اسے گھورنے لگی ۔ ”سارا دن نہ جانے کیا بکتا رہتا ہے“۔ ”بچہ جو ہوا“ دلاور بھائی نے اماں کو خاموش کر دیا اور لگے اس سے باتیں کرنے ۔ ”جھوٹ تو نہیں کہتے ہم اچھے پوچھ لو اپنی باجی سے“ باجی نے تیکھی نظر سے دلاور بھائی کی طرف دیکھا اور منہ موڑ کر مسکرانے لگی ۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں پریشانی کی جھلک تھی ۔

اگلے روز ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے ۔ نذیر بھائی ، باجی ، اچھا اور

میں ۔ اچھے نے بہت کوشش کی کہ باجی کو بات کرنے پر مائل کرے ۔ مگر وہ خاموش رہی ۔ اسے نذیر بھائی کو چھیڑنے کی بھی نہ سوجھی ۔ بھائی عینک صاف کرتے ہوئے بولے ، اچھے آج تمہاری باجی کو کیا ہے ۔ اچھا بولا ۔ ”اونہہ ، باجی کا کیا ہے ، کبھی کچھ کبھی کچھ“۔ ”کیوں منیر اچھا کیا کہہ رہا ہے ؟“ انہوں نے بات چھیڑنے کی کوشش کی ۔ ”اس کا کیا ہے ۔ جو منہ میں آیا بک دیا“۔ باجی نے شانے جھٹک کر کہا ۔ ”میں بتاؤں باجی کیوں چپ ہے ، نئے بھائی جو نہیں مانتے ؟ کیا نہیں مانتے ۔ ”کچھ بھی نہیں مانتے ۔ کہتے ہیں منی ہے منی“۔ ”مجھے کیا؟“ باجی چڑ کر بولی ۔ ”لوگ مانیں نہ مانیں“ بھائی جان نے ہولے سے آہ بھر کر کہا ۔ ”کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا“۔ باجی نے غصہ سے مڑ کر دیکھا ۔ ”مان نہ مان میں تیرا مہمان“۔ اچھا چلانے لگا ۔ ؟وہ کیا ہوتا ہے باجی ؟“ ”اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ“ باجی نے ہنس کر کہا ۔ بھائی کا رنگ فق ہوگیا ۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری اور چپکے سے باہر چلے گئے ۔ بھائی کے چلے جانے کے بعد اچھا باجی سے لڑنے لگا ۔ ”تم تو بھائی جان سے لڑتی ہو باجی“۔ ”میں لڑتی ہوں“ اس نے غصے سے کہا ۔ ”ہم نہیں بولتے تم سے“ اچھے نے کہا ، کچھ دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

باجی نے بال سنوارنے کے لئے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا ہاتھ کلپ سے چھوا تو وہ یوں چونکی جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو ۔ اس نے کلپ اتار کر اچھے کی طرف بڑھایا ”یہ لو ۔ اب تو بولو گے مجھ سے“ ”لے لوں ؟“ اچھا حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا ۔ ”ہاں“ باجی بولی ”واپس نہیں دوں گا پھر“ اچھا بولا ۔ ”نہ دینا“ باجی نے لاپرواہی سے جواب دیا ”مجھے کیا کرنا ہے اسے“۔

”یہ دیکھو بھائی جان“۔ اچھے نے بھائی دلاور کو کلپ دکھتے ہوئے کہا ۔ ”نہیں دیکھتے ۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو“۔ بھائی جان نے مذاق سے کہا ۔ ”خواہ مخواہ کیا ہوتا ہے بھائی جان ؟ ابھی ابھی باجی بھی کہہ رہی تھی ۔“ ”تو پھر پوچھو اس سے“ بھائی مسکرانے لگے ۔” وہ نہیں بتاتی ۔ آپ بتائیے نا“۔ اچھے نے منت سے کہا ۔ ”تمہیں کہہ رہی تھی ؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”نہیں نہیں ان

کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ '' اچھے نے بات شروع کی ''اچھے'' باجی غصہ میں چلائی ۔ اچھا خاموش ہوگیا ۔ بھائی ہنس کر کہنے لگے ۔ ''دیکھا اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ'' ''اسے کیسے ؟'' اچھا حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ بھائی اسے سمجھانے لگے ۔ ''اگر تم اور میں باتیں کر رہے ہوں اور بیچ میں کوئی بول اٹھے تو اسے کہتے ہیں خواہ مخواہ'' ۔ ''جیسے باجی بولی ہے ؟'' ''کوئی بھی ہو'' ۔ انہوں نے مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا ۔ ''نہیں نہیں'' ۔ اچھا چلایا ''باجی تو نذیر بھائی کو خواہ مخواہ کہہ رہی تھیں'' ۔ ''دونوں ہی خواہ مخواہ ہیں'' ۔ یہ کہہ کر دلاور بھائی ہنسنے لگے ۔ باجی کے ہاتھ سے چمچہ گرگیا ۔ ''یہ دیکھا'' ۔ وہ اچھے سے کہنے لگے ۔ ''اب اسے غصہ آرہا ہے'' ۔ باجی سے نہ رہا گیا ۔ غصے سے بولی ۔ ''نہیں تو نہیں آرہا غصہ'' ۔ ''پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے ۔'' انہوں نے جواب دیا ۔ ''ایلو میاں اچھے دیکھ لو ۔ تمہاری باجی کو غصہ بھی نہیں آتا تت تت تت تت !!!'' باجی کی ہنسی نکل گئی ۔ ''بڑے مغرور ہیں آپ بھائی جان'' ۔ باجی گھور کر بولی ''ہر سپاہی کو ہونا چاہیئے'' ۔ بھائی جان نے جواب دیا ۔ ''سپاہی کو صرف دو باتوں کا خیال ہوتا ہے ۔ آن اور شان'' ۔ ''اونہہ'' باجی نے منہ بنا کر کہا ۔ ''بڑی شان ہے کیا شان ہے ؟ اور باہر نکل گئی ۔

رات کو جب اماں اچھے کو لے کر پڑوس میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھی اور ہم دونوں پڑھ رہی تھیں ، بھائی دلاور آگئے ۔ باجی انہیں دیکھ کر یوں بیٹھ گئی ۔ جیسے پڑھنے کے سوا اسے کسی کا دھیان ہی نہیں ۔ لیکن بھائی جان کب ٹلنے والے تھے ۔ سیدھے باجی کے پاس جا بیٹھے ۔ ''کیا پڑھ رہی ہو منو ؟'' انہوں نے پوچھا ۔ ''کچھ بھی نہیں'' ۔ وہ تنک کر بولی ۔ ''ٹھیک تو ہے'' ۔ بھائی جان نے کہا ''انسان غصہ میں ہو تو کچھ پڑھا نہیں جاتا'' ۔ ''کیوں میں کیا غصے میں ہوں'' ؟ باجی کا منہ لال ہوگیا ۔ ''پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے'' ۔ بھائی جان مسکرائے ۔ ''تمہاری عمر کی لڑکی ہو اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ نہ کھائے'' ۔ ''کیوں ؟'' باجی نے ان کی طرف دیکھا ۔ ''جوانی پر غصہ سہاگے کا کام دیتا ہے'' بھائی نے کہا ''میں نہیں سمجھتی آپ کی باتیں'' ۔ باجی نے منہ پکا رکھنے کی کوشش کی ۔ ''سمجھ لو تو تمہیں دلچسپی ہی نہ رہے'' ۔ بھائی نے جواب دیا ۔ باجی کھلکھلا

کر ہنس پڑی ''یعنی مجھے دلچسپی ہے آپ کی باتوں سے اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے انسان کیا کیا نہیں سوچتا'' ۔ باجی نے کہا ۔ سپاہی کی بے عزتی ہو تو بدلہ لینے سے نہیں چوکتا'' ۔ انہوں نے باجی کو اٹھاتے ہوئے کہا ۔ باجی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے ، مگر وہ اپنا آپ چھڑا نہ سکی ۔ بھائی نے اسے چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا ۔ ''بڑا غصہ ہے تم میں منو'' ''بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی'' ۔ باجی چیخی ۔ ''تمہیں آئینہ دکھائیں'' بھائی بولے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔ ذرا آئینہ تو لے آنا'' ''صغیر'' ۔

جب میں آئینہ لے کر واپس آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے جیسے وہاں کوئی ہو ہی نہیں میں دروازے میں رک گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ دیر بعد بھائی آہستہ سے بولے ''مینو'' میرے دل کو دھکا سا لگا ۔ ماتھے پر پسینہ آگیا ۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی ۔ ان دنوں میری عمر ہی کیا تھی ۔ اگرچہ میں سمجھا کرتی ، کہ میں سبھی کچھ سمجھتی ہوں ۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ سارا گھر ، باجی ، بھائی سبھی گندے تھے ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار کر گھر سے باہر نکل جاؤں ۔

اگلے دن باجی کا رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا تھا ۔ منہ پر ملائمت سی تھی ۔ آنکھوں میں ویرانی سی ، ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی ، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گذشتہ یاد سے متعلق ہو ۔ بھائی نذیر پہلے تو اسے دیکھ کر خاموش کھڑے رہے پھر آہستہ سے بولے ''منیر'' باجی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور بے پرواہی سے منہ پھیر کر اپنا کام کرنے لگی ۔ بھائی نذیر باجی کے بالوں میں کچھ تلاش کر رہتے تھے ۔ بھائی بھی احمق ہیں ان کا کلپ تو چولہے کے پاس راکھ میں پڑا تھا ، ''اوہ'' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ۔ پاؤں لڑکھڑائے ۔ ماتھے پر پسینہ آگیا ۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سہم کر پیچھے ہٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے ۔

ان کے جاتے ہی دلاور بھائی آکر بے تکلفی سے چوکی پر بیٹھ گئے ۔ باجی نے دو ایک مرتبہ چوری چوری ان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں ، اتنے میں اچھا آگیا ۔ بولا ''باجی ، نہیں نہیں کہاں ہیں'' ۔ ''نہیں نہیں کون'' ؟ دلاور

بھائی نے پوچھا ۔ "باجی" اچھے نے باجی کو چپ دیکھ کر بلانا چاہا ۔ "باجی !" بھائی جان ہنسنے لگے "۔ تمہاری باجی تو "ہاں ہاں" ہے"۔ باجی نے تڑپ کر ایک نظر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ "باجی نہیں ، نہیں نہیں"۔ "افوہ اچھے میاں" بھائی جان کہنے لگے "بات یہ ہے کہ جب تمہاری باجی کہے نہیں نہیں تو مطلب ہوتا ہے ہاں ہاں"۔ "بھائی جان" باجی منت سے چلائی ۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ۔ "اور اگر ہاں ہاں کہے تو ؟" اچھے نے کہا ۔ "ہاں ہاں کہے تو وہ تمہاری باجی ہی نہیں ۔ بھائی جان بولے "مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ"۔ اچھا باہر جاتے ہوئے چلایا ۔ "ہمیں تو سب معلوم ہے کیوں منی"۔ بھائی جان باجی کے قریب تر ہوگئے ۔ "آپ کو کبھی معلوم بھی ہوگا ؟" باجی نے آہ بھر کر کہا ۔ "اوہ غصے ہوگئیں"۔ وہ بولے "آپ سے غصے ؟"۔ باجی گنگنائی ۔ بھائی دلاور اس کے قریب تر ہوگئے ۔ "اس لئے روٹھتی ہو کہ کوئی منائے ؟" باجی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہوگئیں ۔ لیکن بھائی نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔ میرا خیال تھا ۔ کہ باجی ان کے منہ پر تھپڑ مار دے گی ۔ لیکن اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ۔ ہاتھ لٹک گئے آنکھیں جھک گئیں ۔

راکھ میں کلپ پڑا دیکھ کر وہ یوں چونکی ، جیسے اسے پہلی مرتبہ وہاں دیکھا ہو ۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے کئی مرتبہ چلتے پھرتے اسے اپنے پاؤں سے ٹھکرایا تھا جیسے ٹھیکرا ہو ۔ مگر اس وقت اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی عین اس وقت اچھا آگیا ۔ باجی کے بالوں میں کلپ لگا ہوا دیکھ کر بولا ۔ "یہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا باجی"۔ "نہیں اچھے یہ دینے کی چیز نہیں"۔ باجی نے کہا ۔ "اب پتہ چلا تمہیں ؟"۔ اچھے نے شور مچایا ۔ "ہاں" باجی کی آواز میں ہچکی سی تھی "تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا"۔

اگلے روز جب اماں خوشی خوشی سے دوڑی دوڑی آکر کہنے لگی ۔ "منیر بیٹی تمہارے خالو کا خط آیا ہے انہوں نے دلاور کے لئے تمہارا رشتہ مانگا ہے"۔ "تو میں کیا کروں" باجی نے چڑ کر کہا "اے ہے" اماں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولی ۔ "آخر تو پڑھی لکھی ہے ، سمجھ دار ہے تجھ سے پوچھے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں" باجی نے یہ سن کر سر جھکا لیا ۔ "تو تجھے منظور ہے نا ؟" اماں خوشی سے

اٹھ بیٹھی ۔ باجی نے دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آہ بھری اس کا ہاتھ کلپ سے جا لگا ۔ اس نے اسے یوں مٹھی میں دبا لیا جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لے رہا ہو "ٹپ" نہ جانے کتاب پر کیا گرا ۔ اچھا جو اندر آگیا تھا بولا "باجی تو رو رہی ہے"۔ "چپ" اماں نے کہا ۔ "یہ تو خوشی کے آنسو ہیں"۔ باجی نے تڑپ کر اماں کی طرف دیکھا ۔ اف ، وہ ایک نظر ! باجی کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا ۔" اچھا چلّایا ۔ "ایک ساتھ ہنستی بھی ہو اور روتی بھی"۔

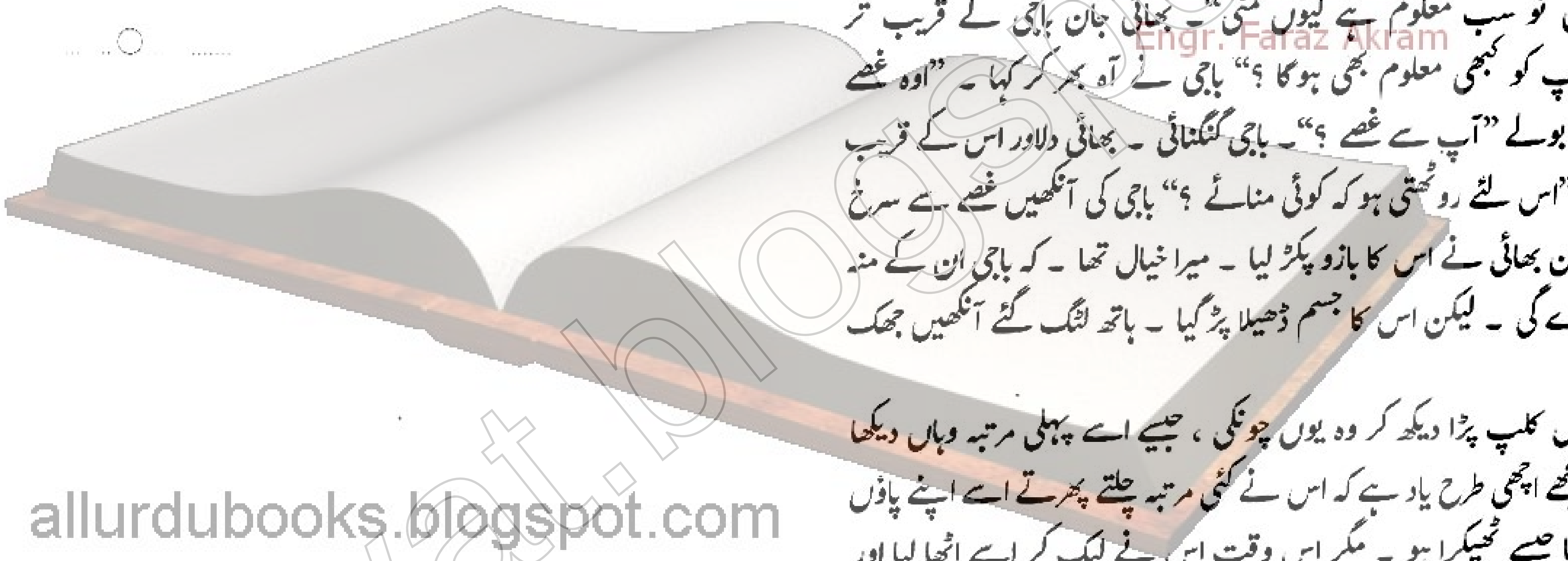

دوراہا

”یہ سراسر مینجمنٹ کا قصور ہے۔ ناحق پسنجرز کو تکلیف ہوتی ہے۔“ بیگم غصے میں چلائی۔

سٹیشن ماسٹر نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر بولا۔ ”لیکن میڈم! کیا آپ وہی صاحبہ ہیں جو اس روز غلطی سے پریم نگر کیری اُور ہو گئی تھیں؟“

”نانسنس!“ وہ چلائی۔ ”آپ کا مطلب؟ میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا؟ یہ صریحاً انسلٹنگ ہے۔ میں سپرانٹنڈنٹ کو لکھوں گی“۔ اور وہ ہاتھ کا بٹوا جھٹکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”ڈیش اٹ“ سٹیشن ماسٹر نے بجھے ہوئے سگار کے کش لینے شروع کر دیئے

”جی ہاں جی ہاں“۔ نہالچند نے اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر رکھ کر اوپر سے دیکھا۔

کہہ رہا ہوں ------“

”لاحول ولا قوۃ“۔ ٹکٹ کلکٹر داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں“۔ نہالچند بڑبڑایا۔ ”کہہ رہا ہوں کوئی ثبوت نہیں کہ یہ وہی شریمتی تھیں“۔

”اوہ مسٹر نہالچند“۔ سٹیشن ماسٹر بولا

”جی ہاں۔ وہ شریمتی تو۔ تو۔ یعنی جوان تھی۔ اور یہ دیوی --------“

”لیکن پریم نگر کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے میرا مطلب ہے۔ میں نے

سنا ہے“ ٹکٹ کلکٹر گھبرا گیا۔ ”میں نے سنا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ وہی بیگم ہو۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ وہی بیگم تھیں“۔

”آب و ہوا“ کیبن مین ہنسا۔ ٹیشن ماشٹر جی آپ جانیں ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا عورتوں کو راس آئے ہے۔ جیادہ تر عورتیں لوٹیں ہی نہیں ہیں واں سے“۔

”زیٹ از اٹ“۔ گارڈ نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”وہاں کا کلائی میٹ لیڈیز کو سوٹ کرتا ہے۔ جبھی وہاں کا آبادی نوے پرسنٹ زنانہ ہے“۔

”او ڈیشن اٹ آل، ہمیں وہاں کا جغرافیہ نہیں لکھنا“۔ سٹیشن ماسٹر نے سگار پھینک کر دل ٹھنڈا کیا۔

”جی ہاں، جی ہاں، وہاں کی آب و ہوا دل کے لئے اچھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ان کے منہ پر جھریاں کیوں پڑ جاتی ہیں؟“

”مسٹر نہالچند! جنٹلمین بات یہ ہے کہ یہ ایک انپارٹنٹ جنکشن ہے“ سٹیشن ماسٹر چلایا۔

”جی ہاں، جی ہاں، ارجنٹ ٹرمینل“۔ نہالچند مسکرا کر بولا۔

”ٹرمینل؟ ہاں ہاں ٹرمینل بھی“۔

”زیٹ از دی ٹربل“۔ گارڈ بولا۔ ”بوتھ ٹرمینل اینڈ جنکشن“۔

” رائیٹ۔ ٹرمینل بھی ہے اور جنکشن بھی۔

”جی ہاں، یہی میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اینی ہاؤ“۔ گارڈ بڑبڑایا ------ ”یہ ہے ضرور“۔

”ہاؤ ایور۔ کرانتی پور سے بھی“۔ سٹیشن ماسٹر نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔

”جی ہاں ، اور پریم نگر سے بھی ۔ سبھی “ ۔

”بالکل ؟“ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا ۔ ”خیر خیر ۔ کراتتی سے گاڑی اسی نمبر پر آتی ہے ۔ اور پھر وہ سائڈنگ میں لگا دی جاتی ہے ۔ پھر وہ نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے“ ۔

”جی ہاں ، جی ہاں ، نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے“ ۔ نہالچند بڑبڑایا ۔

” اونو ۔ نمبڑ چاڑ سے چلتا ہے شٹل تھری اپ“ ۔ گارڈ چلایا ۔

”جی ہاں ، یہی کہہ رہّا تھا میں شٹل تھری اپ“ ۔ نہالچند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا ۔

لاحول ولا قوۃ“ ۔ ٹکٹ کلکٹر نے منہ بنا کر کہا ۔

صرف گڑ بڑیشن اور کیا ۔ ٹیشن ماسٹر صاحب ۔ ایک بات ہے کہ کبھی وہ آتی ہے دو پر اور کبھی چار پر“ ۔ کیبن مین نے وضاحت کی ۔

”نو نو“ گارڈ اٹھ بیٹھا ۔ ”کوسچن یہ ہے ۔ کہ لوگ بھول کڑ پریم نگر ہی کیٹرڈاوڑ ہوتے ہیں ۔ عقیل پوڑ نہیں“ ۔

”خدا آپ کا بھلا کرے ۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں ۔ لوگوں کا ہے ۔ لوگوں کا“ ۔ ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا ۔

”زیٹ از اٹ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ گریِن ہے کھوبصوڑت ہے اوڑ عقیل پوڑ ریت ہی ریت ۔“

”لیکن حضرت سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کراتتی سے آتی ہے وہ سیدھی عقیل پور کیوں نہ چلی جائے ۔ رن تھرو ۔۔۔۔۔۔۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا“ ۔

”جی ہاں ، جی ہاں“ ۔ نہالچند بڑبڑایا اور پھر چونک کر بولا ۔ ”لیکن میں کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔“

”سلّی“ لیڈی ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی ۔ ”یہ بات نہیں چلے گی ۔ مینجمنٹ کے لئے صرف ایک راستہ ہے ۔ صرف ایک“ ۔

”لیکن ۔ لیکن راستے تو دو ہیں“ ۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ ”دوراہا دو راستے جی ؟“

”نانسنس“ وہ بولی ۔ ”آئی مین کراتتی سے گاڑی پہلے یہاں آئے ۔ پھر وہی گاڑی پریم نگر چلی جائے ۔ پریم نگر سے لوپ لائن عقیل پور کو چلی جائے اور یہاں سے عقیل پور کی کارڈ لائن اکھیڑ دی جائے ۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی نہ رہے گا“ ۔

”لیکن محترمہ ! یوں ہو جائے تو پھر پریم نگر جائے گا کون“ ۔ مسٹر امجد داخل ہوتے ہوئے بولے ۔

”واٹ ؟“ سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

”غلطی سے جانا اس نگر کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے سٹیشن ماسٹر صاحب!“ امجد مسکرایا ۔

”اونہوں ، اس بات سے ہمیں کوئی کنسرن نہیں مسٹر امجد ۔ مطلب ہے کہ ہم مینجمنٹ چاہتا ہے مینجمنٹ“ ۔

”لیکن صاحب سوال یہ ہے کہ جو مسافر نگر میں جانا نہیں چاہتے“ ۔ ٹکٹ کلکٹر بولا ۔

”جی ہاں ، یہی کہہ رہّا تھا میں“ ۔ نہالچند نے اپنی عینک سنواری ۔

”وہ وہاں نہ اتریں ۔ سرکار کا راج ہے مہاراج ۔ جبر دستی نہیں“ ۔ کیبن مین بولا ۔

”لاحول ولاقوۃ ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ یہ نہیں ہو سکتا“ ۔ ٹکٹ کلکٹر کا منہ لال ہوگیا ۔

”نہیں ہو سکتا تو رول نمبر ۹۲ کے مطابق وہ بریک جرنی کر سکتے ہیں ۔ گڈ ایوننگ جنٹلمین میں ذرا چائے پی آؤں“ ۔ لیڈی ٹکٹ چیکر مسٹر امجد کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی ۔

”استغفراللہ“ ۔ ٹکٹ کلکٹر نے داڑھی جھاڑ کر کہا ۔ ”کیا حماقت ہے“ ۔

”جی ہاں“ ۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ ”رول نمبر ۹۲ “ ۔ اوِن

"حضرت آپ کو لیڈی ٹکٹ چیکر کو متنبہ کرنا چاہیئے ۔ ریلوے پینڈ ہو کر وہ مسافروں کو گمراہ کرتی ہے"۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا ۔

"گمراہ کرتی ہے ؟" سٹیشن ماسٹر نے سر کھجلا کر دہرایا ۔

"جی ہاں جیسے آپ کو کمپلین کرنے والی بیگم نے کہا تھا ۔ ایل ۔ ٹی ۔ سی نے اسے غلط اطلاع دے کر بہکایا ورنہ وہ کبھی پریم نگر کیرڈ اوور نہ ہوتی"۔

"لیکن ۔ اس سے کیا ہوگا ؟" نہالچند نے عینک سنوار کر کہا ۔

"ہمارے پاس ایسے بیسوں ثبوت ہیں"۔ ٹکٹ کلکٹر بامعنی انداز سے مسکرانے لگا ۔

"اس بات پر ایل ۔ ٹی ۔ سی کو انام ملنا چاہیئے ۔ اور کیا ؟" کیبن مین بولا ۔

"جی ہاں" نہالچند بولا ۔۔۔۔۔۔ "لیکن انعام ؟"

"لاحول ولاقوۃ"۔ ٹکٹ کلکٹر نے شانے ہلاتے ہوئے کہا ۔

اس لئے کہ وہ ریلوے کی انکم جیادہ کرتی ہے"۔ کیبن مین چلایا ۔

انکم کا کیا سوال ہے یہاں"۔

"آئی سی" گارڈ بولا ۔ "ہی از رائیٹ ۔ فرض کرو ایک پسنجر غلطی سے پریم نگر جاتا ہے ۔ وہاں ہم اسے چاڑج کڑے گا ۔ تین ڑوپیہ پھڑ وہ واپس دوڑابا کو آئے گا ۔ ڈیڑھ ڑوپیہ ۔ اب اسے پھڑ نیا ٹکٹ خڑیڈنا پڑے گا ۔ دوڑابا ٹو عقیل پوڑ ۔ پڑانہ ٹکٹ نہیں چلے گا ۔ زیٹ از کل ۔ چھ روپیہ اکسس فیڑ دے گا ۔ پیئوڑ انکم" ۔

"انکم نہیں یہ دھوکا ہے ۔ مسافروں کے ساتھ دھوکا"۔ ٹکٹ کلکٹر چلایا" ۔

"جی ہاں ۔ روپیہ روپیہ ہے مہاراج ۔ دھن ہے مہاراج دھن"۔ نہالچند متاثر ہو کر بڑبڑانے لگا ۔

"لیکن پبلک کو لوٹنا ۔۔۔۔۔۔"

"پر سوال اے ہے کہ ہم پبلک پینڈ ہیں یا ریلوے ۔"

"زیٹ از اٹ ۔ زیٹ از اٹ"۔ گارڈ چلایا ۔ "ریلوے نے صاف بول دیا ہے ۔ ٹریول لائٹ"۔

"نانسنس" سٹیشن ماسٹر غصے سے چلایا ۔ "یہاں ہلکا بھاری کا سوال نہیں انکم اور خرچ کا سوال ہے ۔ ہمارا ریپوٹیشن خراب ہو رہا ہے ۔ چاہے پسنجر غلطی سے پریم نگر کیرڈ اوور ہو جائیں ۔ یا عقیل پور ۔ ہمارا کنسرن نہیں ۔ لیکن ہمارا ریپوٹیشن خراب نہ ہو ۔ اتنے بڑے جنکشن کا ریپوٹیشن خراب نہیں ہونا چاہیئے۔ آج کل سب سے بڑی کوالیفیکیشن گڈ ریپوٹیشن ہے"۔

"یہی میں کہہ رہا تھا حضرت لیڈی ٹکٹ چیکر کی ریپوٹیشن اچھی نہیں" ٹکٹ کلکٹر نے جھرجھری لی ۔

"اوڈیم اٹ ۔۔۔۔۔۔ جنٹلمین ہمیں روز شکائتیں موصول ہوتی ہیں اس کو بند ہونا چاہیئے جو پسنجر اپنی غلطی سے پریم نگر کیرڈ اوور ہو جاتا ہے وہ واپس آکر ہمارا قصور بتاتا ہے ۔ ہمیں ڈانٹتا ہے ۔ دِس از بیڈ"۔

"جی ہاں ، ویری ، ویری"۔

"یہ تو قدرتی بات ہے حضرت ۔ لوگ اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں ۔ اس میں ناظم صاحب کا کیا قصور ہے"؟

"لیکن سپرانٹنڈنٹ خود موقع پر کیوں نہیں آتا ؟ ہم نے بار بار لکھا ہے ۔ کوئی جواب نہیں ، کوئی جواب نہیں"۔

ٹررررن ۔ ٹرررررن گھنٹی بجی ۔ ۔ "اوہ ۔" سٹیشن ماسٹر نے چونک کر گھڑی دیکھی ۔ "یہ کس گاڑی کی گھنٹی ہے؟"

"جی ہاں ، یہی سوچ رہا ہوں میں"۔ نہالچند بڑبڑایا ۔

"ول"۔ گارڈ اٹھ بیٹھا ۔ یہ ٹیلیفون کال ہے"۔

"اوہ ڈیش اٹ ۔ پھر کوئی کمپلینٹ ۔ ہمارے کان پک گئے ہیں"۔ سٹیشن ماسٹر نے ٹیلیفون اٹھاتے ہوئے کہا "ہیلو ! سٹیشن ماسٹر دوراہا ۔ کون نہیں پہنچے

kitabiyat.blogspot.com

عقیل پور ؟ آپ کے ہسبنڈ ؟ ہاں شاید غلطی سے کیرڈ اوَر ہوگئے ہوں ، نہیں پریم نگر سے ان کا کوئی تار نہیں آیا ۔ کیا نام بتایا آپ نے ؟ مسٹر رے ؟ نہیں کوئی تار نہیں ۔" انہوں نے فون رکھ دیا ۔

"جی ہاں"۔ نہالچند نے ایک کاغذ پڑھتے ہوئے کہا ۔ "بالکل ٹھیک ہے ۔ مسٹر رے کا تار یہ رہا ۔ پریم نگر سے آیا تھا"۔

"اوہ"۔ سٹیشن ماسٹر گنگنانے لگے ۔ اچھا تو تم ان مسافروں کی لسٹ رکھتے ہو جو غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جاتے ہیں "۔

"لسٹ؟" نہالچند نے سر کھجلایا ۔ "لسٹ ! لیکن" ۔

"امپاسیبل"۔ گارڈ نے کش لگا کر کہا ۔ "اتنی لمبی لسٹ" ۔

"جی ہاں یہی کہہ رہا تھا میں ۔ اس کے لئے ایک الگ دفتر چاہیئے ۔

"زیٹ از اٹ ۔۔۔۔۔۔"

"سب گڑبڑیشن ہے"۔ کیبن مین چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ ٹکٹ کلکٹر بڑبڑایا اور اٹھ کر چل پڑا ۔

"ڈیش اٹ آل"۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔

"عین اس وقت پروفیسر نجمی داخل ہوئے ۔ "اے صاحب ۔ یعنی یعنی مسجرامشد کہاں ملیں گے؟"

"مسجرامٹڈ؟" نہالچند نے سر کھجاتے ہوئے غور سے پروفیسر کی طرف دیکھا ۔

"سلّی!" پروفیسر چلائے ۔ اور باہر جاتے جاتے رک گئے ۔ "آپ سٹیشن ماسٹر ہیں ؟ میرا مطلب ہے پریم نگر سے گاڑی کب آئے گی ۔ یعنی مسٹر ایس۔ ایم ۔ مطلب یہ ہے کہ فرض کرو میں غلطی سے کل عقیل پور کی بجائے پریم نگر چلا گیا تھا ۔۔۔۔۔۔"

"اوہ ۔۔۔۔۔۔" نہالچند نے سر کھجایا ۔ ۔ "جی ہاں ، جی ہاں آپ چلے گئے تھے"۔

پروفیسر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "تو مطلب ہے آج میں کون سی گاڑی سے واپس آسکوں گا؟"

گارڈ مسکرایا ۔ "لیکن شاید آپ ریٹرن کرنا پسند نہ کریں"۔

"میں ۔۔۔۔۔۔۔ کیوں نہ کروں؟"۔ پروفیسر چڑ گیا ۔

"جی ہاں ، ضرور آئیں گے آپ ، ضرور ، آپ مرد جو ہوئے "۔

"مرد ۔۔۔۔۔۔۔" پروفیسر چلایا ۔ "اور فرض کرو میں عورت ہوں"۔

"گڈ نس" سٹیشن ماسٹر ہنسا ۔

"شور"۔ گارڈ بولا ۔ "پھر تو مشکل ہے"۔

"نانسنس ۔ وہ ضرور آئے گی ۔ اُسے آنا ہی پڑے گا"۔ پروفیسر غصے میں چیخا ۔

"سوال یہ ہے کہ آپ وہ ہیں یا وہ آپ ہے"۔ نہالچند نے سر کھجلا کر اپنے آپ سے پوچھا ۔

"پریم نگر کے معاملہ میں جنڈر جانے کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔"

"جنڈر ۔۔۔۔۔۔" پروفیسر نے دہرایا ۔ "نان سنس "۔

"اوہ ۔ یعنی نان سنسیکل جنڈر"۔ نہالچند بڑبڑایا ۔ "پھر تو واقعی کچھ نہیں کہا جا سکتا آپ کے بارے میں" ۔

"مسٹر نہالچند ۔" سٹیشن ماسٹر نے گھور کر نہالچند کو چپ کرا دیا اور پھر پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔ "جنٹلمین آپ آدھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے ۔ بشرطیکہ آپ رات وہاں بسر کرنا نہ چاہیں ۔۔۔۔۔۔۔"

"میں پریم نگر میں ؟" پروفیسر غصے میں بڑبڑایا ۔ "لاحول ولاقوۃ"۔

"آخاہ پروفیسر نجمی"۔ مسٹر امجد مسکراتا ہوا داخل ہوا ۔ اور ان کا تعارف کروانے لگا ۔ آپ ہمارے ایس ۔ ایم ہیں ۔ یہ مسٹر ڈیوڈ گارڈ ، اور یہ ہیں نہالچند ۔ اور یہ صاحبان میرے عزیز دوست پروفیسر نجمی عقیل پور کالج میں نفسیات کے پروفیسر"۔

Engr. Faraz Akram
kitaabyat.blogspot.com

"گلیڈ ٹو میٹ یو پروفیسر ۔ لیکن پروفیسر یہاں اکثر ایسے کیسز ہو جاتے ہیں ۔ پسنجر غلطی سے پریم نگر ـــــــ"۔

"زیٹ از اٹ"۔ گارڈ ہنسا ۔ چیر اپ جنٹلمین"۔ اور وہ باہر چلا گیا ۔

"غلطی"۔ پروفیسر چلایا ۔ "غلطی بہانہ ہے بہانہ ۔ ایسی ویسی خواہشات پر ڈھکنا ۔ اور جو گاڑی پر اتنا بڑا بورڈ ٹنگا ہوتا ہے ـــــــ اس کا فائدہ ؟ ہوں ؟"

"جی ہاں ، بورڈ باقاعدہ لگا دیا جاتا ہے ۔ جی ہاں ـــــــ" نہالچند چلانے لگا ۔

"ہم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے"۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔ اور پھر اچھا جنٹلمین خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا ۔

"باریکیاں"۔ پروفیسر نے امجد کو گھور کر کہا ۔ "میں کہتا ہوں اس سے موٹی بات اور کیا ہوگی ۔ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور عقیل پور کی بجائے پریم نگر پہنچ کر وہاں سے تار دے دیا ۔ غلطی سے یہاں آگئی ہوں ۔ اونہہ ، میں کیا سمجھتا نہیں"۔

"تار ـــــــ ؟" نہالچند بڑبڑایا ـــــــ اور سٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا ۔

"میں نے تو تار نہیں دیا تھا"۔ امجد بولا ۔ "پچھلی اتوار کو تمہارے پاس آرہا تھا میں ۔ لیکن ـــــــ

"جی ہاں"۔ پروفیسر نے طنزاً کہا ۔ "غلطی سے پریم نگر چلے گئے ـــــــ"

"پھر میں مسٹر امین کے یہاں ٹھہر گیا"۔ امجد اپنے ہی دھیان میں کہے گیا ۔

"مسٹر امین!" پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا ۔

"تم جانتے ہو اسے ۔ وہی گورا چٹا نوجوان"۔

"ہاں گورا چٹا ۔ جانتا ہوں ۔ نہ جانے تم لوگ صاف کیوں نہیں کہتے کہ وہاں آشنائی ہے ۔ مسٹر امین!"۔

"نہیں نہیں ، مس امین کے بارے میں ایسا نہ کہو ۔ میرے دل میں اس کی بیحد عزت ہے"۔ امجد نے متاثر ہو کر کہا ۔

"مس امین ؟ مس امین کس نے کہا ہے ـــــــ ہائیں دفعتاً اسے بات سمجھ میں آگئی ؟ اوہ یہ بات ہے"۔ پروفیسر مسکرانے لگا ـــــــ "عزت" ! پروفیسر غصے میں بولا ۔ "پہلے جذبات کی ہنڈیا پر عزت کا ڈھکنا رکھ دیا ۔ تاکہ اندر کھچڑی پکتی رہے ۔ اور اوپر عزت ہی عزت نظر آئے ۔ اونہوہ ۔ عزت ۔ نانسنس ـــــــ وہ بھی یونہی کہا کرتی تھی ـــــــ" پروفیسر نقل اتارتے ہوئے بولا ۔ "میرے دل میں مسٹر امین کی بڑی عزت ہے ۔ اور اب جا کر وہاں سے تار دے دیا ـــــــ غلطی ـــــــ نانسنس"۔

"کس نے تار دے دیا ۔ کس کی بات کر رہے ہو ؟" امجد جھلا اٹھا ۔

"فیروزہ ، اپنی بیوی کی اور کس کی"۔ پروفیسر گھورنے لگا ۔

امجد نے اطمینان کا سانس لیا ۔ "میں سمجھا نہ جانے کیا ہوگیا ہے"۔

"ایک دم احمق" ـــــــ پروفیسر چلایا ۔ "اگر ایک جنٹلمین کی بیوی جو میٹرک پاس ہو ۔ اور جس کی آنکھوں پر اتنے بڑے بڑے شیشوں کی رولڈ گولڈ عینک ہو وہ گاڑی پر لکھے ہوئے دوراہا تو پریم نگر کو عقیل پور پڑھ کر اس نگر میں جا پہنچے جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے جس کے لئے بیگم کے دل میں بے حد عزت ہے ۔ تو تمہارے خیال میں کچھ ہوا ہی نہیں ۔ ایڈیٹ ۔ تم سمجھتے ہو یہ دنیا سیدھی سادی چیز ہے ۔ سرخ جھنڈی دکھا دی تو گاڑی ٹھہر گئی ۔ سبز ۔ چل پڑی ۔ یہ گاڑی نہیں بیوی کا معاملہ ہے ۔ بیوی کا ـــــــ یہ گاڑی کیا جانتی ہے جھنڈیوں کو ـــــــ کیا سمجھے ؟ ہیں"۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ یعنی اب تم مجھے گھور کر دل ٹھنڈا کر رہے ہو ۔ لیکن اس سے کیا ہوگا ۔ بیگم کا وہاں جانا تو امر واقعہ ہو چکا ۔ بلکہ اس کا واپس آ جانا تو بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہاں گئی تھی"۔

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

”یعنی اُسے آنے سے روک دوں ۔ نانسنس ۔ مسجرامٹڈ تم قطعی طور پر شادی نہ کرنا ۔ تم عورت کو نہیں سمجھتے“ ۔

”میں کیا اسے سمجھنے کے لئے بیاہوں گا ۔ میں تو اس سے جرابیں دھلواؤں گا ۔ کھانا پکواؤں گا اور ۔۔۔۔۔۔۔“

”اور اگر وہ اس نگر میں چلی گئی ۔ جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے؟“

”تو سمجھوں گا کہ وہ لوٹ آنے کو گئی ہے ۔ اوہ پروفیسر تم پریشان ہو کر اس نگر کو اور بھی اہمیت دے رہے ہو“ ۔

”بالکل ریل کا اثر ۔ حرکت ۔ موومینٹ ۔ بوہیمین بنا دیتی ہے ۔ مثلاً ٹانگہ والا ۔ کوئی ٹانگہ والا دیکھ لو ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پکنک پر آیا ہوا ہو ۔ ریل میں تو مسافر کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے ۔ غریب آدمی بھی آنے کی گنڈیریاں چوستا ہے اور چار بیویوں والے لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں ۔ سلّی ۔ اور ۔ اور ایک میٹرپکولیٹ پریم نگر ۔۔۔۔۔۔۔“

”تم تو وہمی ہو پروفیسر ۔ یہی بات ہے تو بیگم کو پردہ میں ڈال دو“ ۔

”پردہ میں ؟ اوہیونز ۔ جوانی میں تو وہ ننگے منہ پھرتی رہی اور اب برقعہ میں چھپا کر ازسرنو خوبصورت بنا دوں ۔۔۔۔۔۔ ؟ تم برقعہ کو پردہ سمجھتے ہو کیا؟“

”پردہ ہی تو ہے اور کیا“ ۔ امجد چڑ گیا ۔

”بس ریل ہی بانکنی آتی ہے ۔ یہ رنگ دار برقعے ، یہ پردہ ہیں کیا نانسنس ، جیسے رنگدار بوتلیں چل پھر رہی ہوں ۔ ہر کوئی دور سے بتا سکتا ہے یہاں ابھار ہے ۔ یہاں ڈھلان ۔ ہونہہ ، پردہ ! مسجرامٹڈ بس شادی نہ کرنا بڑے سکھی رہو گے“ ۔

”لیکن نجمی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات ۔ آج سے پانچ سال پہلے ۔

”اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پیاری ہوتی ہیں نا“ ۔

”فیروزہ میری کمزوری ہے“ ۔

”پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی ۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر گئی ہے اور بھی پیاری ہوگئی ہے ۔ اس کمرے میں یوں سرگرداں پھر رہے ہو جیسے یہ صحرا ہو“ ۔

”کیا کہا؟“ پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا ۔ ”نانسنس ، یعنی تمہارے نزدیک ٹہلنا محبت کی دلیل ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ڈیش اٹ ۔۔۔۔۔۔۔“ وہ جھنجھلایا ”کیا بے معنی کرسی ہے“ ۔

”آرام کرسی جو ہوئی“ ۔ امجد مسکرایا ۔

”ہائیں؟“ پروفیسر جھلا کر بولا ۔

”میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لئے بامعنی ہے ۔ جو آرام کرنا چاہتا ہو“ ۔

ٹرررن ۔ ٹرررن ۔ گھنٹی بجی ۔ پروفیسر گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ یہ ”کیسی گھنٹی ہے؟“

”گھبرائیے نہیں“ ۔ سٹیشن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا ۔ ”دو منٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے ۔“

”اوہ“ پروفیسر چونکا ۔ ”تو میں ریسیو کر آؤں ۔ امجد تم چائے منگوا لو ۔ اتنی دور سے آرہی ہے ۔ اتنی دور سے ۔“

”جی ہاں ۔۔۔۔۔۔ ہیں؟“ نہالچند رک گیا ۔ ”یعنی اپنے آپ کو ریسیو کرنے جا رہے ہیں ۔

”نانسنس“ ۔ وہ گھورنے لگا ۔ ”بیگم کو ۔ بیگم کو ۔“

”اوہ“ نہالچند نے آہ بھری ۔

”سوری کیٹ از آؤٹ آف دی بیگ“ ۔ گارڈ دروازے سے چلایا ۔ ”صاحب وفادار بیوی سے عمر بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔“

”کیوں ------ ؟“ امجد نے پوچھا ۔

”وہ خود بھی بیٹھ رہتا ہے ۔ کھاونڈ کو بھی بٹھا رکھتا ہے ۔ کبھی اس کا ویٹنگ روم میں انتظار کرنا تازگی دیتا ہے تازگی“۔ وہ ہنسا ۔

”آپ کا مطلب ہے پروفیسر یہاں بیٹھے تازگی پیدا کر رہے تھے ۔ ان کی تازگی نے تو گھنٹہ بھر سے مجھے باسی بنا رکھا ہے“۔ امجد نے شانے ہلائے ۔

”تازگی اور جوش ایک ہی بات ہے ۔ پانی کھڑا رہے تو گندا ہو جاتا ہے“۔

بوائے کو چائے اور پیسٹری لاتے دیکھ کر ۔ سٹیشن ماسٹر بولا ۔

”اوہ یہ دعوت“ ------ یہ کیا پریم نگر آنے کی رشوت ہے“۔

Engr. Fayyaz Akram

پروفیسر صاحب نے آڈر دیا ہے ۔ جناب کینٹین کا لڑکا بولا ۔

”پرہیپس وہاں جانے کا ریوارڈ“۔ گارڈ ہنسا ۔

”جی ہاں“۔ نہالچند چلایا ۔ ”نہ جاتی تو آتی کیسے؟“

”اُف ۔ پروفیسر نے کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے ۔ ایک معمولی شہر کو خواہ مخواہ اہم بنا رکھا ہے ۔ میز پر رکھ دو بوائے“۔

”گھبرا گئے مسٹر امجد ۔ اچھا تو آؤ چلیں ۔ وہ ابھی یہاں آئیں گے ، بیچارے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر کے بعد لڑائی جھگڑے کی دلچسپی نصیب ہوئی ہے ۔

”زیٹ از اٹ“ گارڈ ہنسا ۔ ”میں پرپوز کرتا ہوں کہ ایوری ناؤ اینڈ ون ہر وائف کو نگر کا ایک ٹرپ ضرور لگانا چاہیئے ۔ آئی مین ، بائی مسٹیک کیرڈ اور ہو جانا چاہیئے ۔ لٹ اس موو آن“۔

ان کے جانے کے بعد جلد ہی پروفیسر اور فیروزہ داخل ہوئے ۔

”اوہ“ پروفیسر چلایا ۔ ”سب چلے گئے ---- مگر یہ چائے“۔

”میرا تو پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے“۔ فیروزہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ۔

”ہوں ۔ کسی ہوٹل میں ٹھہری تھی کیا ؟“ پروفیسر نے پیالہ بناتے ہوئے پوچھا ۔

”آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل بازی سے نفرت ہے ۔ مسٹر امین کی بیوی ------“

”اوہ تو مسٹر امین بازی کرتی آتی ہیں آپ ؟“

”میں تو پہلے ہی کوفت سے چور ہوں لیکن آپ ------“

”کوفت ؟ تم تو بنگلہ میں آرام کرتی رہیں ۔ مصیبت تو میرے لئے تھی ۔ جو دوراہے کا پلیٹ فارم ناپتا رہا“۔

”بس جی یہ آپ کی کتابی نفسیات نہیں چلے گی“

”بس کتاب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ۔ اور نام کو آپ ہیں فیروزہ میٹریکولیٹ“۔

”مجھے میٹریکولیٹ نہ کہا کریں آپ“۔ وہ غصے میں چلائی ۔

”تو اور کیا گریجوایٹ کہوں ؟“

”میں آپ کا لکچر روم نہیں ہوں ۔ خواہ مخواہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنا ---------“

”آج کل کی گاڑیاں تو آپ چلنے کے لئے بیتاب ہیں ۔ دیکھ لیجئے گاڑی تو پریم نگر جا پہنچی اور بیچارہ گھوڑا دوراہا ناپتا رہا“۔

”تو یہ قصور کس کا ہے ؟ وہ مسکرائی ۔

”گھوڑے کا ، اور کس کا ۔ دوسرا پیالہ بناؤں“۔

”بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اب -------“ اس نے ترچھی نظر سے گھور کر لاڈ سے کہا ۔

”کیا ------ میری قلعی ؟“

”جی ہاں ، بہت بنا کرتے تھے ۔ میں ۔ میں مس امین کو نہیں جانتا“۔

وہ نقل اتارتے ہوئے بولی ۔

"نہیں نہیں ۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں"۔ پروفیسر پریشانی سے بولا ۔

"جی ہاں اندھیرے میں ملی ہوگی نا"۔ وہ اور بھی سنجیدہ ہوگئی ۔

"لاحول ولاقوۃ – آخر بات کیا ہے ؟"

"بات کیا ہونی تھی ۔ بس وہی ایک بات ۔ بات بات پر پوچھتی تھی ۔ مسٹر نجمی کو کیوں نہ لائیں آپ ۔ مسٹر نجمی کو ضرور لائیے گا آپ ۔ میں ان کے افسانوں کو بہت اڈمائیر کرتی ہوں ۔ ہونہہ ، بڑی اڈمائیرر"۔

"لاحول ولاقوۃ"۔ پروفیسر نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا ۔

"اونہوں ۔ یہ شیطان لاحول پڑھنے سے نہ جائے گا"۔ وہ بولی ۔

"لیکن فیروزہ ۔۔۔۔۔"

"اور پھر ۔۔۔۔۔۔۔ آپ بڑی خوش قسمت ہیں مسز نجمی ۔ آپ ایسے قابل رائٹر کی بیوی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ سر کھا لیا میرا چڑیل نے"۔

"اوہ" پروفیسر مسکرائے ۔ "عجیب معاملہ ہے"۔

کمرے میں چار ایک آدمی آگئے ۔ اور وہ دونوں چپ ہوگئے ۔

"کیا مصیبت ہے"۔ پگڑی والے پٹھان نے دستانے اتارتے ہوئے کہا ۔ "پریم نگر ، خاک نگر ، وہاں تو دھول اڑتی ہے دھول"۔

"آپ پریم نگر سے آئے ہیں"۔ نوجوان نے پوچھا ۔

"جانا تو نہیں تھا لیکن جا پہنچا ۔ پھر وہی ٹائیں ٹائیں فش ۔ سنا تھا بڑا اچھا شہر ہے ۔ لیکن خاک ۔ بس عورتیں ہی عورتیں ہیں"۔

"اچھا جی"۔ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ "عورتیں"۔

"اور مرد ۔ اکا دکا مرد ۔ بوکھلایا ہوا ۔ جیسے شیش محل میں جاٹ"۔

"اچھا جی"۔ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ "سب عورتیں"۔

"تیسری میز پر بیٹھا ہوا سردار بولا"۔ بس جی پریم نگر کو جانے والی گاڑی کی صرف ایک پہچان ہے صرف ایک"۔

"وہ کیا" بنگالی بابو نے بیڑی کو سلگاتے ہوئے شوق سے پوچھا ۔

"آپ پریم نگر نہیں جانا چاہتے نا ؟"

"اونہوں"۔ بنگالی بابو نے سر ہلایا ۔ "بالکل نہیں ۔ آپ اطمینان رکھیں ۔ بالکول نہیں"۔

"تو صاحب اس گاڑی پر نہ بیٹھیں ۔ جس کے ساتھ دو انجن لگے ہوں ۔ ایک آگے ایک پیچھے"۔

"دو انجن ۔ ایک آگے ایک پیچھے"۔ بنگالی نے یوں دہرایا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو ۔

"پہاڑی علاقہ ہے نا ۔ ایک انجن سے کام نہیں چلتا"۔ سردار بولا ۔

"پہاڑی علاقہ"۔ بنگالی بابو نے دہرایا ۔ "ہلز ۔۔۔۔"

"کان کھول کر سن لو بیگم"۔ پروفیسر نے جھک کر فیروزہ کے کان میں کہا ۔ "دو انجن ۔ آخر تمہیں کئی بار کراتشی سے عقیل پور آنا ہوگا"۔

ٹرررررں ۔ ٹرررررں گھنٹی کی آواز آئی ۔ اور وہ سب اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی باہر نکل گئے ۔

"بس ایک پیالہ اور ۔ تھینک یو"۔ فیروزہ بولی ۔

"لیکن گاڑی"۔ پروفیسر بڑبڑایا ۔

"ابھی بہت وقت ہے ۔ ۵ منٹ رکے گی گاڑی یہاں"۔ وہ کرائی ۔

"سٹیشن ماسٹر صاحب ۔ سٹیشن ماسٹر صاحب"۔ نہالچند گھبرایا ہوا داخل ہوا ۔ "اوہ یہاں نہیں نہیں ۔"

"وٹ از دی ٹربل"۔ گارڈ دروازے میں کھڑا ہو کر غور سے نہالچند کو دیکھنے لگا ۔

"سپرانٹنڈنٹ ۔ سپرانٹنڈنٹ"۔ نہالچند چلّایا ۔ "جی ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ وہ آئے ہیں"۔

"کیا کہا ؟" سٹیشن ماسٹر نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا ۔

"جی ہاں ۔ وہ آئے ہیں ۔ ۳۲ ڈاؤن میں ۔ سپرانٹنڈنٹ"۔

"گڈ لارڈ"۔

"میں ان سے ملوں گا"۔ پروفیسر اٹھ بیٹھا ۔ "میں انہیں یقین دلاؤں گا ۔ کہ انتظام میں خرابی ہے ۔ اور پسنجر کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی ہے"۔

"اونہوں ۔ وہ نہ مل سکیں گے ۔ ہونہوں ۔ بہت گڑبڑیشن ہے"۔ کیبن مین نے داخل ہو کر کہا ۔ سیلون کا دروازہ بند ہے ۔

Engr. Fayaz Akram

"نانسنس" سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"جی ہاں ، جی ہاں ،" نہالچند بڑبڑایا ۔ "وہی نانسنس"۔

"یہ نہیں ہو سکتا"۔ ٹکٹ کلکٹر بھاگا بھاگا آیا ۔ "ضرور کوئی غلط فہمی ہے"۔

"ڈیش اٹ بات کیا ہے ؟" سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا ۔

"حضرت آرڈر یہ ہے کہ ان کی سیلون عقیل پور کو جانے والی گاڑی سے لگا دی جائے"۔

"جی ہاں"۔ نہالچند بولا ۔ "عقیل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے ۔ آپ نے سنا"۔ امجد نے داخل ہو کر کہا ۔ "لیڈی ٹکٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنا دیا گیا ہے"۔

"نانسنس"۔ سٹیشن ماسٹر چلایا ۔

"ابھی سپرانٹنڈنٹ صاحب کا حکم ملا ہے ابھی ۔ ایل ۔ ٹی ۔ سی ۔ ابھی بوگی میں ہے"۔ ٹکٹ کلکٹر چلایا ۔

"کون سی بوگی میں ؟" سٹیشن ماسٹر نے پوچھا ۔

"جی ہاں"۔ نہالچند بولا ۔ "سپرانٹنڈنٹ کی بوگی میں"۔

"بیونز ۔" پروفیسر چلایا ۔ "بیگم تم چلو میں ابھی آیا ۔" مسٹر امجد فیروزہ کو لے چلئے"۔

"شوق سے"۔ امجد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا ۔ "جلدی آنا پروفیسر گاڑی چلنے والی ہے"۔

"زیٹ از آل ویری سٹرینج"۔ گارڈ ہنسا ۔

"ول ول" سٹیشن ماسٹر بولا ۔ "مسٹر کیبن مین ان کی بوگی عقیل پور سے لگانے کا انتظام کرو ۔۔۔۔۔۔۔ اچھا تو گڈ بائی پروفیسر"۔ وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا ۔

"رائیٹ" ۔۔۔۔۔۔ پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ۔ "سولانگ جنٹلمین سولانگ" اور وہ دو انجن دو انجن بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا ۔

"پروفیسر کہاں ہے سٹیشن ماسٹر صاحب"۔ امجد دوڑتا ہوا آیا ۔ "وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور ان کا پتہ نہیں"۔

"پروفیسر تو چلا گیا"۔ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ۔

"جی ہاں ۔ میں نے خود دیکھا ہے ۔ خود"۔

"کہاں"۔ امجد چلایا ۔ "لو عقیل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی"۔ امجد نے کوک سنکر کہا ۔

"پریم نگر کی گاڑی میں ۔ جی ہاں ، دو انجن ، دو انجن کہتے ہوئے وہ اندر جا بیٹھے تھے"۔

"لاحول ولاقوۃ ۔ کیا مصیبت ہے ۔ اب بیگم عقیل پور جا پہنچے گی ۔ اور میاں پریم نگر" امجد ہنسنے لگا ۔

"ڈیش اٹ آل"۔ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا ۔

"بالکل گڑبڑیشن ہے سٹیشن ماسٹر صاحب ۔۔۔۔۔۔" کیبن مین بھاگتا

ہوا آیا -------۔ "وہ بوگی"۔

"خدا خبر کس نے غلط کانٹا موڑ دیا اور --------- اور -------"

"وہ بوگی پریم نگر والی تھری اپ سے لگ گئی"۔

"گڈ لارڈ"۔ سٹیشن ماسٹر چلایا۔ اب کیا ہوگا؟"

"اب، جی" نہالچند بڑبڑانے لگا۔ "یعنی میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مرد ہے تو واپس یہاں آجائے گا۔ اور اگر عورت ہے تو -------"

"وہ کون؟" امجد نے پوچھا۔

"سپرانٹنڈنٹ -------۔ جی ہاں سپرانٹنڈنٹ"۔ نہالچند بولا۔

"شٹ اپ"۔ سٹیشن ماسٹر چیخ کر بولا۔ نانسنس

"جی ہاں -------۔ یہی کہہ رہا تھا میں -------۔ نانسنس ہے پھر تو شٹ اپ۔ مطلب ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا -------!"۔

پریم نگر

شاید آپ نے پہلے بھی پریم نگر کی کہانی سنی ہو، کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ آپ اسے بار بار سننا پسند کریں گے۔ یہی اس نگر کا جادو ہے۔ بڑا جادو ہے اس نگر کا۔ آپ کی آنکھیں کٹورہ سی کھل جاتی ہیں، اٹھ بیٹھتے ہیں۔ "ہوں۔ پھر کیا ہوا۔" واقعی اس نگر پر جادو کا اثر ہے۔ اس بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہیں۔ لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا وہ سادھو نگر کے باشیوں سے ناراض ہو کر سراپ دے گیا تھا۔ اس لئے وہ اندھے ہو گئے۔ یا خوش ہو کر آشیرباد دے گیا تھا۔ "جیو۔" اور وہ جینے لگے جب ہی سے وہاں کا سبزہ اور بھی مخملی ہوگیا۔ پھول مہک اور رنگ سے اور بھی لد گئے۔ ٹہنیوں نے بال کھول کر خوشی کے مارے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے تلے چشمے خوشی سے ٹپ ٹپ رونے لگے۔ اور ان پر بیٹھ کر کوئل نے پی کو بلانا شروع کر دیا۔ اور پگڈنڈیاں دوڑ دوڑ کر نگر کو آنکلیں۔ اور آسمان نے بڑھ کر اسے ستاروں بھرے نیلے دامن میں چھپا لیا۔ کہ فرشتوں کی عبادت میں خلل نہ پڑ جائے۔ چاہے یہ بات سچی ہو یا وہ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال جادو نگری ہے وہ -------!

ذونو اس نگر کا باشی تھا۔ اس کا گھر ایک چشمے کے کنارے تھا۔ جو ہر سمے ٹپ ٹپ رویا کرتا۔ جس پر ٹہنیاں بال جھٹکائے سوگ مناتیں۔ جن پر کوئل بیٹھ کر "نزی۔ زی۔ نز۔ زی" کوکتی۔ ذونو پڑے پڑے ان کی آوازیں سنتا۔ کروٹ بدلتا۔ ٹھنڈی آہ بھرتا۔ اور پھر سننے لگتا۔ ذونو کو نزی سے محبت تھی۔ وہ دن بھر شعر گنگناتا ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ اور دنیا کی ساری چیزوں کو فانی سمجھنے میں وقت کاٹتا۔ رات کو کروٹیں بدلتا۔ اور سوچتا۔ اب وہ بیٹھی ہوگی۔ بال کھلے ہوں گے، ہونٹ کھلے ہوں گے۔ اف، وہ گھور کالی آنکھیں

اف ۔۔۔۔۔ ! حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ جاتی ۔ اور وہ لگی آنکھ دیکھنے لگتی ۔ کھلے بال کِھلے ہونٹ ، گھور کالی آنکھیں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تصویر کھو جاتی ۔ وہ تڑپ کر اِدھر دیکھتا ۔ چشمہ ٹپ ٹپ روتا ۔ ٹہنیاں لٹک لٹک کر فریاد کر رہی ہوتیں دور گھاٹی میں ہوا کراہتی اور کوئل بلا بلا کر جتاتی ۔ کہ وہ نہ آئے گی ۔ نہ آئے وہ ۔ کتنی محبت تھی اسے نزّی سے لیکن نزّی کو اس سے محبت نہ تھی ۔ چھٹپنے ہی میں وہ آجو سے کھیلا کرتی تھی ۔ اور کھیل ہی کھیل میں وہ آجو کی ہوگئی تھی ۔ جب اسے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کسی کی ہو چکی ہے ۔ بیچاری ۔ اب کیا کرتی وہ ۔ اس لئے اس نے آجو کو اپنا لیا ۔ لیکن اسے اپنا نہ بنا سکی ۔ اور آجو نگر چھوڑ کر شہر چلا گیا ، اور وہاں سے "ایٹی کیٹ" پسند کرنا سیکھ آیا ۔ اور اسے ایٹی کیٹ اتنا بھایا ۔ کہ نزّی اور اس کے کھیل دل سے اتر گئے ۔ نزّی کو تو ذرا ایٹی کیٹ نہ آتا تھا ۔ لیکن مس فلّی کیا تھی گویا ایٹی کیٹ میں جان پڑی ہوئی تھی ۔ آجو اسے دیکھ کر جیتا اور مرجانے کی آرزو کرتا ۔ اس میں کوئی ہرج نہ تھا ۔ اس لئے آجو کے گھر والے آجو پر نگاہ نہ رکھتے تھے کیونکہ مرجانے کی آرزو کرنے کے لئے جیتے رہنا ضروری ٹھہرا ۔ اس لئے وہ اس کی رکھوالی نہ کرتے تھے ۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ جیتا رہے عمر دراز ہو ۔ آپ جانتے ہیں گھر والے بیری نہیں ہوتے ۔

آجو فلّی کو ماڈل گرل سمجھتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مس فلّی کو اس بات کا ذرا لحاظ نہ تھا کہ آجو اسے کیا سمجھتا ہے ۔ پڑا سمجھے ! ۔ سمجھے نہ سمجھے !! بات یوں تھی ۔ کہ ہر ماڈل گرل کی طرح اسے بھی ماڈرن گرل بننے کا شوق تھا ۔ اور ماڈرن گرل بننے کا شوق نہ جانے کیا کیا بننے کا شوق ہوتا ہے ۔ فی الحال فلّی کو وائلن بجانے کا شوق تھا ۔ اس لئے وہ وائلن بجاتی رہتی ۔ لیکن وہ بجتی نہ تھی ۔ جبھی تو وہ اور بھی شدت کے ساتھ بجاتی تھی ۔

وائلن کے سُر وادی میں گونجتے ۔ آجو کے دل پر تیر سا لگتا ۔ اور وہ لحاف میں منہ ڈال کر "آئی لو یو" گنگناتا ۔ اور نزّی چھم چھم روتی ۔ اور ذونو آہ بھرتا اور کروٹ بدلتا اور جنگل کے درخت سر لٹکا لٹکا کر سنتے ۔ اور پھر ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرتے ۔ اور چشمے دبے دبے پاؤں آکر انہیں دیکھتے

اور سرک جاتے ۔ دیکھتے اور سرک جاتے ۔ ان کی باتوں کو دیکھ کر کوئل اونچی ٹہنیوں پر بیٹھ کر بتا دینے کی دھمکی دیتی ۔ لیکن کوئل کی بات کون سنتا ہے ۔ لوگ تو پیہو پیہو سنتے ہیں اور پیہو تو دردِ دل دھمکی نہیں ۔

یہ سب پریم نگر کے باشی تھے ۔ ذونو ۔ نزّی ۔ آجو ۔ فلّی اس کی وائلن ، درخت چشمے اور کوئل ۔

ان کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے تھے وہاں نگر میں ۔ مثلاً ذونو کی منگیتر دینا تھی ۔ جسے نگر کی وینس سمجھا جاتا تھا ۔ ایسی حسین تھی وہ ۔ اس کا حسن دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بیراگی ہو جائیں ۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سب کچھ تو چھوٹ جاتا تھا پر دینا نہ چھوڑی جا سکتی تھی ۔ مگر وہ ظالم تو آپ سبھی کچھ تھی ۔ بلکہ سبھی کچھ اسی سے تھا ۔ اور وہ آپ اس سے بھی زیادہ ۔ ایسا حسن تھا اس کا اداس اداس رویا رویا اور وہ آپ چپ چپ سی تھی ۔ نہ جانے وہ سب کی پیاری ہونے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی ۔ یا چپ ہونے کی وجہ سے پیاری ۔ بہر حال نگر کے سبھی لوگ اسے چاہتے تھے ۔

کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کسے چاہتی ہے کچھ لوگ کہتے وہ کسی کو نہیں چاہتی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جوان لڑکی ہو اور کسی کو نہ چاہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسے چپ کیوں لگی تھی ۔ اور وہ روئی روئی سی کیوں تھی ۔ کوئی کہتا اسے ذونو سے محبت ہے ۔ جبھی تو اس نے ذونو کے گھر کے سامنے گھر بنوایا ہے ۔ اور ذونو کی کھڑکی کے سامنے کھڑکی رکھی ہے ۔ کوئی کہتا ۔ اونہوں محبت نہیں اسے تو صرف یہ چڑ ہے کہ جب نگر کے سب جوان اسے دیکھ دیکھ کر دیوانے ہوئے جا رہے ہیں ۔ تو بھلا ذونو کیوں بالا بالا رہتا ہے ۔ بہر حال چاہے اسے ذونو سے محبت تھی یا نہ تھی ۔ نگر کے جوان واقعی دینی کی محبت میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے ۔ اور اس قدر دیوانے کہ دینا کی بات بات کا ہوش تھا انہیں ۔ اب کھڑکی میں بیٹھی ہے ۔ اب سیر کے لئے تیار ہو رہی ہے ۔ اب سبز سوٹ پہنا جا رہا ہے ۔ اف ۔ وہ سبز سبز کونپلوں میں دودھیا سا پھول ۔ شبنم سے بھیگا بھیگا سا ۔ اف ۔ وہ گلیوں میں نکل جاتے ۔ اور دینا کے گیت گاتے پھرتے ۔ اور بالآخر

کھاڑی میں جا کر مرلی بجا بجا کر دردِ دل کا اظہار کرتے ۔ اگرچہ مرلی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر سناتی ۔ لیکن کون جانتا تھا ۔ کہ وہ سنا جاتا تھا یا نہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ دردِ دل کا اظہار جبھی ہوتا ہے ۔ جب کوئی اسے سنے ۔ چاہے سن کر مسکرا ہی کیوں نہ دے "ہونہہ" ۔ یہ ہونہہ تو اور بھی اچھا رہتا ہے ۔ اتنا تو پتہ چل جاتا ہے ۔ کہ بات پہنچ گئی ان تک ، لیکن دینا کو تو چپ لگی تھی ۔ اگر وہ ہنسنا شروع کر دیتی تو شاید کھاڑی میں درد دل کا اظہار ہی نہ ہوتا ۔ اور مرلی رونے کی بجائے گانا شروع کر دیتی ۔ لیکن انجانی باتیں کون جان سکتا ہے ۔

بہر حال یہ تو سبھی جانتے تھے ۔ کہ ہر کوئی چاہتا تھا ۔ کہ دینا اسے چاہے ۔ اور ہر کوئی ذونو کی خوش قسمتی پر جلتا تھا ۔

لیکن ذونو اپنی بد قسمتی پر روتا تھا ۔

جب اس نے سنا کہ دینا اسے اس قدر چاہتی ہے ۔ تو اسے اور بھی دکھ ہوا ۔ کہ نزّی اسے کیوں نہیں چاہتی ۔ اور نزّی کو اپنی محبت کی شدت جتانے کے لئے اس پر لازم ہوگیا کہ وہ دینا کی چاہت کو نزّی کی محبت پر قربان کر دے جس قدر وہ قربانی کرتا اسی قدر اسے نزّی پر گلہ بڑھ جاتا ۔ نزّی کی بے وفائی اس میں اور بھی وفا پیدا کر دیتی ۔ اور اس کی وفا سے نزّی اور بھی چڑ جاتی ۔ لاپروا ہو جاتی ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وفا جبھی قابلِ قدر ہوتی ہے ۔ جب وہ دوسرے کی بے وفائی کے باوجود قائم رہے ۔ تو ذونو نزّی سے اور بھی محبت کرنے لگا ۔ اور دینا سے اور بھی بالا بالا رہنے لگا ۔ اور دینا اس بات پر اور بھی چڑنے لگی ۔ اور نگر کے نوجوان کے اظہار دردِ دل میں اور بھی درد بڑھا ۔ اور مرلی کے بین اور بھی لمبے ہوتے گئے ۔

جس روز دینا سے ذونو کی منگنی ہوئی اس دن وہ کھاڑی میں بیٹھ کر اس قدر رویا اس قدر رویا کہ گھگی بندھ گئی ۔ پھر اپنے دوست منجو کے شانے پر سر رکھ کر بولا ۔ "ہائے منجو اب کیا ہوگا" ۔ منجو نے دلاسا دیا بولا ۔ "ہوگا کیا ۔ بیاہ ہوگا" ۔ "لیکن منجو" ذونو بولا میں تو جیتے جی مر جاؤں گا ۔ نہیں نہیں منجو یہ کبھی نہ ہوگا ۔ میں دینا کی زندگی کو تباہ نہ ہونے دوں گا ۔ بیچاری دینا ۔ "لیکن ذونو" ۔ منجو نے کہا ۔ "دینا کو تم سے اتنی محبت ہے" ۔ "یہ اس کا پاگل پنا ہے منجو" ۔ ذونو چیخنے لگا ۔ میں نزّی کا ہو چکا ہوں ۔ چاہے وہ جانے نہ جانے منجو ۔ کاش کہ وہ جانتی منجو ۔ کاش !!! پھر جانتے کا کیا فائدہ جب میں نہ رہا ۔ منجو" ۔ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ "ذونو" منجو بولا ۔ "کیا دینا سے بیاہ کرنے سے انکار کر دو گے" ۔ اف ۔ یہی تو میں سوچتا ہوں منجو ۔ کتنی بدنامی ہوگی میری نزّی کی ۔ اف ۔ نہیں نہیں میں دینا سے بیاہ نہ کروں گا ۔ میں بیاہ کروں گا ہی نہیں مجھے برباد رہنا ہی راس ہے ۔ منجو "لیکن"۔۔۔۔۔۔ منجو نے کچھ کہنا چاہا ۔ لیکن ذونّو نے اسے کاٹ دیا" ۔ میں مجبور ہوں ۔ ذونّو میں مجبور ہوں ۔ اور وہ زار زار رونے لگا ۔

نزّی کو پتہ نہ تھا کہ ذونو اتنا مجبور ہو چکا ہے اور یوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہا ہے ۔ شاید وہ جانتی بھی ہو لیکن جاننا چاہتی نہ ہو ۔ اس لئے ان جانا کر دیتی ہو ۔ کون جانتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے ۔ بہر حال کیسی بری تھی وہ سارا قصور نزّی کا تھا ۔

نزّی سے کوئی پوچھتا تو ایسا معلوم ہوتا ۔ جیسے سب ذونّو کی غلطی تھی ۔ اسے نزّی سے محبت نہیں کرنا چاہئے تھا ۔ چونکہ چھٹپنے میں وہ آپ نزّی کے رقعے آجو تک پہنچایا کرتا تھا ۔ وہ خوب جانتا تھا ۔ کہ وہ آجو کی ہو چکی ہے ۔ اگر نزّی سے محبت کرنی ہی تھی ۔ تو اتنی دیر کیوں لگائی اس بات میں اگر شروع شروع میں نزّی کو محبت جتا دیتا یا کم از کم آپ ہی جان لیتا ۔ اس بات کو تو بات نہ بگڑتی ، اور کچھ نہ کرتا تو کم از کم رقعہ لے جانے سے ہی انکار کر دیتا ۔

پتھر کا دل ہو تو کوئی ذونّو سے اس بارے میں بات کرے ۔ وہ ایک آہ مار کر آپ کی طرف یوں دیکھے گا ۔ کہ آپ کا دل خون ہو کر بہہ جائے گا ۔ اور جی چاہے گا ۔ کہ اس کے گلے لگ کر رو دیں ۔ اور آپ معاً سمجھ جائیں گے ۔ کہ وہ نزّی کا رقعہ کیوں نہ آجو کے پاس لے جاتا ۔ جبکہ اس کی خوشی نزّی کی خوشی سے وابستہ تھی اور وہ کیسے جانتا کہ اسے کیا ہے ۔ یہ بات بھی جانی جاتی ہے کیا ۔ یہ تو انجانے میں آ کر روئیں ، روئیں میں بس جاتی ہے ۔ اور بس پھر

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

ہوش آتا ہے ۔ جب ہوش نہیں رہتا ۔ اور جان بھی لیتا تو کیسے کہتا نزی سے ۔ جب جان لو تو کہنے کو زبان بھی ملے ۔ اور زبان مل بھی جائے تو کیا وہ دل سے جڑی ہوتی ہے ۔ اونہوں ۔ کہاں دل منہ کہاں دونوں کا میل بھی ہو ۔ پھر جب آپ رو رو کر تھک جائیں گے تو اسے تسکین دینے کی خاطر بات بدلنا چاہیں گے ۔ مگر آنسوؤں کے روبرو بات بدلنا ، آخر آپ دل والے ٹھہرے ۔ پھر آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا ۔ کہ کیا کریں ۔ اور آپ کسی بہتر صورت کو نہ جانتے ہوئے ازسرنو اسے گلے لگا کر رو پڑیں گے ۔ اور نزی کو گالیاں دینے لگیں گے ۔ گالی دینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے ۔ آخر ہر کسی کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی نزی سے واسطہ پڑتا ہی ہے ۔ آپ کا دل بھی ٹھنڈا ہو جائے گا ۔ چاہے وہ پھر سے گرم ہونے کے لئے ہی ٹھنڈا ہو ۔ آخر اس بے ثبات دنیا میں دل کے ٹھنڈے اور گرم ہونے کے علاوہ کس بات کو ثبات ہے ۔

ادھر نزّی اس بات پر روتی کہ آجو نے کس کے لئے سب کچھ بھلا دیا ------- وہ بالپن کے کھیل --------- جب وہ خوشی خوشی دولھا بنتا تھا ۔ اور وہ شرما شرما جاتی تھی ۔ اور پھر منہ بنا کر رخ بدل کر کھڑی ہو جاتی ۔ نا بھئی ہم نہیں کھیلیں گے ۔ تاکہ وہ منائے تو مان جائے ۔ کس کی خاطر سب کچھ بھلا دیا ------- اس کے لئے ------ اللہ ماری جو سارا سارا دن سارنگی چھاتی سے لگا ۔ ”آئی لَو یُو“۔ چلّاتی رہتی ہے بے حیا کہیں کی ۔ محبت نہ ہوئی اشتہار ہوا ۔ نہ جانے کیا سمجھا ہوا ہے اس نے ۔ آخر ایک نہ ایک دن وہ سمجھیں گے ہی آجو کو سمجھاتا کون ۔ سمجھاتا بھی تو کیا سمجھا دیتا اسے ۔ جو آپ ہی نہ سمجھے تو کون سمجھائے ۔

آجو کو دکھ تھا تو صرف یہ کہ فلّی سمجھتی نہیں ۔ بھلا دردِ دل کے بغیر نغمہ پیدا ہوا ہے کبھی ۔ اور دردِ دل محبت کے بغیر ------ کبھی سنا ہے ۔ ہو بھی جائے پیدا تو کیا وہ محبت پیدا کرے گا ۔ لیکن ہر ماڈرن گرل کی طرح فلّی سمجھتی کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے ۔ ایک دن وہ بولی ۔ ”جیون ناؤ میں پریم لاد کر پتوار پھینک دینا ۔ اونہوں ۔ مسٹر آجو یہ بات نہیں چلے گی“۔ آجو بولا ۔

”مس فلّی جب کنارا ہی پرے سرکتا جائے پرے سرکتا جائے تو پتوار کس کام کے“۔ فلّی بولی ۔ مسٹر آجو جب ہر موج کنارا ہو جائے اور ڈوبنا منزل تو خواہ مخواہ ساحل کو بدنام کرتے پھرنا“۔ ”بدنام“۔ آجو مسکرا دیا ۔ ”مس فلّی کیا دیوی پجاری کے سجدوں سے بدنام ہوتی ہے ۔ ”دیوی“۔ وہ طنز سے مسکرائی ۔ ”دیوی کا کیا ہے ۔ پتھر سے بنی ہوئی دیوی“۔ ”ہاں“ وہ گنگنایا ۔ ”پتھر سے نہ بنی ہوتی تو ایسی سنگدل نہ ہوتی“۔ ”مسٹر“ آجو فلّی تڑپ کر مڑی ۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں چپ ہوگئی ۔ دراصل اسے آجو کی باتیں پسند نہ تھیں ۔ کیسی عام باتیں تھیں اس کی ۔ اور آجو کی نگاہیں اف وہ نگاہیں ۔ یوں منڈلائی تھیں ۔ دھنس جاتی تھیں توبہ ! جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ۔ ایسا مشکل ہو جاتا کہ پھر جان چھڑانے کو جی نہ چاہتا ۔ بلکہ جی چاہتا کہ دیکھتا ہے تو پڑا دیکھے اور جی چاہتا کہ اسے اور دکھائیں ۔ اور دکھائیں ۔ خدا نخواستہ اگر وہ دیکھنا بند کر دیتا تو کیا ہوتا ۔ بہر حال بڑی ہی عام نگاہیں تھیں اس کی ۔ آجو منت سے چلایا ۔ ”مس فلّی ۔ خدا کے لئے ۔ خدا کے لئے مس فلّی ۔ مس فلّی یوں نہ تڑپاؤ ۔ یوں مر مر کر جینا مس فلّی“۔ نہ جانے کیا ہوا ۔ ایک خوشی کی لہر دوڑی ۔ مس فلّی کو گویا کسی مضراب نے چھیڑ دیا اور چھیڑنے کے لئے وہ چمک کر بولی ۔ ”ہم نے تو کسی کو مرتے نہیں دیکھا“۔ اس نے ایک آہ بھری ۔ ”مر گیا تو ایک دن تمہیں بیٹھ کر روؤ گی“۔ وہ جلال میں آگیا کہا ۔ ”اس میں کیا برا ہے“۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا ۔ ”آپ ہی کا کہنا ہے نا ۔ بجانے والا روئے تو وائلن بجتی ہے ۔ نہیں تو نہیں ۔ پھر تو میری وائلن بجے گی وہ ہنسی ۔ اور آجو کا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر رو دے ۔

وہ گھر جا کر رو رو کر نڈھال ہوگیا ۔ پھر دفعتاً مسکرا دیا ۔ ہنسنے لگا ۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ ”ہاں اس کی وائلن بجے گی ۔ دینا اسے سنے گی ۔ او سر دھنے گی ۔ ہاں میں اسے نغمہ سناؤں گا ۔ میں آپ اس کی وائلن میں راگ بن کر رہوں گا ۔ میرا دل تار بن کر لرزے گا ۔ اور وہ اسے چھیڑے گی ۔ اپنے ہاتھوں سے چھیڑے گی ۔ ہاں اس کی وائلن بجے گی ۔ وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے ۔ سانس اکھڑ گئی اور وہ لیٹ گیا ۔ بالکل

ہی لیٹ گیا ۔ حتیٰ کہ فلی کی وائلن بجی تو بھی اسے خبر نہ ہوئی ۔

لوگوں کو اس کی موت کی خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گئے "نہیں نہیں وہ مرا نہیں"۔ وہ تو چلا گیا ۔ نگر چھوڑ کر چلا گیا ۔ نگر میں سنسنی دوڑ گئی ۔

نگر کو چھوڑ کر چلا جانا نگر کے قانون کے خلاف تھا ۔ اور آپ مر جانا نگر چھوڑ جانے کے برابر تھا ۔ چاہے کوئی روز مر جانے کی دھمکی دیتا اس میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن واقعی چلے جانا یا مر جانا بالکل ہی مر جانا نگر کا قانون اسے جرم سمجھتا تھا ۔ اس لئے آجو کے گھر والوں نے یہ بات چھپا رکھی ۔ لیکن پتہ نہیں فلی کو کس نے بتا دیا ۔ شاید وہ جانے سے پہلے رقعہ لکھ کر آپ ہی بتا گیا ہو ۔ ورنہ فلی کو کیسے معلوم ہوا ۔ کہ وہ اس کی وائلن میں نغمہ بن کر رہنے کے لئے چلا گیا ہے اس کے دل میں درد بن کر رہنے کے لئے ۔ ایسا درد جو انگ انگ میں بستا ہے اور جان بن جاتا ہے ۔ اور پھر انگلیوں کی راہ تاروں میں بکھر کر فضا میں لہریں لیتا ہے ۔

نہ جانے فلی کو کیا ہوا وہ وائلن کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ گئی ۔ اور وہ بجنے لگی ۔ رونے لگی ۔ بین کرنے لگی ۔ اور آسمان نے اپنے نیلے دامن کو دوہرا کر دیا ۔ تاکہ آواز اوپر نہ نکل جائے ۔ ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آواز فرشتوں کے کان میں پڑ جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ فرشتے گھبرا کر سجدوں سے اٹھ جائیں ۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کرشن مہاراج بن کر ازسرنو گوکل کے بن میں آنے پر مچل جائے ۔

جب لوگ پوچھنے آئے تو فلی غصہ میں اٹھ بیٹھی ۔ "کون کہتا ہے وہ آپ مرا ہے کون کہتا ہے وہ مرا ہے ۔ جھوٹ ۔ سب جھوٹ ۔ وہ جیتا ہے وہ ہمیشہ جئے گا ۔ وہ کبھی نہ مرے گا ۔ ہاں وہ میری وائلن میں نغمہ بن کر جیتا ہے ۔ اب میں جانتی ہوں اس نے کہا تھا اپنے چاہنے والے کو جانو"۔

نہ جانے دینا نے اس کی بات کہاں سے سن پائی ۔ "اپنے چاہنے والوں کو جانو"۔ یہ بات اس کی نس نس میں دھنس گئی ۔ وہ بھاگ اٹھی ۔ اور معاً اپنے

چاہنے والوں کو جانتے لگی ۔ کھاڑی میں روتی ہوئی مرلی کے بین گونجے ۔ اس نے انہیں سنا ۔ اور سن سی رہ گئی ۔ پھر اسے مزید جانتے کے لئے وہ چل کھڑی ہوئی ۔ منجو نے اسے آتے دیکھا ۔ اور مرلی بجانا بند کر دیا ۔ بولا ۔ "دھن بھاگ ہیں میرے"۔ دینا شرما گئی ۔ اس نے اسے جان لیا تھا نا ۔ اس لئے وہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر چلے گئے ۔ ایک دوسرے کو اور جانتے کے لئے یا اپنے آپ کو بھولنے کے لئے ۔ نگر چھوڑ کر چلے گے ۔

دینی چلی گئی ۔ دینی نگر چھوڑ کر چلی گئی ۔ نگر میں چرچا ہوا ۔ کھاڑی میں مرلیوں نے بڑھا چڑھا کر دینا کے چلے جانے کا دکھڑا رویا شاید بڑھا چڑھا کر نہ رویا ہو ۔ دکھ کو کون بڑھا چڑھا سکتا ہے ۔

ادھر نزّی نے اپنے آجو کا آخری پیغام سنا ۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو"۔ وہ گویا چونک کر بھاگ اٹھی ۔ کس کے لئے جان سے چلے گئے ۔ کس کی خاطر اپنی جوانی لٹا دی ۔ اپنا بلیدان دے دیا ہائے کیا ہوگیا ۔ اب کیا ہوگا ۔ نہیں نہیں وہ گئے نہیں ۔ وہ تو مجھے پریم کرنا سکھا گئے ہیں ۔ پریم اپنا بلیدان ہے مٹ کر جینا ۔ "اپنے چاہنے والے کو جانو"۔ میں پالن کرونگی میں ذونو سے پریم کی بھیک مانگوں گی ۔ وہ مجھے معاف کر دیں گے ۔ نہ کریں تو میں پراشچت کروں گی ۔ میرا سر نہ اٹھے گا ۔ اور وہ چھم چھم رونے لگی ۔ چھم چھم روتی رہی ۔

ذونو نے سنا کہ دینا چلی گئی نگر چھوڑ کر چلی گئی ۔ اسکی آنکھ کھل گئی ۔ ہاں میں جانتا تھا ۔ مجھے معلوم تھا ۔ وہ میری خاطر نگر چھوڑ گئی ہے ۔ میرے لئے اپنا آپ کھو دیا ۔ ہاں میرے لئے ۔ اسے مجھ سے پریم تھا نا ۔ ہائے میں کس قدر اندھا رہا ۔ میں نے اسے نہ جانا وہ چلی گئی ۔ تاکہ مجھے بیاہ سے انکار نہ کرنا پڑے ۔ میری نزی بدنام نہ ہو ۔ اس نے اپنا آپ قربان کر دیا ۔ واقعی وہ دیوی تھی اور میں اندھا دیوانہ ۔ یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ اور اس چلی گئی دیوی کے سامنے محبت کی جوت جلا کر بیٹھ گیا ۔

فلی اپنی وائلن اٹھا کر آجو کی قبر پر جا بیٹھی ۔ اسے اپنے مرے ہوئے پریمی

سے محبت ہو چکی تھی نا ۔ اس کی وائلن سے برہ کے بین نکلے ۔ نزی نے یوں محسوس کیا جیسے وہ گیت اس کے اپنے آجو کا سندیس ہو ۔ میں پالن کرونگی ۔ وہ بڑبڑائی ۔ میں نے ذونو کو جان لیا ۔ اور وہ ازسرِنو ذونو کے لئے چھم چھم رونے لگی ۔ ذونو کو ایسا محسوس ہوا جیسے دینا جاتے ہوئے اپنے دل کا درد ہوا میں بکھیر گئی ہو ۔ جو دینی کی قربانی کا شاہد تھا ۔ نہیں نہیں وہ گئی نہیں وہ یہیں ہے جسم کے جانے سے بھی کوئی جاتا ہے بلکہ وہ تو نگر میں آگئی ہے میرے من کے نگر میں ۔ میرے من کی دیوی ۔ اور دینا کی خاطر وہ کروٹیں بدلنے لگا اور آہیں بھرنے لگا ۔

پتوں نے سنا اور وہ سمٹ سمٹ کر ایک دوسرے سے لگ گئے ۔ ٹہنیوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیا چشمے ٹپ ٹپ رونے لگے ۔ کوئل نے بچھڑے باسیوں ۔ کو یوں آوازیں دینا شروع کر دیا ۔ جیسے وہ آجائیں گے ۔ پگڈنڈیاں اِدھر اودھر دوڑیں جیسے "کھوئے ہوئے" ابھی مل جائیں گے ۔ آسمان نے اپنا پردہ اور بھی گاڑھا کر دیا تاکہ گئے ہوئے باشیوں کی یاد آسمانوں پر نہ پہنچ جائے ۔ کہیں فرشتے بھی نہ چاہنے لگیں کہ اللہ میاں چلے جائیں اور آسمانوں پر بھی جستجو کی رنگینی کا چرچا ہو کہیں وہاں بھی ایک نگر نہ بس جائے ۔

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے ۔ مبالغہ ہے ۔ حقیقت یوں ہے کہ وائلن سے براہ کے بین نکلتے ہیں ۔ ٹہنیاں سر دھن دھن کر سنتی ہیں ۔ چشمے چھن چھن ناچتے ہیں ۔ نگر کے باشی خوشی کے آنسو روتے ہیں ۔ ڈنڈیاں اِدھر اُدھر ناچتی ہیں ۔

لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ چاہے کوئی سی بات سچی ہو ۔ بہرحال نگر اور بھی بستا ہے اور نگر کے باشی اور بھی جیتے ہیں ۔

تین خدا

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے ۔

چہرے اظہارِ جذبہ یا خیال سے خالی ۔ منہ اطمینان کی شدت سے یوں سوجے ہوئے گویا پیٹ بھر کر کھا لینے کے بعد کوئی بے حسی کا تودہ بن کر رہ گیا ہو ۔ آنکھیں کھلی محض کھلی ۔ منظر سے عاری ۔ سامنے جہاں تک منظر کام کرتی تھی ایک وسیع ویرانہ اونگھ رہا تھا ۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ بے نیاز ۔ بے خبر ۔

لمبی داڑھی والا لمبی چوڑی کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا ۔ رسیوں کے درمیان وسیع خلا تھے ۔ اُونچائی اور چوڑائی کو دیکھ کر محسوس ہوتا گویا کسی "سائیکلوپ" کیلئے بنی ہو ۔ اُس کی پتلی دُبلی دھوتی سے ادھ لپٹی ٹانگیں اس بڑی چارپائی کے کونے میں بے بسی سے پڑی تھیں ۔ دونوں بازو اس کے بڑے سر کو تھامے ہوئے تھے ۔ پیٹھ تلے ایک میلا اور بھدا گاؤ تکیہ سہارا دے رہا تھا ۔ منہ چقندر سا سُرخ تھا جس کے تلے سے رنگی داڑھی سینے تک چلی گئی تھی ۔ موٹے موٹے ہونٹ ۔ پھولی ہوئی ناک ۔ اور دھنسی ہوئی آنکھیں ۔ جو اس پھیلے ہوئے ویرانے سے پرے دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھیں ۔ کبھی کبھی وہ ۔ چونک اٹھتا جیسے اس دنیا میں آگیا ہو ۔ دائیں ہاتھ سے داڑھی کی وسعت کو محسوس کرتا ۔ اور پھر اس کے گلے کے نچلے پردوں سے "آہم ۔۔ ! !!" کی آواز پیدا ہوتی ۔ جو اس ویرانے میں گونجتی ۔۔۔۔۔۔ !!" اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک اور تہ چڑھ جاتی ۔ پھر وہ از سرنو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کائنات کا جائزہ لینا شروع کر دیتا ۔

دوسرا بوسیدہ موڑنے پر بیٹھا تھا ۔ لمبا چہرہ ۔ چھوٹی اور شوخ آنکھیں پچکے ہوئے گال ۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ جو اکثر طنزیا تمسخر سے کھل جاتے اُس

سے آنکھوں میں حقارت کی دھار لہراتی ۔ لمبی نوکیلی انگلیاں ان جانے اضطراب سے پیچ وتاب کھاتیں ۔ وہ پیار بھری نگاہ سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتا گویا انہیں آنکھوں سے چھو رہا ہو ۔ چوم رہا ہو ۔ پھر کنکھیوں سے اپنے کسی ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکرانا تمسخر آمیز ادھوری مسکراہٹ ۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا اور بالآخر آسمان کے پار دیکھنے میں کھو جاتا ۔ !

تیسرا لکڑی کے تخت پوش پر دو زانو بیٹھا کنگھے سے گیسو سنوارنے میں لگا تھا ۔ اس کے تیل سے بھیگے ہوئے سیاہ لمبے بال شانوں پر پڑے تھے ۔ گول ابھرے ہوئے چمکدار گال گویا بے حسی سے پھولے ہوئے تھے ۔ شرعی مونچھوں تلے منڈی ہوئی داڑھی ۔ موٹے موٹے ہونٹ آپ ہی آپ ہلنے لگتے گویا ورد کر رہے ہوں ۔ وہ اپنے گیسو ، کنگھے اور اپنے آپ میں مگن بیٹھا تھا ۔ بالوں سے کنگھا نکالتا ۔ بال بناتا پھر کنگھے کو کلپ کی طرح بالوں میں اٹکا کر ۔ دونوں ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے ۔ ”سبحان اللہ“ گنگناتا سامنے رکھی ہوئی پگڑی یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھ دیتا ۔ اپنے ننگے گھٹنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ۔ چھاتی کے بالوں کو محسوس کرتا ۔ اور پھر اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر ، از سرِ نو کنگھا نکال کر بال بنانا شروع کر دیتا ۔

چوتھا جو ایک عام نوجوان دکھائی دیتا تھا ، ان کی طرف باری باری عقیدت سے دیکھتا ۔ اور مسکراتا ۔۔۔۔۔ گویا ان سے قرب حاصل ہونے پر مسرّت سے پھولے نہ سماتا ہو ۔۔۔۔ اور پھر از سرِ نو امید افزا نگاہوں سے باری باری ان کا منہ تکتا ۔۔ وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے ۔ اور وہ نوجوان ان تینوں میں ۔

ان تینوں کے عقب میں ایک بوسیدہ اور کبڑا دالان بوسیدہ دیوار کے سہارے کھڑا ہونک رہا تھا ۔ سیاہ نانک چندی اینٹوں کی دیواریں ہڈیوں کے پرانے ڈھانچے کی طرح رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ۔

ان کے سامنے ایک بیٹھا سا ٹیلا اس وسیع ویرانے کے تسلسل کو توڑ رہا تھا ۔ جو سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا ۔ ٹیلے پر قبریں اوٹ پٹانگ ڈھیریوں کی

طرح بکھری ہوئی تھیں ۔ اردگرد بگولے خاک اڑا رہے تھے ۔ ٹنڈ منڈ ٹہنیاں چاروں طرف نکل گئی تھیں ۔ گویا پتوں کی ہوس میں سرگرداں ہوں ۔ اردگرد چاروں طرف ریت کی لہریں رینگ رہی تھیں ۔

لمبی داڑھی والے نے ایک انگڑائی لی ۔ اور گہری اہمیت بھری آواز سے کھنکارا ۔ ”اہم ۔۔۔ !!“ تھوک کی پچکاری چلائی ۔ اپنی آواز کی گونج سن کر اطمینان سے وہ از سرِ نو خلا میں گھورنے لگا ۔

تراشی ہوئی داڑھی والے نے حقارت سے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا ۔ ہونٹ تمسخر سے کھل گئے ۔ اس نے اپنی سیاہ اچکن کے بٹن کھول دیئے ۔ گویا کسی جذبے کی شدت سے پھُکا جارہا ہو ۔ بے خبری میں دو ایک لمبے سانس لئے ۔ اور بالآخر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے میں محو ہوگیا ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے کنگھا بالوں میں اُٹکا دیا ۔ منہ پر ہاتھ پھیرا ۔ اور پھر سامنے دھرے ہوئے بجھے ہوئے حقے کی نے کو منہ میں لے کر اسے چومنا شروع کردیا ۔

نوجوان نے باری باری ان تینوں کی طرف عقیدت سے دیکھا اور پھر دالان کی بوسیدہ دیوار کی طرف گھورتے ہوئے آہیں بھرنے لگا ۔

دفعتاً منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقہ چھوڑ کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا ۔ اور پھر چھاتی کے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا ۔

تراشی ہوئی داڑھی والا چونکا ۔ ”استغفراللہ ربی“ ۔ وہ دبی زبان میں گنگنایا ۔ آنکھ میں وہی چمک لہرائی ۔ ہونٹ کھلے ۔ پھر وہ اچکن سے گرد جھاڑنے لگا ۔

لمبی داڑھی والے نے کروٹ بدلی اور ٹانگوں کو کھجاتے ہوئے بولا ۔ ”مولا ہی مولا ۔ سب رولا ہی رولا“ ۔

تراشی ہوئی داڑھی واے نے چونک کر ادھرادھر دیکھا ۔ جیسے لمبی داڑھی والے کے نعرے کی تصدیق کر رہا ہو ۔

نوجوان کی نگاہ عقیدت مندی سے بھیگ رہی تھی ۔ مولا ہی مولا"۔ اس نے دہرایا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے نوجوان کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا ۔ مسکرایا اور پھر بامعنی نگاہ سے اردگرد دیکھ کر ازسرنو نوجوان کی طرف دیکھ کر یوں مسکرا دیا ۔ گویا داد طلب کر رہا ہو ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنی پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی ۔ پھر کچھ سوچ کر اسے اتار یہاں سے وہاں رکھنے میں مصروف ہوگیا ۔ "اللہ الصمد"۔ اس کی آواز گونجی ۔

Engr. Parvez Akram

تراشی ہوئی داڑھی والا جو ٹیلے کی قبروں کو دیکھنے میں مصروف تھا ۔ چونک کر منڈی ہوئی داڑھی والے کی طرف متوجہ ہوگیا ۔ پھر اُس نے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا جو ڈھیر کی طرح پڑا تھا ۔ اس کی آنکھ چمکی ۔ اور ہاتھ کی انگلیاں اچکن کے بٹنوں سے کھیلنے لگیں ۔

نہ جانے کب تک وہ خاموش بیٹھے رہے ۔

ویرانے میں دھول اُڑنے لگی ۔ بگولے ناچنے لگے ۔ ریت کی لہریں رینگنے لگیں ۔ لمبی داڑھی والے کی دھوتی پھڑاتی ۔ اس کا لمبا سا ہاتھ دھوتی کو رانوں میں دبانے میں لگ جاتا ۔ اور پھر وہیں مٹھی سی بن کر پڑا رہتا ۔ "مولا ہی مولا"۔ اس کے منہ سے نعرہ نکل کر گونجتا ۔ "سبحان اللہ" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والا اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چلاتا جیسے سامنے آئینہ پڑا ہو ۔ پھر وہ حقّے کی نے کو پکڑ کر یوں چوسنے لگتا گویا وہ سنترے کی مٹھائی کی پھانک ہو اور چھاتی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا اردگرد دیکھ کر مسکراتا جیسے وہ چیزوں کی اہمیت اور حقیقت سے کماحقہ واقف ہو ۔ کالی اچکن سے گرد جھاڑتا ۔ نوجوان سے داد طلب کرتا اور پھر سامنے ٹیلے کی قبروں کی طرف نظر ڈال کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا اور مسکراتا ۔

نوجوان باری باری ان کی طرف عقیدت بھری نگاہ سے دیکھتا آہ بھرتا اور پھر دالان کی بوسیدہ دیواروں کو گھورنے لگ جاتا ۔

"والسلام علیک"۔ ایک بوڑھا کسان داخل ہوتے ہوئے بولا ۔

"وعلیکم السلام"۔ وہ تینوں باآواز بلند چلائے لیکن بوڑھے کی طرف کسی نے توجہ نہ دی ۔

لمبی داڑھی والا عربی گنگنانے میں لگا رہا ۔ اس کی نگاہ افق کے پار دیکھنے میں لگی رہی ۔ اور مٹھی دھوتی سنبھالنے میں ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا اپنے ہاتھ دیکھنے میں شدت سے مصروف رہا اور منڈی ہوی داڑھی والا کنگھا نکال کر بال بنانے میں لگ گیا ۔ نوجوان نے بوڑھے چودھری کی طرف دیکھا ۔ سلام کا جواب ہونٹوں میں دب کر رہ گیا ۔ لیکن وہ سرک کر چارپائی کی پائنتی کی طرف ہو بیٹھا تاکہ چودھری کے لئے بیٹھنے کی جگہ بنا دے ۔

چودھری چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ اس نے اپنی لاٹھی رکھ کر ان تینوں کیطرف دیکھا اور کئی بار بولنے کی ناکام کوشش کی ۔ وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے ۔

"ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ گاؤں میں تشریف لائے ہیں" ۔ بڈھا بالآخر کہنے میں کامیاب ہوگیا ۔

لمبی داڑھی والے نے کھنکھارا ۔ "اہم ـــــ" اور پھر تھوک کی پیک چلا کر خاموش ہوگیا ۔ ہم ۔ ویرانے میں آواز گونجی ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا ۔ اور پھر پگڑی کو یہاں سے اُٹھا وہاں رکھ کر چھاتی کے بالوں سے کھیلنا شروع کردیا ۔

"خدا کرے گاؤں والے ہدایت حاصل کریں !" بڈھا چودھری گنگنایا ۔

"اللہ کرے !" اچکن والا اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا ۔

"آمین" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقّے کی نے کو منہ میں لیتے ہوئے کہا ۔ اور پھر خاموش ہوگئے ۔

"جب سے یہ نئی چیزیں نکلی ہیں" ۔ چودھری نے ان تینوں کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ "یہ بائیسکوپ اور راڈیو" ۔

“استغفر اللہ ربی !” لمبی داڑھی والا چونک کر جلال میں بولا“ ۔ ”میاں ان شیطانی ہتھکنڈوں سے کون لڑے“ ۔ اس نے کروٹ لے کر تھوک کی پیک چلائی ۔

“ہم تو دامن بچاتے پھرتے ہیں” ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے اچکن کو انگلیوں سے جھاڑتے ہوئے کہا ۔

“ہم جانیں اللہ میاں آپ عاجز آچکے ہیں” ۔ لمبی داڑھی والا ہنسا اور پھر عجز بھرے انداز سے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ۔

“زمین اپنی خبریں دے رہی ہے” ۔ منڈی ہوئی داڑھی والا بال بناتے ہوئے بولا ۔

“میاں خبر لینے والا بھی ہو کوئی” لمبی داڑھی والا باخبر انداز سے بولا ۔ اور پھر زور سے کھنکھارا ۔ “اہم ۔۔۔۔۔” اہم کی گونج سن کر اطمینان سے داڑھی کو ہاتھ میں لے کر اس کی وسعت محسوس کرنے لگا ۔

“قیامت کے آثار ہیں” ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے ٹیلے پر قبروں کو گھورتے ہوئے کہا ۔

آثار ۔۔۔۔۔ ؟” لمبی داڑھی والے نے مٹھی کی گرفت کو مضبوط تر کرتے ہوئے دہرایا” ۔ اس سے بڑھ کر قیامت اور کیا ہوگی ؟”

“سبحان اللہ” ۔ نوجوان گنگنایا ۔

“اللہ کرے لوگوں کو ان باتوں کی تمیز ہو جائے” ۔ چودھری دعائیہ انداز سے بولا ۔

“لوگ ۔۔۔۔۔ ؟” لمبی داڑھی والے نے یوں پیک چلائی گویا نشانہ کیا ہو ۔۔۔۔۔

“لوگوں کی ذہنیت ۔۔۔۔۔ کس قدر تعفن ہے ۔ جہالت اور غلاظت ۔ نعوذ باللہ” ۔

“آپ جو تشریف لائے ہیں” چودھری بولا ۔ “ایسی وعظ ہو جائے کہ لوگوں

کی آنکھیں کھل جائیں” ۔

“میاں جھگڑا تو یہی ہے کہ ہر کوئی آنکھیں پھاڑے دیکھنے میں لگا ہے ۔ آنکھیں موندھ کر دیکھنے کا زمانہ گزر گیا ۔ لمبی داڑھی والے نے آنکھیں موندھ کر کہا ۔

منڈی ہوئی داڑھی والا چونک اٹھا ۔ اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔ “سبحان اللہ” کیا بات کی ہے مولانا نے” ۔

کچھ دیر تک وہ سب خاموش بیٹھے رہے ۔

لمبی داڑھی والا آنکھیں بند کئے پڑا تھا ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا پلکیں جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے میں لگا تھا اور منڈی ہوئی داڑھی والا آنکھیں بند کئے حقے کی نے چوس رہا تھا ۔

“آپ کی واعظ سنیں گے ۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا” چودھری نے از سرِ نو بات چھیڑی ۔

بڈھوں کی بات کون سنتا ہے میاں ۔ لمبی داڑھی والے نے ہاتھ سے اپنی داڑھی کی لمبائی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔

“یہ تو آپ کی کسرِ نفسی ہے” چودھری بولا ۔

“میاں نفس رہا بھی ہو” ۔ بڑی داڑھی والے نے اپنی دھوتی ٹانگوں میں دباتے ہوئے کہا ۔ “پھر کسرِ نفسی کیسی ؟”

“سب نفس ہی کا جھگڑا ہے” ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے چھاتی کے بالوں کو سہلانا بند کرتے ہوئے کہا ۔

“لیکن واعظ تو ہو گا ۔ سارا گاؤں منتظر ہے” ۔ چودھری بولا ۔

“ہاں وعظ تو ہو گی” ۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے ہاتھوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

“ہاں میاں” بڑی داڑھی والا ہنسا “بین تو بجے گی کوئی ناچے نہ ناچے” ۔

“وہ تو اب کسی اور بین پر ناچتے ہیں” ۔ اچکن والا بولا ۔

"آخر کب تک میاں"۔ بڑی داڑھی والا جلال میں آگیا "خدا کی لاٹھی بے آواز ہے"۔

"بے شک"۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے ٹانگ اکڑا کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور محسوس کرنے لگا گویا وہ لکڑی کی بنی ہو۔

"لیکن حضرت!" چودھری بولا۔ "اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کے لئے اپنے بندے بھیجتا ہی ہے"۔

"سبحان اللہ" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بڑی بڑی انمول ہستیاں آئیں"۔

"بڑے بڑے بزرگ"۔ لمبی داڑھی والا اپنی داڑھی کی وسعت کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولا۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آگیا"۔ لیکن میاں کوئی جانے بھی۔ یہ لوگ ۔۔۔!!" اس نے تھوک کی پیک چلائی "اللہ تعالیٰ نے ان کی عقل پر تالے لگا دیئے۔ آنکھوں میں بُھس بھر دی۔ اب کوئی کیا کرے"۔

پھر بھی اللہ کے بندوں نے کیسے کیسے کام سر انجام دیئے۔ تراشی ہوئی داڑھی والا ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"مولانا نے اعظم گڑھ میں وعظ کی تھی"۔ نوجوان نے لمبی داڑھی والے کی طرف اشارا کیا اور دبی آواز میں چودھری سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔ "وعظ ختم ہونے پر کوئی آنکھ خشک نہ تھی"۔

"ان کی واعظ کی تاثیر کون نہیں جانتا؟" چودھری گنگنایا۔

"سب مولا ہی مولا" لمبی داڑھی والا کروٹ لیتے ہوئے چلّایا۔

"اللہ کی دین ہے"۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"زبان کا جادو ہے"۔ اچکن والا گنگنایا۔

"خیر خیر"۔ لمبی داڑھی والا بیتابی سے کہنے لگا۔ زبان بیچاری کیا کریگی جب تک سننے والوں کے مردہ دلوں میں وہ ذات کریم قبولیت پیدا نہ کرے، بیچارے ۔۔۔۔!!" وہ ہنسا۔ تفریح کے لیے آتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں۔

"آپ سے برگزیدہ اصحاب نہ ہوں تو مُردوں میں جان کیسے پڑے؟" چودھری بولا۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے بڑی داڑھی والے کی طرف دیکھا۔ آنکھ میں وہی چمک لہرائی ہونٹ کِھل گئے۔

"اہم"۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے غیرازمعمول کھنکھارا اور وہ اطمینان سے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میاں! جان ڈالنے والے کو آپ دار پر چڑھانا پڑتا ہے"۔ لمبی داڑھی والا ہنس کر بولا۔ اور پھر یوں اکڑ کر انگڑائی لی گویا دار پر چڑھا ہوا ہو۔

"اللہ تعالےٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش جو منظور ہوئی"۔ چودھری نے نوجوان سے کہا۔

"کیا ٹھکانہ ہے آزمائش کا"۔ بڑی داڑھی والا ہنسا۔

"اپنوں ہی کی آزمائش؟" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"قادر مطلق جو ٹھہرا"۔ اچکن والا گنگنایا۔

"اچھا بھئی"۔ لمبی داڑھی والا چلّایا۔ "کرلے آزمائش۔ اس کی مرضی۔ ہماری مرضی کیا اس کی مرضی سے جدا ہے۔ ہم تو میاں وعظ کرنے سے باز نہیں آنے کے"۔

"جبھی تو لوگ واعظ سن کر اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں"۔ نوجوان بولا۔

"ہاں بھئی"۔ چودھری بولا۔ "کیا مجال جو اس کی مرضی بغیر پتہ بھی ہل سکے"۔

"اعظم گڑھ میں مولانا نے غازہ اور پاؤڈر کی خوب بات کی"۔ نوجوان ہنسنے لگا۔

"ہاں۔ وہ اعظم گڑھ ۔۔۔۔" بڑی داڑھی والا ہنسا ۔۔۔۔۔ "ہاں

ہاں ۔ میاں جب ہم نے کہا کہ آج کل کا حسن بھی کیا ہے ۔ منہ پونچو تو مٹ جائے ۔ ہمارا مطلب سرخی پاؤڈر سے تھا ۔ پھر دیکھا تو عورتیں منہ پونچ رہی ہیں ۔ گویا پسینے سے بُرا حال ہو رہا ہو ۔ حالانکہ گرمی نام کو نہ تھی "۔

"خجالت کا پسینہ!" نوجوان مسکرا کر خاموش ہو گیا ۔

"معظم پورہ میں میں نے اسی موضوع پر تقریر کی تھی"۔ منڈی ہوئی داڑھی والا بال بناتے ہوئے کہنے لگا ۔

"خیر خیر میاں !" لمبی داڑھی والا گنگنایا اور پھر اٹھ کر جوش میں کہنے لگا ۔ "موضوع تو وہی پرانا ہے ۔ ہاں تاثیر اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے"۔ اس کا ہاتھ داڑھی پر جا پڑا ۔ اور وہ محسوس کرنے لگا ۔ گویا وہ تاثیر سے بھیگ رہی ہو ۔

اچکن والے نے کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرانا شروع کر دیا ۔

"معظم پورہ میں ــــــ" منڈی ہوئی داڑھی والے نے از سر نو بیان کرنے کی ناکام کوشش کی ۔

"مولا ہی مولا ۔ سب رولا ہی رولا ــــــ" بڑی داڑھی والے نے نعرہ لگا کر معظم پورہ کی بات ان سنی کر دی ۔

"ایسا مسئلہ چھیڑیئے آج"۔ چودھری بولا ۔ "کہ مولا ہی مولا ہو جائے"۔

"گاؤں والے آپ سے بے تاب ہیں"۔ نوجوان نے کہا ۔

"بے تاب تو ہیں" ۔ لمبی داڑھی والے نے پُر تاب انداز سے کہا ۔ "پر تاب بھی لا سکیں"۔

"تاب والوں سے ڈر جاتے ہیں یہ لوگ!" منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔

"اب تو دنیا میں بے تابی کا دور ہے"۔ اچکن والا گنگنایا اور پھر مسکرا دیا ۔

"واہ صاحب کیا بات کی ہے ۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے" ۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے کہا ۔

"ارے میاں!" لمبی داڑھی والا بولا ۔ نکتہ کیا کرے گا ۔ نکتہ چین پیدا کرے گا

اور کیا ؟"۔

"ہوں" ۔ تراشی ہوئی داڑھی والا بولا ۔ "نکتہ دانی تو کب کی مفقود ہو چکی"۔

"میاں! یہ عوام تو بھیڑیں ہیں"۔ لمبی داڑھی والے نے کہا ۔ "یہ کیا جانیں نکتہ شناسی ؟"

"بھیڑیں ہی سہی"۔ چودھری بولا ۔ "جو کچھ بھی ہیں آپ ہی کا سرمایہ ہیں"۔

"ہمارا سرمایہ ؟" وہ ہنسا "میاں ہمیں سرمایہ کی لعنت سے پاک ہی رہنے دو"۔ لمبی داڑھی والے نے جواب دیا ۔

"یہ وہ سرمایہ نہیں حضرت!" چودھری نے کہا ۔ "اگر ایک آدمی کے دل میں بھی حقیقی چنگاری پیدا ہو جائے تو سبحان اللہ"۔

"خیر خیر یہ تو ٹھیک ہے"۔ لمبی داڑھی والے نے داڑھی ہاتھ میں لے کر کہا : "لیکن ایسا گڈریا بھی کیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی نہ ہو"۔

"اس کی لاٹھی بے آواز پڑی بھی تو کیا مزا"۔ لمبی داڑھی والا ہنسا ۔ اس نے اپنی لمبی داڑھی کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے کہا ۔ "اس کی لاٹھی میں جان بھی رہی ہو ۔ وہ زمانہ گیا ۔ جب قہر نازل ہوتے تھے ۔ ورنہ آج ہی سے یہ بھیڑ خانہ اپنے بوجھ سے آزاد ہو جائے" ۔ معاً اس کی نگاہ سامنے ٹیلے پر پڑی اور وہ جلال میں ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ۔ "یہ کا مٹی ٹیلا ان اُجڑی ہوئی قبروں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے"۔

دالان کے پاس ہی پنڈال بنا ہوا تھا ۔ سفید چادروں کے فرش پر تین کرسیاں پڑی تھیں جن کے پاس ایک بیٹھی سی میز لگی ہوئی تھی ۔ میز پر گلاسوں میں بدو گلدستے سجے ہوئے تھے ۔ نیچے دو ایک پھٹی ہوئی دریاں بچھی ہوئی تھیں ۔ جن پر گاؤں کے لوگ بیٹھے تھے ۔

وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے ۔ لیکن ہر گھڑی ایک

منظر دالان کی طرف دیکھ لیتے جہاں سے مولانا تشریف لانے والے تھے ۔ ان کے انداز سے شوق اور جوش کی شدت ظاہر ہو رہی تھی ۔ کئی ایک کپڑے سے ٹانگیں اور پیٹھ باندھے ہوئے بیٹھے تھے ۔ کسی نے اپنی لاٹھی کو گھوڑا بنا رکھا تھا ۔ آنکھ میں زندگی کی چمک لہرا رہی تھی ۔

دفعتاً وہ خاموش ہو گئے ۔۔۔۔۔ مولانا تشریف لا رہے تھے ۔

تینوں اصحاب دالان سے نکلے اور ایک وقار سے پنڈال کی طرف آئے ۔ بڑی داڑھی والے نے لوگوں کی طرف دیکھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھنکھارا ۔ آہم ۔۔۔۔ !!" اپنی آواز کی گونج سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کا ایک اور غلاف چڑھ گیا ۔

اچکن والے نے مجمع پر نگاہ ڈالی اور محسوس کیا گویا وہ کسی بھیڑ خانے میں آگھسا ہو ۔ معاً اس کے ہاتھ کی چھڑی ابھر کر عصا بن گئی ۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سونٹا یوں آہستہ سے ٹیکنا شروع کر دیا گویا وہ بے آواز ہو ۔

وہ تینوں پنڈال پر بیٹھ گئے ۔

"لمبی داڑھی والے نے قرآن کریم کی آیت پڑھتے ہوئے سامنے مجمع کی طرف دیکھا ۔ کیڑوں کا ایک بڑا سا ڈھیر چھوٹی چھوٹی ڈھیروں میں بٹا جا رہا تھا ۔۔۔۔ بھیڑیں سر جھکائے ادھر ادھر سرک رہی تھیں ۔ گویا پناہ مانگ رہی ہوں ۔ اس نے نگاہ اٹھائی سامنے اس بنچھے سے ٹیلے پر ڈھیریاں بکھری پڑی تھیں ۔ رینگ رہی تھیں ۔ جیسے ان درختوں کی پناہ میں آجانے کی خواہاں ہوں اور درخت شاخیں پھیلائے کھڑے تھے ۔ کسی جذبہ سے مسحور ہو کر وہ جلال میں بولا ۔ "اے مسلمانو ! اے مردہ مسلمانو ! تم ۔۔ تم اس ملت کے افراد ہو جو کسی زمانے میں دُنیا بھر کے لئے پیام حیات بن کر آئی تھی ۔ لیکن آج تم ۔ مردہ بھیڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے" ۔

اس نے تم پر زور دیتے ہوئے کہا ۔ اور پھر جلال میں آہم کھنکھارا "ہم

" ۔ آواز گونجی اور وہ اطمینان سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ جیسے تم اور ہم کا فرق واضح کر چکا ہو ۔

"بھیڑوں سے بڑھکر حیثیت نہیں رکھتے" ۔ اس نے دہرایا ۔

معاً اچکن والے نے محسوس کیا گویا اس کے ہاتھ میں چھڑی کی جگہ عصا تھا ۔

"آج تم ایک مردہ قوم ہو ۔ اپنے اپنے نفس میں مدفون ۔ آج تم محض مٹی کی ڈھیریاں ہو ۔ قبروں کی سی ڈھیریاں اُس نے ایک منظر ٹیلے کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "ان مزاروں پر بھی روشنی کے بگولوں نے یورش کر رکھی ہے ۔ لیکن اللہ تعالی کی رحمت ! وہ ٹیلے کی طرف انگلی اٹھا کر خاموش ہوگیا ۔ وہ دیکھو ٹیلے کی قبریں بگولوں کی زد میں آئی ہوئی ہیں ۔۔۔۔۔ لیکن وہ درخت ۔۔۔۔۔ وہ درخت ۔۔ بوڑھے ہو چکے ہیں پتے جھڑ گئے ہیں پسلیاں نکل آئی ہیں" ۔ اچکن والے نے اپنی چھاتی پر ہاتھ پھیرا ۔ لیکن وہ درخت ۔ اللہ کی رحمت کی طرح اپنی شاخیں پھیلائے قبروں کو پناہ دے رہے ہیں ۔ وہ دیکھو" اس نے ازسرنو ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ ٹہنیوں کی طرح پھیلا دیئے ۔

معاً اس کے دونوں ساتھی اٹھ بیٹھے "خاموش" منڈی ہوئی داڑھی والا اپنا سونٹا ہجوم کے سر پر کھڑا کرکے چلایا ۔ بیٹھ جاؤ ۔ بیٹھ جاؤ تراشی ہوئی داڑھی والے نے اپنا ہاتھ اور چھڑی پھیلاتے ہوئے کہا ۔

وہ تینوں ہاتھ پھیلائے اس ٹیلے کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ جہاں تین درخت ٹہنیاں پھیلائے کھڑے تھے ۔ پنڈال تلے ان تینوں کے زیر سایہ بھیڑیں مٹی کی ڈھیروں کی طرح دبکی بیٹھی تھیں ۔

"ہاں ۔۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ابھی تمہاری محافظ ہے" لمبی داڑھی والا جلال میں بولا" ۔ "لیکن تم اپنے نفوس میں مدفون ہو ۔ تم ۔ اہم ۔۔۔۔ اس نے گلا صاف کیا ۔ ہم ۔۔۔۔" ویرانے نے تمسخر بھری آواز میں جواب دیا ۔

لیکن وہ تینوں بانہیں پھیلائے کھڑے رہے اور بھیڑیں رینگتی رہیں ۔ رینگتی رہیں ۔

Engr Fariz Ikram

پاگل

میں پاگل ہوں ۔ میرا پاگل پنا صرف اس لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ اب میں جان گئی محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں ۔ ہاں ۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا ۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی ۔ لیکن اب پچھتانے سے حاصل ۔ وقت بیت چکا ۔ جو ہونا تھا ہو چکا ۔

کون ہے جو میری کہانی سے واقف نہیں ۔ میں وہ بدنصیب عورت ہوں جو دنیا بھر میں بدنام ہے ۔ جسے دیکھ کر کہنیاں چلتی ہیں ۔ انگلیاں اُٹھتی ہیں ۔ آنکھوں میں عریاں اشارے جھلکتے ہیں ۔ لوگ دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں ۔ تمسخر بھری مسکراہٹ وہ یوں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں ۔ گویا میں دنیا کی حسین ترین عورت ہوں ۔ جھوٹ ہے! سراسر جھوٹ !! میں ایک دبلی پتلی اداس عورت ہوں اور بس گورا رنگ حسن نہیں ہوتا ۔ سُتے ہوئے لمبے چہرے کو خوبصورتی سے کیا تعلق ۔ البتہ میری آنکھ ۔ لیکن نہیں ان آنکھوں میں اداسی اور بے بسی کے سوا کیا ہے شوخی نہیں ۔ چمک نہیں خمار نہیں تبسم نہیں ۔ پھر ان کی نگاہیں میری آنکھوں کو تلاش کیوں کرتی ہیں ۔۔۔۔۔ کیوں ؟ ان چھلکی ہوئی کٹوریوں میں غم کے سوا کیا ہے ۔ پھر بھی انہیں چھپا چھپا کر رکھتی ہوں ۔ شکر ہے کہ میری پلکیں اتنی لانبی ہیں ۔ شاید میرے اِن بہے ۔ آنسو بال بن کر اگ آئے ہیں ۔ لیکن لوگ کسی صورت چین نہیں لینے دیتے ۔ پلکیں اٹھا کر دیکھوں تو یوں ٹھٹھکے جاتے ہیں ، جیسے سدھ بدھ نہ رہی ہو ۔ پلکوں سے ڈھانپے رکھوں تو یوں جھانکتے ہیں گویا میں چغتائی کا عمل ہوں ۔ آوازے کستے ہیں ۔۔۔۔۔ اُف ان کی وہ عریاں باتیں ۔ ننگی نگاہیں ۔۔۔۔۔ وہ مجھے ایسی عورت سمجھتے ہیں جس کے بارے میں جو جی چاہے جہاں جی چاہے کہا جا سکتا ہے ۔ اور یہ سب اس دیوانے رضا کی مہربانی ہے ۔۔ وہ ہوشیار دیوانہ ۔۔۔۔۔ اُف اس کی گھناؤنی

شکل ۔ سوجا ہوا چہرہ ۔ اورخاموش وحشت بھری نگاہیں ۔ میں جانتی ہوں وہ دیوانہ نہیں ۔ دیوانگی کے پردے میں مجھ سے انتقام لے رہا ہے ۔ اُف کس قدر خوفناک انتقام ہے اس کا ۔ ہوس کار فریبی !! کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے ۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ میں نے اُس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اپنا شریک حیات آپ چُننے کا مجھے حق نہیں کیا ؟

ہاں اسے مجھ سے محبت تھی ۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ میں نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا ۔ لیکن کیا مجھے اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل نہیں ؟ اگر مجھے وعدہ کرنے کا اختیار ہے تو اسے توڑنے کا کیوں نہیں ؟ اور ۔ کیا وہ وعدہ میں نے توڑا تھا ۔ میں!! میری حقیقت ہی کیا ہے ۔ حالات کے ہاتھوں میں کٹ پتلی ! یہ حالات جن سے میں گذر رہی ہوں ۔ کیا یہ میرے بنائے ہوئے ہیں ۔ اُف یہ حالات!! یہ بھوکی نگاہیں ۔ چلتی ہوئی کہنیاں ۔ جیسے لوگوں کو مجھے گھورنے کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو ۔ جیسے بھوک سے بلبلاتے وحشی مردوں کے جہاں میں صرف میں ہی ایک عورت ہوں ۔

کیسے اچھے تھے وہ دن جب میں لاہور کی بھیڑ میں تنہا تھی ۔ جب میں بے فکر جہاں جی چاہے بھاگی دوڑی پھرتی تھی ۔ کوئی میری طرف گھورتا نہ تھا ۔ سرسری نگاہیں اور بس ۔ پھر میں اور رضا اکٹھے سیر کرنے لگے ۔ لیکن کوئی ہمارے اکٹھے گھومنے پر معترض نہ تھا ۔ ان دنوں لوگ ہماری راہ سے ہٹ کر اپنی راہ ناپا کرتے تھے ۔ ان دنوں بھی تو میں میں تھی ۔ یہی میں ۔ یہی رنگ ۔ یہی آنکھیں ۔ پھر ۔۔۔۔۔۔ ؟ آہ!! ان دنوں میری زندگی میری اپنی زندگی تھی ۔ لیکن اب ۔ اب وہ گویا عوام کی ملکیت بن چکی ہے ۔ لیکن کیوں ؟ ۔۔۔۔۔ ہر راہ گیر مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے وہ میرا راز جانتا ہو ۔ جیسے میں ان کے ہاتھ کا کھلونا ہوں ۔ جیسے میں ان کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی ہوں ۔ گویا میں نے صرف دکھاوے کے لئے کپڑے پہن رکھے ہیں ۔ جیسے وہ نگاہوں سے میرے کپڑے ۔۔ اُف!! میں سمجھتی ہوں میری حالت ان عورتوں سے بدتر ہے ۔ جو علانیہ طور پر لالٹین جلا کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ لوگ انہیں گھورتے ہیں جانچتے ہیں ۔ پرکھتے ہیں ۔ لیکن ان کی نگاہیں ان کے کپڑوں میں دھنسنے کی

کوشش نہیں کرتیں ۔ جیسے ۔ جیسے کوئی پلپلا گھناؤنا کیڑا رینگ رینگ کر سوراخ کر رہا ہو ۔ لوگ انہیں دیکھ کر راز افشا کرنے کی خاموش دھمکی نہیں دیتے ۔ سودا کرتے ہیں ۔ ناک چڑھا لیتے ہیں یا منہ موڑ کر چل دیتے ہیں ۔

ہاں میری حالت اخلاق سے گری ہوئی ان عورتوں ۔۔۔۔۔ لیکن نہیں ۔ کون جانتا ہے کن حالات نے گھسیٹ کر انہیں وہاں لا بٹھایا ہے ۔۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے ۔ نہ جانے میں ۔۔۔۔ لیکن نہیں میں آپ سے کچھ نہ چھپاؤں گی ۔۔۔۔۔ چھپانا ؟ میں اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے رہی ہوں ۔ کہ میرے پاس اب بھی چھپانے کو کچھ باقی ہے ۔ جھوٹی تسلی نہیں تسلیم کرتی ہوں کہ بارہا میرا جی چاہا کہ میں لالٹین جلا کر بیٹھ جاؤں ۔ اور اپنا آپ کو ان عریاں اشاروں اور نگاہوں سے محفوظ کر لوں ان دھنس جانے والی ٹٹولتی ہوئی نظروں کی زد سے بچ جاؤں ۔ ایسا کرنے سے جسم روندا جائے گا ۔ روح تو بچ جائے گی ۔ اب وہ میری روح کو لتاڑ رہے ہیں ۔ ۔۔ لیکن مجھ میں جرأت بھی ہو ۔ ہاتھ کا کھلونا بننے لئے جرأت ہونی چاہئیے اور مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ برقعہ پہن لیتی ۔ ڈرتی رہی کہ لوگ کہیں گے ۔ غیر مسلم ہو کر برقعہ پہنتی ہے ۔ ڈرتی رہی کہ مزید چرچا ہوگا ۔ فقرے کسے جائیں گے ۔ پہن لیتی ۔ تو نہ جانے وہ دیوانہ کیا کرتا ۔ لوگ نگاہوں سے نوچ لیتے ۔ دھجیاں اڑا دیتے جب تنگے منہ کی بے نمائش عمومیت مجھے چھپا نہ سکی تو پردہ کیا چھپا سکتا تھا ۔ وہ پردا جس کی اوٹ لے کر ایک عام عورت بھی حسین بن سکتی ہے اور راہ چلتے لوگوں کے لئے سنگار کئے ہوئے چہرے سے زیادہ پر جوش دعوت بن جاتی ہے ۔

خیر اب تو میں بڑی حد تک اس جیتی جاگتی بدنامی سے بے نیاز ہو چکی ہوں ۔ جو قدرت نے میرے ماتھے میں کیل بنا کر ٹھونک رکھی ہے ۔ لیکن جب سوچتی ہوں ۔ کہ میں نے کیا سہا ہے تو دل پر ٹھیس لگتی ہے ۔ بچ ۔ بچ ۔ سمٹ سمٹ کر جھکی جھکی آنکھوں سے چلنے کے باوجود میں یوں محسوس کیا کرتی گویا زمین کی بجائے نگاہوں پر پھسل رہی ہوں ۔ نگاہوں کا تانتا بند جاتا ۔ ایک تار ٹوٹنے سے پیشتر دوسرا بندھ جاتا ۔ ایک دھنس کر دیکھتا ۔ دوسرا مسکرا مسکرا کر برماتا ۔ تیسرا گلیڈ آئی کی جونک لگا دیتا ۔ ہونٹ ہلتے ۔ آوازے کسے

جاتے ۔ "وہ ہے"۔۔۔ "وہ ۔" "دیکھا" ۔۔ "اسے جانتے ہو" ۔۔۔۔۔ "بانکی ہے بانکی" ۔ گلیوں میں دروازے کھلتے ۔ "اچھا ۔ یہ ہے وہ" ۔ "ہائے ری یہ کافرہ" ۔ ہاں ۔ ہاں یہی ۔ کوئی مسکراتا ۔ کوئی ناک چڑھاتا ۔ عورتیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حیران کھڑی ہو جاتیں ۔ آپ چاہے کسی سے آنکھیں لگائے ہوئے ہوں ۔ لیکن مجھے دیکھ کر ہاتھ کانوں پر رکھ لیتیں جیسے ابھی ابھی حج کر کے آئی ہوں مجھے دیکھ کر ناک سکوڑ لیتیں اور پھر میاں یا دیور کی طرف دیکھ کر مسکراتیں تیکھی مسکراہٹ ۔ برہنہ دعوت ۔ بھوکے ساتھی کے ہونٹ لیسدار جونک کی طرح لٹک آتے اور ہوس سے اندھے گوشت کے لوتھڑے قریب ہی کچھ ڈھونڈنے لگتے ۔ یہ ہیں وہ لوگ جو مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ کوئی انتقامی جوش سے بھرا ہوا مرد میری محبت میں دیوانہ ہو جانے کا ڈھونگ رچائے بیٹھا ہے ۔ گلی کوچوں میں میرے نام کے نعرے لگاتا پھرتا ہے ۔ دیوانہ ہونے کے باوجود اس قدر ہوشیار ہے کہ ہر سے عشق پیچاں کا پھول اٹھائے اس سے باتیں کرتا رہتا ہے ۔ میرا نام "آئی وی" ہے نا اس لئے ۔ دیوانہ ہونے کے باوجود مجھ سے عشق کرنے کے دعوے کو نہیں بھلا سکا ۔ اتنا نہیں بھولتا کہ میں کس راہ سے ہسپتال جاتی ہوں ۔ وہ دیوانہ جو جگہ جگہ میرے پیچھے سایہ کی طرح لگا رہتا ہے ۔ شہر شہر میرا پیچھا کرتا ہے ۔ مجھے اس کی ہوشیاری اور ضد پر حیرانی ہوتی ہے ۔ اُف وہ ہوشیار دیوانہ جس کا وجود محبت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔

لوگ سمجھتے ہیں میں اس کی دیوانگی کا باعث ہوں ۔ اُف یہ لوگ اور ان کی باتیں وہ اس خبطی کو عشق کا پیغامبر سمجھتے ہیں ۔ اس کی ہر حرکت ان کی نگاہ میں محبت اور وفا کا مرقع ہے ۔ وہ میری ہر بات سے بے وفائی اور ستم کیشی اخذ کرتے ہیں ۔ اور پھر ان اخذ کی ہوئی تفصیلات کو اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دے کر خوش ہوتے ہیں ۔ یہاں سے کاٹ چھانٹ کی ، وہاں بڑھایا چڑھایا تاکہ کہانی سنسنی خیز ہو جائے انہیں سنسنی پیدا کرنے سے لطف آتا ہے ۔ ان کی سن سن کر میں آپ اپنے قصے کی حقیقت پر شک کرنے لگی ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا ، آیا میری بات سچی ہے یا وہ جو زبان زد خلق ہے ۔ لیکن ایک بات زبان زد خلق

Engr. Faraz Akram
aliurdubooks.blogspot.com

ہو۔ تو بھی سمجھ میں آئے۔ ہر کوئی اُسے یوں ترتیب دینے پر تلا ہوا ہے۔ کہ رضا کی محبت بلند تر دکھائی دے۔ اس کی دیوانگی قربانی نظر آئے اور میری خاموشی بے حسی ظلم اور نہ جانے کیا۔ بات یوں ڈھالی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہو کہ مجھ سے بڑی فاحشہ کوئی نہیں۔ ابھی تک مجھ میں تمیز باقی ہے۔ چھوٹی موٹی تفصیلات تو خلط ملط ہو چکی ہیں۔ لیکن اہم تفصیلات یاد ہیں مجھے۔

آپ رضا کو نہیں جانتے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دیوانہ رضا ہے تو آپ کی بھول ہے۔ وہ رضا کچھ اور تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس روز میری ڈیوٹی ڈی وارڈ میں لگی ہوئی تھی۔ نائٹ ڈیوٹی۔ دس کے قریب وہاں پہنچی۔ اور حسب معمول راؤنڈ کرنے لگی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ اور پھر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اکثر مریض ہمیں دیکھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے اس فانی دنیا میں کوئی غیر فانی مخلوق کو دیکھ کر اوسان کھو رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود رضا کا انداز نرالا تھا۔ اس کی نگاہ میں بناوٹ کی بجائے بے ساختگی کی جھلک تھی۔ شاید اسی وجہ سے میں جھینپ گئی۔ میں نے جلدی سے اس کا ٹکٹ دیکھا اور دوائی بنا کر لے آئی۔ دوائی پیتے ہوئے بھی وہ میری طرف تکتا رہا۔

اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ جو کھیل کے میدان میں ٹوٹی تھی۔ اس کے سوا اُسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ چوکور چہرہ۔ سانولا رنگ کشادہ پیشانی پر کنڈل دار بال اور مست آنکھیں۔ جن پر گھری بھویں تنی ہوئی تھیں۔ نہ جانے انہیں دیکھ کر یہ احساس کیوں ہوتا کہ کوئی سانپ کنڈلی مار کر بیٹھا ہے۔ شاید اس لئے کہ ان بھوؤں میں بلا کا اضطراب تھا۔ راؤنڈ کے بعد میں اپنی نشست پر آبیٹھی۔ اسے دیکھے بغیر میں محسوس کر رہی تھی۔ کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس احساس کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے آنکھ بچا کر ادھر دیکھا۔ اس کی نگاہیں میرے منہ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور یوں بیٹھ رہی۔ جیسے کوئی شدت سے کام میں مصروف ہو۔ لیکن آخر کب تک یوں بیٹھ رہتی۔

تمام مریض سو گئے یا چپ چاپ پڑ رہے۔ وارڈ کے پرلے سرے پر دو ایک کراہ رہے تھے۔ لیکن وہ گردن موڑے میری طرف تک رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ نیند نہیں آتی تمہیں۔ میں نے پاس جا کر اسے کہا۔ وہ چونکا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے نا۔ میں نے لاپرواہی سے سرسری طور پر کہا۔ میں بڑے مزے میں ہوں"۔ وہ مسکرایا۔ لیکن اس طرح صحت پر برا اثر پڑے گا۔ "صحت ۔۔۔۔ تمہاری قسم میں تو جینے لگا ہوں۔ کب سے مردوں کی طرح پڑا تھا۔ مگر اب ۔۔۔۔۔"

دو ایک دن تو میں نے کوشش کی کہ رضا سے بے نیاز رہوں۔ لیکن میں کیا کرتی۔ ساری ساری رات وہ میری طرف تکتا رہتا۔ حتٰی کہ اس احساس کی وجہ سے مجھے کام میں مشغول دکھائی دینا مشکل ہوگیا۔ پہلے پہل میں بہانے بہانے سارے وارڈ میں پھرا کرتی تھی۔ لیکن دو ہی دن میں مجھے اِدھر اُدھر جانا دوبھر دکھائی دینے لگا۔ جلدی جلدی جاتی اور پھر کام ختم کرکے واپس آجاتی۔ نہ جانے کیوں میں نے کرسی کو بھی ایسے مقام پر سرکا لیا تھا۔ جہاں سے وہ میرا سارا چہرہ دیکھ سکے۔ بہت جلد ہم اچھے خاصے دوست بن گئے۔ اس کا بات کرنے کا انداز انوکھا تھا۔ تکلف سے عاری۔ بات کرتے ہوئے جھجکتا بھی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اظہار محبت کے سوا اسے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ ہر بات میرے ذکر پر ختم ہوتی۔ پوچھتی ہوں۔ آپ کو چوٹ کیسے آئی۔ جواب ملتا ہے۔ "کیوں نہ آتی چوٹ نہ آتی تو تم سے کیسے ملتا"۔ لیکن اس روز جب اس نے سنا کہ میں دوسرے وارڈ میں لگنے والی ہوں۔ تو نہ جانے اسے کیا ہوا۔ ایک ساعت کے لئے اس کا منہ لال ہوگیا۔ "بس اتنی سی بات پر" میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "اتنی سی بات!" وہ ہنسا۔ اف، وہ ہنسی۔ اسی کی ہنسی میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ جی چاہا ادھر ادھر ہو جاؤں۔ "اتنی سی بات!" وہ پھر ہنسا۔

نہ جانے کیوں اتنی سی بات پر میں کیوں اس قدر پریشان ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میں نے اپنی ڈیوٹی بدل لی۔ یہ میری غلطی تھی۔ اگر میں اپنی ڈیوٹی ایکسچینج نہ کرتی تو حالات نہ بگڑتے۔

چند ہی دنوں میں وہ مجھ سے بے تکلف ہوگیا ۔ اصل میں اس کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی تھی ۔ کہ اس سے باتکلف رہنا ممکن نہ تھا ۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ چند ہی باتوں میں وہ دوسرے کو مانوس کر لیتا ۔ اس کی ہر بات گھونگھٹ اٹھا دینے والی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ امید نہ تھی ۔ کہ وہ ایسی جلدی مجھے شادی کا پیغام دے دیگا ۔ آپ جانتے ہیں ۔ نرس کی ڈیوٹی دوا پلانے اور پٹی کرنے تک محدود نہیں ہوتی ۔ ہمیں ہر مریض کا دل بہلانا پڑتا ہے ۔ ہماری حیثیت مریض کے ہاتھ کے کھلونے سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ تو میں رضا کا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی لیکن مجھے یہ وہم بھی نہ تھا ۔ کہ میری ہر بات کسی ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ہو رہی ہے ۔ مجھے واضح طور پر شعور نہ تھا ۔ کہ میری باتوں میں محبت کی جھلک ہے ۔ ہر مریض نرس سے اظہار محبت کرنا چاہتا ہے ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ نہ جانے کیوں نرس ، کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا اس پر عاید ہو جاتا ہے ۔ چاہے جان جسم سے نکل کر ہونٹوں پر اٹکی ہوئی ہو ۔ نہ جانے اس وقت وہ اس دئیے کی طرح مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں ۔ جس کا تیل ختم ہو چکا ہو ۔

اس وقت لیٹا ہوا وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اور میں اس کے ٹکٹ پر اندراج کر رہی تھی ۔ اس نے مجھے بلایا اور پاس آنے کا اشارہ کیا ۔ میں سرسری طور پر اس کے پلنگ پر جھکی ۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا ۔ بولا ”ایک بات پوچھوں“ ۔ ہاں ہاں میں نے لاپرواہی سے کہا ۔ اس نے بلا تکلف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اور کہنے لگا ۔ ”مجھ سے شادی کرو گی ۔ آئی وی“ میں چونک پڑی لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر مذاق سے بولی ۔ ”شادی ؟“ ”ہاں“ ۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا ۔ ”اور اگر میں ”نہ“ کہہ دوں تو ؟“ میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی تو ۔۔۔۔۔ تو وہ پریشان ہوگیا ۔ جیسے یہ امکان اس کے خواب و خیال میں ہی نہ تھا ۔ ”تو نہ جانے کیا ہو جائے“ ۔ وہ گنگنایا ۔ کیا ہو گا میں مسکرائی ”کیا ہو گا“ ۔ اس نے اردگرد دیکھ کر کہا ۔ یہ بتیاں بجھ جائیں گی ۔ اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا ۔ ”وہ چاند ٹوٹ کر نیچے گر پڑے گا ۔ تارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گل ہو جائیں گے ۔ اور یہ دنیا ۔۔۔۔۔“

بہت کچھ ہو گا پھر تو“ ۔ میں ہنسی ۔ ”ہاں“ اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہوگیا ۔ بھویں سکڑیں ۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا ۔۔۔۔۔ مذاق نہ سمجھو آئی وی ۔ مذاق میں اڑاؤ“ ۔ میں اس کے سنجیدہ اور وحشیانہ انداز کو دیکھ کر گھبرا گئی ۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔ مجھے سوچنے دو“ ”اچھا“ وہ تیوری چڑھا کر بولا ”انکار نہ کرنا ورنہ ۔۔۔“ اس کا انداز دیکھ کر میں کانپ گئی ۔ ”جوش میں نہ آؤ مسٹر رضا ٹانگ ہل جائے گی“ ۔ ٹانگ ”وہ چلّایا“ اگر یہ ٹانگ تمہارے اور میرے درمیان حائل ہے ۔ تو تمہاری قسم میں اسے اکھاڑ کر پھینک دوں گا“ ۔

اس دن سے مجھے رضا سے ڈر آنے لگا ۔ اس کے جوش اور شوق کی شدت کو دیکھ کر میں سہم جاتی ۔ اس کی تنی ہوئی گھنی بھویں یوں ابھرتیں جیسے طوفان میں گرداب اٹھ رہے ہوں ۔ اس سے میل ملاپ بند کر لینے کی ہمت نہ تھی ۔ سو بات بڑھ گئی ۔ اس کی توقعات بڑھ گئیں ۔ اس کی نگاہیں میرے لئے مخصوص ہوگئیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ۔ کہ وہ صرف میرے لئے جیتا تھا ۔ صرف میرے لئے ۔ جس قدر ڈرتی اسی قدر اسے جھٹلانا مشکل ہوتا جاتا ۔ میری خاموشی اس کی توقعات کو ہوا دیتی ۔ خوف کے باوجود یا شاید اسی لئے میرا دھیان اس کی طرف لگا رہتا ۔ جیسے کبوتری شکاری کی بندوق کو دیکھ کر دہشت سے بے حس و حرکت بیٹھی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے ۔

جلد ہی وہ دن آگیا ۔ جب وہ خود چلتا ہوا میرے گھر آیا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب ہمارے تعلقات میں مریض اور نرس کی سی بات نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس نے خود کو فریب دے دے کر اپنے آپ کو مریض بنا رکھا تھا ۔ ایسا مریض جس کی صحت کا دارومدار مجھ پر تھا ۔ میں ہمیشہ کے لئے اس کے نزدیک نرس بن چکی تھی ۔ میرے گھر وہ صرف دو ایک مرتبہ آیا ۔ اس کے بعد مجبوراً مجھے حقیقت کا اظہار کرنا پڑا ۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ۔ کہ اسے انکار کے لئے تیار کر دوں ۔ لیکن اب ان تفصیلات سے فائدہ ؟

انکار سن کر وہ ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپا ۔ اس کی بھویں سمٹیں منہ سرخ ہوگیا ۔ پھر دفعتاً اُس نے ایک قہقہہ لگایا ۔ کرخت اور بھیانک قہقہہ ۔

Engr Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

اس کے بعد ہر روز ہسپتال جاتے ہوئے راہ میں کہیں نہ کہیں وہ قہقہہ گونجتا۔ وہی کھوکھلی آواز جس میں تمسخر اور طنز بھرا ہوتا۔ جیسے دور۔ دور کوئی بدروح اس دنیا کی جھوٹی مضحکہ خیز باتوں پر تمسخر اڑا رہا ہو۔ پھر وہ قہقہہ ہمارے ہسپتال کی دیواروں میں سے رسنے لگا اور بالآخر میرے مکان کے گرد امنڈ آیا۔ ایک دن جب میں کھڑکی میں کھڑی نہ جانے کس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ گلی کی نکڑ پر کھڑا تھا۔ سُوجا ہوا منہ اکڑی ہوئی بھویں۔ بلوری پھٹی پھٹی آنکھیں ــــــ اُف وہ منظر!! میں نے ڈر اور نفرت بھری پھریری محسوس کی اور جھجک کر پیچھے ہٹی ــــــ پھر وہی قہقہہ۔ اف وہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ چہرے کے خطوط یوں ابھر سمٹ رہے تھے۔ جیسے جانکنی کے عذاب میں مبتلا ہو۔ بصد مشکل میں نے اپنے آپ کو اس منظر سے علیحدہ کیا۔ اور دھڑام سے چارپائی پر آگری۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ ہر جگہ وہی قہقہہ گونجنے لگا۔ حتٰی کہ تمام دنیا اس کی گونج کی لپیٹ میں آگئی۔ پھر حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ وہ میرے مکان تلے کھڑا میرا نام لے لے کر پکارتا۔ چیختا۔ قہقہہ مار کر ہنستا۔ میرے نام کا نعرہ گلی کوچوں میں گونجنے لگا۔ ہسپتال کی دیواریں آئی۔ وی آئی۔ وی کی صداؤں سے گونجنے لگیں۔ باغ کی روشیں۔ سڑکیں۔ بازار۔ اف!! لوگ میری طرف گھورنے لگے۔ مسکرانے لگے۔ کہنیاں چلیں۔ آنکھیں چمکیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

اِن حالات نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ میں زخمی پرندے کی طرح تڑپتی دبک کر کونوں کی طرف کھسک جاتی۔ میری پلکیں اور بھی جھک جاتیں۔ میرا جسم سمٹ کر معدوم ہونا چاہتا ــــــ لیکن بے سود!! میں نے مکان بدلے ہسپتال بدلے ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے میں چلی گئی۔ لیکن وہ دیوانہ ہر جگہ جا پہنچتا۔ ہر جگہ وہ میرا مکان ڈھونڈ لیتا۔ اور ایک روز میں دیکھتی کہ وہ میری دہلیز پر بیٹھا ہاتھ میں آئی۔ وی کا پھول لئے اس سے باتیں کر رہا ہے۔ ہر نئے شہر میں نئے سرے سے چرچا ہوتا۔ نئے جوش سے باتیں ہوتیں۔ نئی نگاہیں ــــــ اف! اب میں نے شہر بدلنے کا خبط چھوڑ دیا ہے۔ کیا

فائدہ۔

انہیں دنوں مسٹر ظہیر مجھ سے ملے وہ پہلے شخص تھے جنہیں مجھ سے ہمدردی تھی۔ ورنہ لوگ تو مجھے ڈائن سمجھتے تھے۔ وہ ڈائن جس نے جس نے اپنے جادو سے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اپنے اس شہکار پر نازاں تھی۔ نہ جانے لوگوں کو دیوانوں سے ہمدردی کیوں ہوتی ہے۔ ان کی ہر بات میں نکتہ پیدا کر لیا جاتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں لوگوں کو انوکھے واقعات سے عشق ہے۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ عشق و محبت کی کوئی کہانی معمولی واقعات سے بنی ہو۔ اس لئے وہ ہر آپ بیتی میں انوکھے پن کا رنگ بھرتے رہتے ہیں ــــــ زبان زدِ خلق ہو کر ہماری کہانی میں کیا کیا رنگ نہ بھرے گئے۔ نئی انوکھی تفصیلات جوڑی گئیں۔ رضا کی قربانیاں میرے ظلم حتّٰی کہ ہر قصہ ایک عجیب سا قصہ بن گیا۔ ایک ان سنا قصہ اب تو بارہا مجھے خود شک پڑ جاتا ہے۔ کہ شاید وہ قصہ صحیح ہے۔ مجھے اپنی یادداشت پر اعتبار نہیں رہا۔ ہاں تو ظہیر پہلا شخص تھا۔ جس سے دلی ہمدردی تھی۔ اس کے دل میں اس دیوانے کے خلاف بغض تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جاتی جس سے ظاہر ہوتا۔ کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں رضا کی مظلومیت اور میری بے وفائی کے تاثرات دبے ہوئے ہیں۔ میں سن کر چونک پڑتی۔ دھک سے میرے سینے میں کچھ ڈولنے لگتا گردوپیش دھندلا جائے۔ مثلاً اس روز وہ ازارہ مذاق بولا۔ "وہ دیوانہ سچا ہے۔ آئی۔ وی تمہارا انداز ہی کچھ ایسا ہے۔ کہ پاگل ہوئے بنا رہا نہیں جاتا" "کیوں"۔ میں چڑ گئی "میں کیا بے وفا ہوں"۔ "نہیں"۔ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ "بے وفا نہیں لیکن تمہاری وفا بذات خود دیوانہ کن ہے"۔ پھر وہ ہنس پڑا لیکن یہ بات میرے دل پر پتھر کی لکیر بن گئی۔ میں ایک حساس لڑکی ہوں۔ بات میرے دل میں کھب کر مجھے غم کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ اور میں یوں محسوس کرنے لگتی ہوں۔ جیسے نشے میں ہوں۔ سدھ بدھ نہیں رہتی ــــــ ہاں

یہ بات ظہیر کے دل کی گہرائیوں میں گڑی ہوئی تھی ۔ ورنہ مذاق میں بھی وہ ایسی بات کھول کر نہ کہتا ۔۔۔۔ اکثر بیٹھے بٹھائے ایک آہ بھر کھینچ کر وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتا ہے ۔ "آئی ۔ وی ۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دو تو ۔۔۔۔" میرے دل پر ایک ٹھیس سی لگتی ہے ۔ مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی پوچھتی ہوں "تو" ۔۔۔۔ "تو" ۔۔۔۔ شاید میں بھی کسی دہلیز پر آئی ۔ وی کا پھول لے کر بیٹھ جاؤں ۔ "مسٹر ظہیر ۔۔۔ !" میں غصے میں چلاتی ہوں ۔ لیکن وہ اپنی دھن میں مگن کہے جاتا ہے ۔ "کس قدر نشہ ہے اس احساس میں کہ کوئی میرے لئے دیوانہ ہو چکا ہے" ۔ "ہاں" میں جل کر کہتی ہوں" ۔۔۔۔ بہت ۔۔۔۔ ایک ہو چکا ہے ۔۔۔۔ ایک ہو رہا ہے" ۔ میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں ۔ اس لئے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ لیکن اس نے مجھے غلط سمجھا ۔ اُف محبت میں کیا کیا برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ اس روز جب اس نے کہا ۔ "آئی ۔ وی ۔ مجھے خیال سے آتا ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا ۔ تو میرے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی ۔ "کیوں ۔۔۔۔" "شاید میں اس بات پر فخر محسوس کرنا چاہتا ہوں کہ میں اُس کا محبوب ہوں ۔ جسے شہر کے لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں ۔ اور بس" "اچھا" میں زبردستی مسکرائی اور چھیڑنے کی خاطر بولی ۔ "لیکن یہ نہ بھولئے صاحب کہ ہر بلندی کو سر چکرا دینے کی بری عادت ہے" ۔ وہ ہنسا ۔ "ہاں رضا نے دیوانہ بن کر اپنا تحفظ کر لیا ہے ۔ تمہاری مہربانی بے اعتنائی دونوں دیوانہ کن جو ہوئے کوئی کیا کرے" ۔ تو آپ بھی اپنا تحفظ کر لیں" میں چڑ گئی ۔۔۔۔ "شاید" وہ بولا ۔ تمہاری بلندی کو قائم رکھنے کے لئے مجھے قربانی دینا پڑے" ۔

اف ظہیر کی وہ باتیں ۔ مگر ان باتوں کے باوجود یا شاید انہیں باتوں کی وجہ سے میں اس کی طرف کھچی جاتی ہوں ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے اس کا ایک جزو مجھ سے نفرت کرتا ہے ۔ ڈرتا ہے مجھ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے نہ جانے کیوں مجھے سوچنے سے بیر ہے ۔ اسے سوچ بچار میں دیکھ کر میں چڑ جاتی ہوں ۔ مشتعل ہو جاتی ہوں ۔ لیکن اس کے باوجود مسحور ہو کر بیٹھ رہتی ہوں ۔ ایسے محسوس کرتی ہوں جیسے مجھے اپنے آپ پر قدرت نہ ہو ۔۔۔ کچھ سمجھ میں

نہیں آتا ۔۔۔۔ لیکن مجھے ظہیر سے والہانہ محبت ہے ۔ پاگل ہوئی جا رہی ہوں ۔۔۔۔ اس کے باوجود لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے پاگل کرنے سے لگاؤ ہے ۔ دیوانہ بنانے سے دلچسپی ہے ۔۔۔۔ اف یہ لوگ!!

آخر وہ دن آ پہنچا ۔۔۔۔ اف وہ دن !! گویا مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ۔ میری دبی دبی دیوانگی طوفان بن کر اٹھی اور چھا گئی ۔

میں ہسپتال سے واپس آ رہی تھی ۔ حسب معمول وہ دیوانہ مجھ سے دس پندرہ قدم پیچھے ہاتھ میں آئی ۔ وی کا پھول لئے اس سے باتیں کرتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا ۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے پیچھے آیا کرتا تھا ۔ جب میں گھر یا ہسپتال میں داخل ہو جاتی ۔ تو وہ وہیں سڑک کے کنارے دہلیز پر بیٹھ جاتا ۔ لوگ اسے دیکھتے ہی سمجھ جاتے کہ میں کہیں آس پاس ہی ہوں ۔ نگاہیں اٹھتیں آنکھوں میں چمک لہراتی کہنیاں چلتیں ۔ انگلیاں اٹھتیں ۔ جھکی جھکی آنکھوں سے سمٹ سمٹ کر چلنے کے باوجود خواہ مخواہ مجھے یہ احساس ہوتا کہ بونوں کے بازار میں گلیور چل پھر رہا ہے ۔۔۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میں فضا پر چھائے جا رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔ چھائے جا رہی ہوں ۔

بھوں ۔۔۔ بھوں!! دفعتاً بازار میں چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں ۔۔ پھر ایک چیخ ۔۔۔ "آئی ۔ وی ۔۔" میں نے پہلی مرتبہ مڑ کر دیکھا وہ سڑک کے درمیان موٹر تلے چت پڑا تھا ۔ بایاں بازو آئی ۔ وی کے گرے ہوئے پھول کی طرف بڑھا ہوا تھا ۔ جیسے اسے اٹھانے کے لئے پھیلا رکھا ہو ۔ اب تک وہ بازو اسے اٹھانے کی آرزو سے تڑپ رہا تھا ۔۔۔ اف وہ منظر' ہونٹ ہل رہے تھے ۔ "آئی وی ۔۔" آنکھیں پھول کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں ۔۔۔ کسی نے پھول اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا ۔ ایک بار اس کی آنکھیں شکر گذاری کے جذبہ سے بھیگ گئیں ۔ میں حیرانی سے بت بنی کھڑی تھی ۔ چیخ مار کر بھاگ جانا چاہتی تھی ۔ مگر پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے جب وہ اسے موٹر میں ڈال کر ہسپتال لے گئے تو دفعتاً وہ طلسم ٹوٹا اور میں گھر کی طرف بھاگی چاروں طرف ایک ہنگامہ بپا تھا ۔ لوگ ایک دوسرے باتیں کر

رہے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس روز میں نے محسوس کیا ۔ جیسے میں کسی ویرانے میں چل پھر رہی تھی ۔ کسی وسیع کائنات میں حقیر کیڑے کی طرح رینگ رہی تھی ۔

اس دھندلکے میں میں نے سُنا وہ مرگیا ۔ میں نے ایک دھچکا محسوس کیا ۔ میری دنیا ڈولی ۔ نہ جانے کیوں بار ہا میں نے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ مرجائے میرے ماتھے سے بدنامی کا ٹیکا مٹ جائے میں سمجھتی تھی اس کے مرنے پر مجھے مسرت ہوگی ۔ میں آزاد ہو جاؤنگی دنیا میرے لئے اس قدر وسیع ہو جائے گی ۔ جیسے کسی زمانے میں تھی ۔ لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے ۔ گو مجھے اُس کی موت پر غم نہ ہوا ۔ لیکن خوشی بھی نہ ہوئی ۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں سمٹ کر معدوم ہوگئی ہوں ۔ اور ارد گرد کی اشیاء ابھر کر بلند ہوتی جا رہی ہیں ۔ وہ اس قدر پھیل گئیں کہ میں ان میں دفن ہو کر رہ گئی ۔ دفعتاً دنیا نے انگڑائی لی اور میں سمٹی ۔ میں نے محسوس کیا ۔ جیسے میں دیوؤں کے ملک میں ایک بالشتیا تھی ۔

اسی شام کو ظہیر آیا نہ جانے وہ اس قدر مضطرب کیوں تھا، بولا ۔ "میں چاہتا ہوں آئی ۔ وی ۔۔ میں چاہتا ہوں جلد ہماری شادی ہو جائے" ۔ نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہو ۔ شاید چھیڑنے کی غرض سے میں نے کہا" اور اگر نہ ہوسکے تو ۔۔۔۔" معاً اس کا چہرہ غصے یا نہ جانے کس بات سے سوج گیا ۔ اف وہ چہرہ! مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے رضا دوبارہ جنم لے رہا ہے ۔ "تم چاہتی ہو میں بھی پاگل ہو جاؤں"۔ وہ چلایا میرے دل میں ایک وحشت بھرا جذبہ کھولنے لگا ۔ میں ہنسی ۔ دیوانہ وار ہنسی ۔ اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہوتا گیا ۔ میں اٹھ بیٹھی میری نظر کھڑکی سے باہر تھی ۔ وہ وسیع پھیلاؤ سمٹنے لگا ۔ لوگ کبڑے ہوتے گئے ۔ بالشتیوں کے ملک میں کوئی گھیور آکھڑا ہوا ۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں ۔ دیوانی ہوں ۔ ان حالات میں ظہیر کی زندگی برباد کرنا ۔ "نہیں یہ نہیں ہو سکتا"۔ میں چلائی "یہ کبھی نہ ہوگا ۔ "میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی خوشی ظہیر کے لئے قربانی کر رہی ہوں ۔ وہ جوں کا توں کھڑا تھا ۔ آنکھوں کی چمک بُجھ گئی تھی ۔ منہ سوج گیا

اور چہرے پر وحشت چھا گئی تھی ۔۔۔ شاید یہ میری آنکھوں کا دھوکا تھا ۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کا کوئی حصہ تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے ۔ لیکن مجھے تسکین تھی ۔ کہ میں نے اپنے محبوب کو ایک دیوانی سے محفوظ کر لیا ہے ۔ مجھے اپنا خیال نہیں ۔۔۔۔ میرا کیا ہے ۔۔۔۔ اپنے آپ کو محبوب کے لئے قربان کر دینا، کیا یہ محبت کی انتہا نہیں ۔۔۔۔ ؟ لیکن لوگ !! وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے ۔۔۔۔ نہ سمجھیں! مجھے اس سے کیا ۔۔۔ !؟

ہاں میں پاگل ہوں ۔ میرا پاگل پن صرف اسی لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے ۔ اب میں نے جان لیا کہ محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں ۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا ۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی !! لیکن اب پچھتانے سے حاصل!!؟

دروازہ

”یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے ۔ رینا ۔ او رینا !! ۔ اور یہ کھڑکیاں بھی ۔ اور کون ہو گا ۔ بس وہی رینا ۔ اور کون ۔ جانے کہاں چلا گیا ہے ۔ اب کیا ہو گا ۔ اس کا بس چلے تو سب دروازوں پر تالے لگ جائیں“۔ وہ اپنے آپ ہی بڑبڑاتے رہے اور پھر دفعتاً ان کی نگاہ ہم پر پڑی ۔ ”اوہ ! تم ہو پرکاش ۔ تم آ گئے بہت اچھا کیا تم نے ۔ بہت اچھا کیا ۔ اچھا ہوا تم آ گئے“۔

”میرے ہم جماعت ہیں“۔ پرکاش نے میری طرف اشارہ کرکے کہا ۔

”بلراج“

”اچھا اچھا ۔ بہت اچھا ہوا ۔ بڑی مہربانی ہے“ ۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ۔ آپ آگئے ۔ اچھا ہوا ۔ پھر انہوں نے حسرت سے بند دروازے کی طرف دیکھا ۔ ”مگر یہ دروازہ“۔ ! ؟ اور پھر میری طرف معذرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بولے ۔ ”دیکھو نا ۔ سبھی دروازے بند کردیتا ہے ۔ رینا آدمی بہت اچھا ہے ۔ بہت بھلا آدمی ہے ۔ بس دروازے بند کر دیتا ہے ۔ گویا ہم قیدی ہیں ۔ دیکھا آپ نے ۔“ اور ان کے ہونٹوں پر مایوس مسکراہٹ چھا گئی ۔ ”اچھا ہوا آپ آ گئے“۔ وہ از سرنو بڑبڑانے لگے ۔ گویا کچھ کہنے کیلئے بول رہے ہوں ۔ اپنی آواز کا سہارا لے رہے ہوں ۔ ”پرکاش نے میرا نام دہرایا“۔

”ہاں ۔ ہاں ۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ۔ نہیں رہتے ۔ آپ بیٹھ جائیں ۔ آپ مسٹر راج ۔ بیٹھ جائیے ۔ اور پرکاش ! ان کے لئے چائے بھول گئے ۔ اچھا اچھا ۔ کوئی بات نہیں ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ پر وہ رینا ۔ نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے ۔ بس چلا جاتا ہے ۔ اور دروازہ ، یہ دیکھو نہ جانے کیوں بند کر جاتا ہے ۔ لیکن وہ آ جائیگا ۔ وہ ہمیشہ آجایا کرتا ہے ۔ آپ بیٹھئے سب

ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب“ ۔

میں نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا ۔ ان کی آنکھوں میں بے بس چمک کو دیکھکر میں نے کیوں ایسا محسوس کیا گویا کسی کال کوٹھڑی میں کوئی دروازہ کھلنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ شدت احساس سے میں اٹھ بیٹھا اور میں نے دروازہ کھول دیا ۔ مجھے دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ خوشی سے چلانے لگے ۔ ”ہاں ہاں کھول دیجئے بہت مہربانی ہے ۔ بڑا اچھا کیا آپ نے“۔ اور پھر مجھے کھڑکی کی طرف جاتے دیکھ کر بڑبڑانے لگے ۔ ”اچھا تو یہ بھی سہی ۔ بڑی اچھی بات ہے مہربانی ہے ۔ بڑا اچھا ہوا ۔ بڑا اچھا ہوا آپ آگئے ۔ اچھا تو میں چائے ------ لیکن وہ رینا ۔ وہ نہیں آئے گا“۔ ان کی نگاہ میں یوں حسرت جھلکی گویا وہ رینا کے نہ آنے کے خلاف مجھ سے اپیل کر رہے ہوں ۔ گویا رینا کے نہ آنے سے پتہ نہیں کیا ہو جائے گا ۔ پھر اس گہری نیلگوں جھیل میں ایک طوفان جھولنے لگا ۔ اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے ۔ ”اچھا تو میں ہو آؤں مجھے جانا ہی ہو گا ۔ آپ بیٹھیں مجھے جانا ہے ۔ میں ہو آؤں ذرا“۔ انہوں نے گویا مجھ سے اپیل کی ۔ ”پرکاش بیٹے ! تم مسٹر ------ مسٹر ------ کے لئے چائے بنوا لینا ۔ میں ہو آؤں “۔

”جی، اچھا جی میں بلراج کے لئے چائے بنوا لوں گا ۔ آپ فکر نہ کریں“۔ پرکاش نے کہا ۔

”ہاں ، ہاں“ وہ خوشی سے بڑبڑانے لگے ۔ ”چائے بنوا لینا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا“۔ گویا اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہوں ۔ ”رینا ضرور آ جائے گا“۔ وہ آ تو جایا کرتا ہے ۔ لیکن ------ اچھا میں جاتا ہوں ۔ میں ذرا ہو آؤں“۔ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے ۔

”اولڈ گوز“۔ پرکاش انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دبی آواز سے بولا ۔

”دماغ ۔۔“ پرکاش نے انگلی سے سر کو بجاتے ہوئے معنی خیز انداز سے کہا ۔ ”چکر“

”چکر ؟“۔ میں نے چونک کر پوچھا ۔

لیکن وہ پھر بڑابڑاتے ہوئے اندر آگئے ۔ "لو !" وہ نہایت یاس بھرے انداز میں بولے ۔ " دروازہ بھی بند ہوگیا ۔ اب کوئی کیا کرے ؟" انہوں نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ دروازہ جو ہے"۔ پرکاش نے طنزاً بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا ۔

"اوہ"۔ یہ تو میں بھول ہی گیا وہ چونک کر بولے ۔ "ہاں یہ دروازہ جو ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ بھول جاتا ہوں میں" انہوں نے معذرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا ۔ "بھول جاتا ہوں مسٹر ۔۔ مسٹر ۔۔"

"مسٹر بلراج" پرکاش نے طنزاً دہرایا ۔

"مسٹر بلراج ! میں بھول جاتا ہوں ۔ اچھا تو آپ بیٹھیں آپ"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے ۔

"اف یہ دروازے کا مینیا ۔ پرکاش نے منہ بنا کر کہا ۔ "کریک ہے کریک ۔ تم چپ کیوں ہو" ۔ وہ مجھے گھورنے لگا ۔

"ہاں ہاں کریک" میں چونک کر بولا ۔ نہ جانے اس وقت میرے دل پر بوجھ کیوں پڑا ہوا تھا ۔ نہ جانے مجھے اس وقت تمام دنیا ایک بند دروازے کی طرح کیوں دکھائی دے رہی تھی۔ " نہیں نہیں میں خاموش تو نہیں"۔ میں نے کہا ۔

"خاموش نہیں تو یہ گیان دھیان کی تصویر کیوں بنے ہوئے ہو" ۔ وہ بولا میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ۔

" اس سڑی بڈھے کی باتوں پر نہ جاؤ"۔ وہ بولا ۔ نہ جانے بوڑھا ہو کر انسان سڑی کیوں ہو جاتا ہے"۔

"شاید ہم بھی ہو جائیں" ۔

"میں! ؟ میں تو اس سے پیشتر اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا"۔

"چھوٹے بابو جی آئے ہیں"۔ رینا اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا "میں نے کہا تھا بڑے بابوجی سے کہا تھا میں نے ۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا ۔

جرور آئے گا کوئی میں نے کہا ۔ سو آگئے چھوٹے بابو ۔ پچھول میں تو نہیں پھڑکی میری آنکھ کبھی ۔ کل سے جو پھڑک رہی تھی ۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا ۔ اور سب اچھے ہیں نا ۔ پر آپ تو کالج سے آئے ہیں نا ۔ اور چائے نہیں پی کیا ۔ ابھی تو نہیں پی ہوگی ۔ پیتے بھی کیسے میں تو اب آرہا ہوں ۔ ابھی لائے دیتا ہوں ۔ ابھی ۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر وہ اندر جانے لگا ۔ لیکن دفعتاً رک گیا اور دیوار کی طرف دیکھ کر بولا ۔ "بڑے بابوجی کہاں گئے ۔ اندر تو نہ ہوں گے وہ"۔

پرکاش بولا ۔ "ابھی باہر گئے ہیں"۔

وہ ہماری طرف مخاطب ہو کر شکایت کرنے لگا ۔ "نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں ۔ کہاں مارے مارے پھرتے ہیں ۔ بس میں ہو آؤں ہو آؤں میں جیسے دھیتر جانا ہو"۔ وہ ہنسا ۔ "چھوٹے بابو دیکھو نا ہر سمے گھومتے رہتے ہیں ۔ جیسے کوئی چھوکرا سکول سے بھاگ رہا ہو ۔ اب کوئی کہاں تک ان کے پیچھے مارا مارا پھرے ۔ پچھول میں ۔ کل باگ میں بیٹھے تھے ۔ دیکھا مجھے تو اٹھ بیٹھے ۔ اچھا تو اب گھر ہی جانا ہے نا ۔ جانا جو ہوا گھر ۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے ہے چھوٹے بابو ۔ پر آپ کی چائے "۔ دفعتاً وہ چونک کر بولا ۔ "ابھی لاتا ہوں چھوٹے بابو ابھی"۔ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہوگیا ۔

پرکاش کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ "دیکھا یک نہ شد دو شد"۔

لیکن نہ جانے مجھے ہنسی کیوں نہ آئی ۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ "یہاں ڈاکٹر کا تو پتہ ہی نہیں ۔ دونو ہی مسٹر ہائیڈ ہیں"۔ پرکاش مسکرایا ۔ "ایک دروازے بند کرتا پھرتا ہے اور دوسرے انہیں کھولنے کے لئے ترستا ہے ۔ مگر اتنا نہیں کر سکتا کہ خود تکلیف کرکے کھول لے ۔ عجب تماشا ہے ۔"

"ہاں" میں نے مسکرانے کی کوشش کی ۔

"چپ کیوں ہو تم"۔ وہ مجھ سے بگڑا ۔

"چپ کہاں ہوں"۔ میں نے چمک کر کہا ۔

"چپ تو ہو تم"۔ وہ بولا ۔ "تم بھی تو یہاں آکر بند کھڑکی بن گئے ہو"۔

kitaabghar.blogspot.com

”چلو تم ہی کھلا دروازہ ، سہی“۔ میں نے اسے چڑانے کیلئے کہا ۔

”ہم تو ہیں ۔“ وہ بولا ۔ اور اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا ۔ ”آخر ہمیں کوئی کھلی کھڑکی مل ہی جائے گی نا“۔ یہ کہہ کر وہ باہر دیکھنے لگا ۔

”ارے“ وہ چلایا ”یہ سنا تم نے“۔

”نہیں تو“ میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ ”کیا ہے ؟“

”یہ آواز“۔۔۔۔۔ بڑی سریلی ہے“۔

”آواز“ میں نے پوچھا ۔

”سنتے نہیں“ وہ بولا ۔ یہ بغل کے کمرے سے آواز آرہی ہے اس دیوار سے اس طرف ۔ ”میں دیکھ آؤں ذرا“ پرکاش باہر نکل گیا ۔ اور میں پھر اپنے خیالات میں کھو گیا ۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش ہنستا ہوا لوٹا ۔ ”بھئی واہ کیا چیز ہے اس ساتھ والے کمرے میں“۔

”چاہے اپنے گھر ہی سے کوئی ہو“۔

”واہ“۔ وہ ہنسا چچا تو اکیلے رہتے ہیں ۔ اور یہ کمرے کرائے پر ہیں ۔ کیا سمجھے ؟ جانتے ہو ۔ کون ہے سلاخدار کھڑکی کے پیچھے ؟ یوں بیٹھی ہے ظالم ، جیسے کوئی کماری قید ہو ۔ لیکن دوست ! یوں معلوم ہوتا ہے گویا پہلے ہی سے کوئی نگاہ پر چڑھا ہوا ہے ۔ منتظر بیٹھی ہیں آپ ۔۔۔۔۔ تم نے آواز نہیں سنی تھی ۔ اچھا اب بولی تو بتادوں گا ۔ ارے یار صاف آواز آتی تھی ۔ یہ ساتھ والا کمرہ تو ہے ذرا دھیان رکھنا“۔

”لو ۔ سارے دروازے کھل گئے ہیں“۔ رینا بڑبڑاتا ہوا چائے لے کر داخل ہوا ۔ ”اب کوئی کیا کرے ۔ بابوجی تو حد کردیتے ہیں ۔ حد ۔ میں پوچھوں اگر ٹھنڈ لگ جاوے تو ۔ اور ٹھنڈ نہیں تو بجار باتیں ہیں ۔ کتا بلی آجاوے تو اس نے چائے میز پر رکھ دی اور آپ بھی تو اتنی جماعتیں پاس ہیں چھوٹے بابو ! بھلا ایسی بات بھی سنی ہے کبھی ۔ یہ درواجہ کھول دو ۔ گھر نہ ہوا دُکان ہوئی ۔ اور

سچ پوچھو چھوٹے بابو ! تو دکان بھی ایسے نہیں ہوتی“۔

”رینا“ پرکاش بولا ۔ ”یہ دروازے کھولنے کا خبط ہے کیا ؟“

”کون جانے چھوٹے بابو ۔ میری سمجھ میں تو نہ آوے ہے یہ بات ۔ جوانی میں تو اچھے بھلے تھے ۔ ان کی طرح“ اس نے میری طرف اشارہ کیا ۔

”جی !“ رینا چمکا ۔ ”بڑے ٹھاٹھ تھے جب تو ۔ بڑا مجاج تھا ۔ رام کا دیا کاپھی تھا مہاراج ۔ پھر جوانی بھر کر آئی تھی ۔ ہجاروں میں ایک تھے ۔ یہ اونچا لمبا قد اور درد بھری آنکھیں مست دکھیں تھی ۔ پر چھوٹے بابو جب بھی چھپ چھپ کے رہتے تھے ۔ اکیلے میں بیٹھ رہتے ۔ نہ ہنسی نہ مجاک ۔ چُپ سی لگی رہتی تھی ۔ پر پھیشن میں پیچھے نہ رہتے ۔ یہ گلے میں بندھنے والی اور مہاراج سوٹ ۔۔۔۔۔ بڑی ٹس پھس تھی“ ۔ اس نے ایک آہ بھری ۔ میں بھی تو جوان تھا ان دنوں ۔ چھوٹے بابو بس سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا“۔

”ہوں تو بڑے مزے میں رہتے تھے چچا جی“۔ پرکاش مسکرانے لگا ۔

رینا نے آنکھ سے ایک ان بہا آنسو پونچھا ۔ ”جی بڑے مجے میں ۔ یہیں اسی سڑک پر مکان لیا ہوا تھا ۔ ادھر چوک کی طرف چوبارہ تھا ایک ۔ سڑک پر ہی ہے وہ بس بابو جی اور میں ۔

”نسبت روڈ پر“ ۔ پرکاش چلایا ۔ ”یہاں تو میلا لگا رہتا ہے نا لڑکیوں کا۔“

”اونہوں چھوٹے بابو“۔ اس نے سر ہلایا ۔ ”ان دنوں تو یہ جگہ کھالی پڑی تھی ۔ اکا دکا مکان تھا ۔ ہاں کالج کے سمے گجرتی تھیں ۔ بس دو ایک“۔

”دو ایک“۔ پرکاش نے پوچھا ۔ ”لیکن رینا ! یہ بھی کیا کم ہے ۔ ہمیں تو ایک بھی میسر نہیں آتی“۔

”ہی ہی ہی“ ۔ وہ ہنسا ۔ ”چھوٹے بابو تو مجاک کرتے ہیں“ اس نے مجھے مخاطب کرکے کہا ۔ ”پر آپ جانیں ہیں ۔ ”رسوئیہ کو کون پوچھے ہے مہاراج ۔ ہاں بابو جی“۔ وہ پھر ہنسا ۔ بڑا رنگیلا مجاج تھا ان دنوں بابو جی کا ۔ پر چھوٹے

بابو کے سمان تیج نہ تھے ۔ بس بھیتر ہی بھیتر کُھش ہو جاتے تھے ۔

"اچھا تو ہم تیج ہیں"۔ پرکاش مسکرایا ۔

"چھوٹے بابو" اس نے آہ بھر کر کہا ۔ "جوانی سبھی کو تیج بنا دیوے ہے ۔ پر سچ بتاؤں ۔ بابو جی میں یہ بات نہ تھی ۔ بس چپکے سے دیکھا اور پی گئے ۔ پر وہ جالم ! توبہ ہے چھوٹے بابو وہ تو آپھت تھی آپھت"۔

"وہ کون" ۔ پرکاش نے مزید دلچسپی سے پوچھا ۔

رینا اپنے ہی خیال میں کہتا گیا ۔ "اب بھی جو یاد آوے ہے تو جی بیٹھ جاوے ہے"۔ اس نے ایک آہ بھری "پر چھوٹے بابو دل کی بڑی اچھی تھی وہ"۔

"ارے یہی تو نہیں جو اس کمرے میں رہتی ہے"۔ پرکاش نے دیوار کی طرف اشارہ کرکے پوچھا ۔

"لو چھوٹے بابو ! میں تو جب کی بات کر رہا ہوں" رینا بولا ۔

"بھئی ساری بات بتاؤ تو پتہ چلے نا" پرکاش نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا ۔

"کیا بتاؤں چھوٹے بابو ۔ جب وہ سڑک پر سے گجرتی تو کھانچے والے سودا دینا بھول جاتے"۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "وہ بھی کیا دن تھے میں جو سبجی بنا رہا ہوں اور وہ گجرے ، تو چھوٹے بابو یوں سدھ بدھ ماری جائے کہ چاکو سے انگلی کٹ جائے ۔ یہ دیکھو ! اس نے بائیں انگلی دکھاتے ہوئے کہا ۔ کئی بار کٹی یہ انگلی ۔ اسے دیکھ کر تو بڈھے بھی ٹھوکر کھا جاتے تھے ۔ اور وہ مسکراتی اور یوں چلے جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ بڑی تیج تھی وہ ۔ چھوٹے بابو کی طرح ۔ پر منہ دیکھو تو بھولا بھالا ۔ اور جو وہ نجر اٹھا کر دیکھے تو دم نکلے تھا ۔ ایسا روپ تھا اس کا ۔ بڑا روپ تھا ۔ چھوٹے بابو ! ۔ اور چلتی تھی ۔ ہوا میں چلتی تھی وہ ، پیٹھ پر مہاراج ، دو چوٹیاں ۔ یوں پھدکتی تھیں ۔ وہ چوٹیاں ۔ کیا بتاؤں چھوٹے بابو ۔ بڑے گھر کی تھی ۔ یہی اپنے گوبند لال سیٹھ کی بٹیا ۔ اکیلی بٹیا تھی ۔ لاڈلی تو ہونا ہی تھا ۔ پر ان دنوں ہمیں کیا کھبر تھی سیٹھ گوبند لال کی ۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ لکھ پتی ہیں ۔ ہمیں تو یہ بھی کھبر نہ تھی بھئی ، وہ سیٹھ گوبند لال کی بیٹی ہے ۔ اور چھوٹے بابو !" وہ پھر ہنسنے لگا ۔ "ہمارے بابو جی چھپ چھپ کے دیکھیں تھے اُسے ۔ کبھی رسوئی میں آجاتے ۔ بہانے بہانے ۔ رینا کیا بناؤ گے آج ۔ رینا چائے تو بڑی اچھی بنائی تھی آج ۔ رینا کیا حال چال ہے ۔ پر چھوٹے بابو میں جانتا تھا ، سب جانتا تھا کہ وہ کھڑکی میں دیکھنے کو آئے ہیں ۔ میں نے بھی کبھی نہ جتایا تھا اُنہیں ۔ پر انہیں یوں بہانے بناتے دیکھ کر گُسہ آتا تھا مجھے"۔

"غصہ تو آنا ہی تھا پرکاش بولا ۔ تمہیں دیکھنے کا موقعہ جو نہ ملتا تھا"۔

"ہی ہی ہی ہی ۔ رینا ہنسا ۔ "لو چھوٹے بابو بھی کیا بات کرتے ہیں ۔ حد کرتے ہیں یہ بھی ۔ بھلا مجھے کون پوچھے تھا وہاں ۔ میں ویسے ہی دیکھتا تھا مجاک میں ۔ گُسہ تو مجھے یوں آوے تھا کہ بابو جی کو دیکھنا تھا تو کھل کے دیکھتے یوں چھپ چھپ دیکھنے سے پھائدہ ۔ آپ ہی بتائیں"۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا ۔ "یہ آج کل کی چھوریاں بھلا چھپ چھپ کر دیکھنے کو کیا جانیں ہیں ۔ آپ ہی بتائیں مہاراج ۔ وہ تو چاہیں ہیں کہ کوئی سامنے کھڑا ہو کر راستہ روکے ۔ وہ جانے لگے چھوٹے بابو جب چھپ چھپ کر رونا چلے تھا ۔ پر ہمارے بابو جی نے تو حد کردی ۔ کالج جانا چھوٹ گیا ۔ بس پڑے رہتے ۔ گاتے رہتے ۔ اور اس کا انتجار کرتے رہتے ۔ آنے کا وکت ہوا تو اٹھ بیٹھے ۔ منہ ہاتھ دھو ، کپڑے پہن ، اکڑے ہوئے ۔ رینا کیا بن رہا ہے ------ آکھر میں نے سمجھایا ۔ میں نہ سمجھاتا چھوٹے بابو تو سمجھاتا کون ۔ میرا سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا ۔ اسی گھر میں ۔ میں نے کہا ۔ بابو جی جو چاہیں کریں آپ ۔ میں کچھ نہیں کہتا پر کالج نہ جائیں آپ تو کیسی بُری بات ہے ۔ لالہ جی ناراج ہوں گے ۔ مجھے ڈانٹیں گے ۔ کہ رینا تم نے ہمیں کھبر کیوں نہ کی ۔ میں نے کہا وہ بھی تو جاتی ہی ہے کالج ۔ اس بات پر چھوٹے بابو ۔ بابو جی کا رنگ ہلدی ہو گیا ۔ پر وہ بولے نہیں پی گئے ۔ یہ ان کی آدت ہے ۔ پھر انہوں نے کالج جانا شروع کردیا چھوٹے بابو پر ----- میں بھی دیکھتا رہا ۔ چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ۔ کہ کیا

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

کرتیں ہیں ۔ تو مہاراج کپڑے پہنے ، چائے پی ۔ جلدی جلدی اور پھر نیچے اتر گئے اور پان والے بھیئے کے پاس جا کھڑے ہوئے ۔ بہانے بہانے ، کبھی پان کھا ، کبھی سگرٹ پی ۔ کھڑے رہے ۔ پھر جب اُسے دور سے آتے دیکھا تو اُسی طریھ چل دیئے ۔ ان کا کالج اسی طریھ تھا نا ۔ وہ اس پٹڑی پر ہوتی اور یہ اس پٹڑی پر ہو لیتے اور پھر بہانے بہانے دیکھتے چھپ چھپ کر ۔ میں کھڑکی سے سب دیکھتا رہتا ۔ چھوٹے بابو ہر بات کو دیکھتا تھا میں ۔ اپنے بابوجی ہولے ہولے چلتے ۔ وہ تو پہلے ہی مجے سے چلتی تھی ۔ اس کی چال ہی ایسی تھی چھوٹے بابو ۔ مجے مجے چلتی تھی وہ“ ۔

”اور وہ بھی تو بابو جی کو دیکھتی ہوگی ۔ کیوں رینا“ ۔ پرکاش نے پوچھا ۔

”اس کا کیا تھا چھوٹے بابو وہ تو کسی کو بھی نہ دیکھے تھی ۔ پر سب کو دکھتی وی مالوم ہووے تھی“ ۔

”تمہیں بھی“ ۔ پرکاش مسکرایا ۔

”ہی ہی ہی“ ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ ”مجھے دیکھتی تو تھی وہ ۔ پر چھوٹے بابو وہ تو اس نل کو بھی دیکھے تھی ۔ جو پٹڑی پر لگ ریا تھا“ ۔ اس نے اک آہ بھری اور بولا اس کے دیکھنے کی کیا پوچھیں میں آپ ۔ وہ تو ہوا ہیں چلے تھی ۔ ہوا میں ۔ پر میں نے دیکھا تھا ، بابو جی کہ دیکھ کر اس کے منہ پر ہنسی آجاوے تھی ۔ ہلکی سی ، پر کیا مجال جو وہ ہنس جائے کھل کر ۔ بڑا روب تھا اس کا جی ۔“ اس نے ایک اور آہ بھری اور خاموش ہوگیا ۔ پھر وہ آپ ہی آپ چونک کر بولا ۔ ”پھر یوں ہوا ۔ کہ وہ پان والا بھیا جسکی دکان سے بابو جی پان کھاتے اور انتجار کرتے تھے ۔ کہنے لگا ۔ کیوں بابوجی ! کیا چھوکری ہے ۔ بڑی تیج ہے تیج ۔ اور چھوٹے بابو کیا پوچھو ہو ۔ سڑک پر کون تھا جو یہ نہ جانے تھا کہ بابو جی اس کی انتجار کرتے ہیں ، سبھی جانتے تھے مہاراج سبھی ۔ پر ہمارے بابوجی یہ سمجھتے تھے کہ سبھی اندھے ہیں ۔ اندھے ۔ لو مہاراج“ وہ مجھ سے مخاطب ہوا ۔ ”بھلا لگن کی بات بھی چھپ سکے ہے کہیں ۔ اور پھر یہ بات ۔ مہاراج یہ بات تو جی میں آئی اور یوں اُچھلی جیسے ربٹ کا گیند“ وہ ہنسنے لگا ۔ ”تو چھوٹے بابو اس

روج سے بابو جی نے دکان پر کھڑے ہونا چھوڑ دیا ۔ اور وہ اور بھی نکّو بن گئے ۔ اس بات کو ہنس کر ٹال دیتے تو وہ کیا منع کرتے انہیں ۔ تو جی ۔۔۔۔۔ انہوں نے وہاں کھڑے ہونا چھوڑ دیا ۔ پھر پرلی پٹڑی پر نل کے پاس جا کھڑے ہوتے ۔ اور جب وہ دور سے نجر پڑتی تو اس کی طرف چل دیتے“ ۔

”اسی پٹڑی پر جس پر وہ آتی تھی ؟“ پرکاش نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا ۔

”جی ، اسی پٹڑی پر“ رینا چمک کر بولا ۔

”بڑی ہمت پیدا ہوگئی تھی“ ۔

”جی ! پہلے تو یہ بات نہ تھی پر آپ جانیں ہیں ۔ دھیرے دھیرے آس بندھ ہی جاتی ہے چھوٹے بابو ۔ پھر بھی جب دونوں میں تھوڑا سا پھاسلہ رہ جاتا تو بابو جی پٹڑی کو چھوڑ ، سڑک پر اُتر آتے اور پھر سڑک پار کر کے دوسری پٹڑی پر آجاتے ۔ پر مہاراج وہ مگن چلے جاتی ۔ ویسے ہی اسی پٹڑی پر ۔ میں دیکھتا تھا جب بابو جی سڑک پر اُترتے تو وہ پرلی طرف منہ کر کے ہنس دیتی ۔ لیکن کیا مجال جو منہ سے کچھ پتہ چلے ۔ ایسی تیج تھی وہ ، اور میں دیکھتا رہتا چھوٹے بابو ۔ بابو جی کو ۔ دونوں کو ۔ عجب دن تھے وہ بھی ، چھوٹے بابو“ ۔ رینا خاموش ہوگیا ۔ یوں کھوگیا ۔ گویا خواب دیکھ رہا ہو ۔ لیکن اس سہانے خواب کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں ۔ گویا کسی ساکن اور گہری جھیل میں تیر رہی ہوں ۔ ”ہاں چھوٹے بابو“ اس نے اک بے بسی اور حسرت سے بات شروع کی ۔ کیا دن تھے وہ ۔ میں ان کو دیکھنے میں اپنا کام کاج بھی بھول جاتا ۔ بس صبح وشام کھڑا ان کو دیکھتا رہتا ۔ پر یہ اپنے آپ میں مگن تھے ۔ انہیں کیا مالوم کہ رینا دیکھ ریا ہے ۔ وہ سب جانتا ہے ۔ انہیں تو اپنی بھی سدھ بدھ نہ تھی ۔ پر وہ ۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا نام تھا اس کا ۔ بھلا سا نام تھا ۔ بل ۔ بل ۔ بل“ اور وہ سوچ میں پڑگیا ”بلراج ۔۔۔۔۔ ؟“ پرکاش بولا اور اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا ۔

شاید اس نے پرکاش کی بات نہ سنی ۔ ”بل ۔ بلبیر کماری ۔ وہ بولا ۔ ہاں

Engr. Faraz Akram
kitaabyat.blogspot.com

ہاں بلبیر کماری ۔ وہ کماری بڑی پرکھ والی تھی ۔ میں جانوں اسے سب پتہ تھا اسے"۔ مالوم تھا میں دیکھ ریا ہوں ۔ جب وہ میری رسوئی کی کھڑکی کے سامنے آتی تو جرور ایک نجر اٹھا کر دیکھتی ۔ گور سے دیکھتی تھی ۔ جانتی ہوگی وہ کہ میں بابو جی کا رسوئیہ ہوں ۔ جرور جانتی ہوگی ۔

"تم بھی تو جوان تھے"۔ پرکاش مسکرانے لگا ۔

"آپ تو مجاک کریں ہیں ۔ اس نے حسرت بھری آواز سے کہا ۔ جوانی تو چھوٹے بابو اُنہیں ہی آوے ہے جنہیں رام نے دیا ہے ۔ رسوئیہ کی جوانی بھی کیا جوانی ہے ۔ چھوٹے بابو ۔ وہ تو رسوئیہ ہوا ۔ چاہے بڈھا ہو یا جوان ۔ اور پھر مہاراج وہ لکھ پتی کی بٹیا ۔ آپ تو مجاک کریں ہیں مہاراج ! ۔ اس نے ایک آہ بھری اور مجھے مخاطب کرکے کہا ۔ پھر اک دن بابو جی ادھر سے جا رئیے تھے ۔ اور کماری اُدھر سے آ رئیی تھی ۔ جب دونوں میں تھوڑا پھاسلہ رہ گیا اور بابو جی روج کے سمان پٹڑی سے سڑک پر اُترے تو وہ بھی پٹڑی چھوڑ سڑک پر اُتر آئی ۔ شاید وہ بھی اس ورلی پٹڑی پر آنا چاہے تھی مہاراج ! بابوجی یہ دیکھ کر یوں گھبرائے کہ ایک بھینس جو جا رئیی تھی اس سے جا ٹکرائے اور وہ مسکرائی ۔ پر چھوٹے بابو ۔ بابو جی کو بہت چوٹ آئی ۔ اور وہ دیوی مسکرا کر اپنی راہ چلی گئی مڑ کر بھی نہ دیکھا اُس نے"۔

اگلے روج بابو جی کالج جانے کی جِد کرنے لگے ۔ پر چھوٹے بابو میں نے جانے نہ دیا ۔ اتنا بڑا جکھم ہوگیا تھا ٹانگ پر ! میرے کہنے سے گئے تو نہ پر جی ، دیکھے بنا نہ رہ سکے ۔ گسلکھانے کی کھڑکی سے دیکھتے رئیے ۔ ادھر میں بھی دیکھ ریا تھا کہ دیکھوں آج بابو جی کو پٹڑی پر نہ پا کر کیا کرتی ہے وہ ۔ میرا کھیال تھا چھوٹے بابو ، کہ اس رانی کا کیا گیا تھا ۔ اس کی بلا سے چاہے کوئی مرے یا جئے ۔ پھر وہ آئی اور اس نے دور سے دیکھا چاروں طرپھ دیکھا ۔ اور پھر یوں چپ چاپ چلے گئی جیسے مٹی کی بنی ہو ۔ نہ وہ لٹک ، نہ ہنسی ۔ دوسرے دن بھی وہ یونہی گجری ۔ پر تیسرے دن وہ نل کے پاس آکر رُک گئی ۔ نل رسوئی کی کھڑکی کے سامنے تھا ۔ بالکل سیدھ میں ۔ رکی ، پھر چلنے لگی ۔ پھر رُک گئی اور سر اٹھا کر اوپر

دیکھا ۔ میری طرپھ ۔ اور چھوٹے بابو میرا تو جی بیٹھ گیا ۔ ایک تو اس کا روب اور دوسرے اس کی آنکھیں لال سی ہو رئیی تھیں ۔ پھر ہاتھ اٹھا کر انگلی سے مجھے بلایا ۔ اور چھوٹے بابو ! میں گولی سمان اڑ کر پہنچا اور پاس جا کھڑا ہوا ۔ بولی ۔ تم رسوئیہ ہو ۔ میں نے سر ہلایا ۔ کہنے لگی تمہارے بابو کیسے ہیں ۔ جیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔ چوٹ تو آئی ہے پر اچھے ہو جائیں گے ۔ میں نے جواب دیا پھر بولی ۔ تم یہاں اکیلے رہتے ہو ۔ میں نے سر ہلا دیا اور کہا میں اور بابوجی ۔ بس چھوٹے بابو پھر وہ چلی گئی"۔ اس نے اک آہ بھر کر کہا ۔ "واپس آیا تو بابوجی رستہ روکے کھڑے تھے ۔ بولے ۔ کہاں گیا تھا رینا ۔ جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں ۔ مجھے مالوم تھا چھوٹے بابو کہ وہ گسلکھانے میں چھپ کر دیکھ رئیے ہیں ۔ میں نے آپ دیکھا تھا انہیں ۔ میں نے منہ پکا کر لیا ۔ اور کہا ۔ جری بھیا کے پاس گیا تھا ۔ پھر بابو جی منتیں کرنے لگے ۔ نہیں نہیں رینا سچ بتاؤ کیا کہتی تھی وہ ۔ مجھے مجاک سوجھا ۔ کیوں نہ سوجھتا" ۔ وہ چمک کر بولا ۔ "وہ کیوں چھپ چھپ کر کرتے تھے بات ! میں نے کہا ۔ کہتی تھی تمہارے بابو جی بیاہ کرینگے مجھ سے ۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں ۔ میری جُبان ہی ایسی ہے ۔ بس جو کہدوں پورا ہو جاوے ہے ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یونہی ہو جائے گا"۔ اس نے آہ بھر کر کہا ۔

"اچھا ۔ ـــ ـــ ـــ تو یونہی ہوا کیا ۔ بڑے دھرماتما ہو تم" ۔ پرکاش بولا ۔

رینا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا ۔ "جی دھرماتما کیا بنوں گا میں ، میری جُبان ہی ایسی کالی ہے ۔ اِدھر بات نکلی ادھر پوری ہو گئی ۔۔۔۔۔ بس جی کیا بتاؤں مہاراج ۔ دوسرے دن وہ کماری آپ ہی آپ اوپر آگئی ۔ گھر میں ۔ میں آلو چھیل ریا تھا ۔ اور بابو اندر پلنگ پر پڑے تھے ۔ وہ تو پڑے ہی رہتے تھے نا ۔ ابھی جکھم اچھا نہ ہوا تھا ۔ ہو بھی جاتا چھوٹے بابو تو دل کا جکھم تو تھا ہی ۔ دل کا جکھم کب اچھا ہووے ہے چھوٹے بابو"۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "کبھی نہیں کبھی نہیں"۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں بھی کوئی دل کا زخم لگا ہے"۔ پرکاش اُسے چھیڑنے لگا ۔

"اجی مہاراج" ۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا ۔ "کون ہے جسے دل کا جکھم نہ ہووے ہے ، چاہے رسوئیہ ہی کیوں نہ ہو ۔ سبھی کو ہووے ہے چھوٹے بابو ۔ کیا بھاگوان کیا نردھن" ۔

"اچھا تو وہ تمہارے گھر آگئی" ۔ پرکاش نے اسے یاد دلایا ۔

"جی ہاں تو آلو چھیل رہا تھا میں ۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو کماری جی کھڑی ہیں ۔ میں تو کھڑا رہ گیا اور چھوٹے بابو ، چاقو اتنا سا انگلی میں چلا گیا ۔ اور مجھے مالوم بھی نہ ہوا ۔ اور کھون بوند بوند گرے ہے اور وہ حیران ، دیکھے ہے میری طرپھ ۔ ادھر بابو جی نے دیکھ لیا ہوگا ۔ اور وہ جکھم والی ٹانگ سمیت اٹھ کر درواجے میں آکھڑے ہوئے ۔ اور میں حیران کھڑا بابو جی کو دیکھوں ہوں ۔ اور بابوجی کماری کے منہ پر نجر جمائے حیران کھڑے دیکھیں ہیں ۔ چھوٹے بابو اس روج تو" وہ ہنسنے لگا ۔ "اس روج تو بائیسکوپ ہو رہا تھا ۔ ہمارے گھر میں ، پھر مہاراج نہ جانے کماری جی کو کیا ہوا ۔ مڑ گئی جیسے جا رہئی ہو اور میں حیران کہ آئی بھی اور چل بھی دی ۔ اُدھر بابو جی بڑبڑائے اور پیچھے دوڑے ، پر دو کدم رک کر کھڑے ہو رہے ۔ پھر میں ہی بولا ۔ چائے تو پی جاتے دیوی جی ۔ تیار ہی ہے اور وہ بن دیکھے بولی ۔ آج نہیں پھر سہی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اترتی گئی ۔ اور بابوجی نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہے ، انہیں پوری بات کرنے کی ہمت بھی ہوئی ؟ پھر وہ آپ ہی نچلی سیڑھی پر پہنچ کر رکی ۔ ہم دونوں تو کٹہرے سے لگے نیچے جھانک رہے تھے ۔ نجر بھر کر اوپر دیکھا اور بولی اب تو تمہارے بابو جی اچھے ہیں نا رسوئیہ ! جی جی ۔ بڑی مہربانی ہے بابوجی بڑبڑائے اور میں بھاگ کر نیچے اتر گیا ۔ میں نے کہا دیوی جی چائے تو پی جائیے ۔ اور وہ مسکرا کر کہنے لگی ۔ نہیں رسوئیہ ، پھر سہی ۔ پھر آؤں گی میں ۔ اور جی ، یہ کہہ کر پھر اوپر دیکھا بابوجی کی طرپھ اور مسکرائی" رینا ایک آہ بھر کر خاموش ہوگیا ۔

کچھ دیر کے بعد اس نے آپ ہی سلسلۂ کلام جاری کر دیا ۔ "اگلے روج وہ پھر آئی ۔ اس روج تو میں نے بٹھا ہی لیا ۔ میں نے کہا دیوی آج تو چائے پلائے بنا نہ جانے دونگا میں ۔ یہ آپی کا گھر ہے ۔ یہ سن کر وہ مسکرائی اور نیچی

نجر سے بابوجی کو دیکھا وہ بھی مسکرائے ۔ بڑی تیج تھی وہ ۔ بڑی" ۔

"جب میں چائے لے کر آیا چھوٹے بابو ! اور انہیں ایک میج پر بیٹھے دیکھا ۔ تو میرا جی بہت کھش ہوا مہاراج ۔ بہت ۔ مجھے دیکھ کر بولی رسوئیہ تمہاری انگلی کیسی ہے ۔ اور چھوٹے بابو نہ جانے میں نے انگلی کیوں چھپالی ۔ بس چھپالی میں نے اور کہنے لگا ۔ انگلی کو تو کچھ نہیں ہوا دیوی جی ۔ وہ مسکرائی ۔ کل کٹ جو گئی تھی ۔ میں نے کہا دیوی یہ انگلیاں تو روج ہی کٹتی ہیں ۔ رسوئیہ جو ہوا ۔ چاکو کا کام ہے دیوی ۔ ان انگلیوں کا کیا ہے ۔ اور چھوٹے بابو جی پھر جو میں نے چائے رکھ کر سیب چیرنے کو چاکو اٹھایا تو اس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا ۔ اونہوہ ۔ انگلی کٹ جائے گی اور مسکرائی ۔ میں نے کہا نہیں دیوی جی روج تو نہیں کٹتی ۔ اور میں سرما کی رسوئی میں آگیا ۔ پھر وہ اکیلے بیٹھے رہئیے ۔ بابوجی کو تو بس چُپ لگی تھی ۔ ہاں وہ کبھی کبھی کچھ کہہ دیتی ۔ میں نے تو صرف اتنا ہی سُنا کہتی تھی اس روج آپ گر کیوں گئے ۔ پھر بولی ۔ پٹڑی سے اتر کیوں آتے تھے آپ ۔ پھر نہ جانے کیا کہا اس نے اور وہ کیا بولے ، مجھ سے تو سُنا نہ گیا ۔ چھوٹے بابو ۔ پھر وہ جور سے ہنسی "یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔ اور مجھے آواج دے کر بلایا ۔ رسوئیہ یہ دیکھو تو کیا کرئیے ہیں تمہارے بابو جی ۔ اور میں بھاگا بھاگا گیا دیکھوں ہوں بابوجی شکر والی پیالی میں چائے ڈال چکے ہیں ۔ شکر والی پیالی میں چائے بنانے لگے تھے ۔ بابو جی بولے میں بھی پاگل ہوں ۔ رسوئیہ وہ مسکرائی تمہارے بابوجی کو کیا ہو گیا ہے اور نیچی نجر سے ادھر دیکھا میں نے کہا ۔ دیوی آپ جانیں ۔ وہ بولی کیوں میں کیوں جانوں ۔ میں نے کہا ۔ آپ نہ جانیں تو کون جانیں اور وہ سرما سی گئی ۔ میں اور لاتا ہوں شکر میں نے کہا اور ٹل گیا وہاں سے ، مہاراج ۔ اس سمے تو میں کھا ملکھا تھا چھوٹے بابو ۔ پر نہ جانے جلدی میں مجھے کیا ہوا شکر والے پیپے کو چھوڑ سوجی کی پیالی بھر لایا ۔ میں پیالی لے کر کھڑا ہوگیا ۔ اور اس نے چمچہ بھرا اور مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی ۔ میں حیران ۔ ادھر بابو جی حیران پر وہ کُھش تھے ۔ بڑے کُھش ۔ یہ کیا ہے وہ بولی ۔ شکر ہے ۔ میں نے کہا ۔ اچھی شکر ہے یہ ، وہ ہنسی اب میں جو دیکھ رہا ہوں تو سوجی تھی ۔ اوہ میں چلّایا ۔ بالکل پاگل ہے ، بابوجی بات سمجھ کر چلائے ۔ دیکھ

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.blogspot.com

کر کام نہیں کرتا ۔ اور وہ اس شکر کی پیالی کیطرف دیکھ کر ہنسی جاوے تھی ۔ جس میں بابو جی نے چائے ڈال دی تھی ۔ پھر بابو جی نہ جانے سمجھ کر یا ویسے ہی چپ سے ہوگئے پر مہاراج ان کی اپنی سدھ بدھ ماری دی تھی ۔ بھلا بات کیا کرتے ۔ ویسے آج کل کے لڑکے تو اتنی باتیں کریں ہیں کہ لوگ منہ دیکھتے رہ جائیں ہیں ۔ پر چھوٹے بابو ان کی باتیں جبھی تک چلیں ہیں ۔ جب تک کوئی دور جارئیی ہو ۔ اور ہمارے بابو جی تو بس پی جانا ہی جانیں تھے ۔ وہ چلی گئی تو پھر وہ لگے مجھے گھورنے رینا یہ کیا کیا تو نے سوجی لا دی وہ کیا کہتی ہوگی مجاک کیا ہے مجھ سے ۔ اور چھوٹے بابو میں چپ ۔ اور کرنا بھی کیا ۔ آکھر رسوئیہ ہی ہوں نا چاہے وہ کیسا اچھا ہی کیوں نہ جانیں ۔ پھر بھی رسوئیہ ہی ہے“ ۔

”ہوں ۔ ٹھیک ہے رینا“ ۔ پرکاش بولا ۔ ”اچھا تو پھر بھی کبھی آئی وہ“ ۔

”ہاں چھوٹے بابو صرف ایک دپھہ“ ۔ وہ چپ ہوگیا ۔ آنکھیں بھر آئیں اور چند ساعت کے لئے بت بنا بیٹھا رہا ۔

”دن ڈھلا ہوا تھا اور میں رسوئی میں بیٹھا تھا ۔ بابو جی اندر لیٹے دے تھے ۔ وہ آئی اور منہ پر انگلی رکھ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا ۔ پھر پاس آئی اور میرے کان سے منہ لگا کر بولی ۔ کہاں ہیں ۔ میں نے انگلی سے بتایا کہ اندر لیٹے دے ہیں ۔ بولی چپ پھر ایک لپھاپھ نکال کر دیا مجھے یہ دے دو انہیں ۔ پر اُنہیں یہ نہ بتانا کہ میں لائی ہوں ۔ کہنا کوئی دے گیا ہے ۔ اور کہنا جواب مانگا ہے ۔ میرا بتایا تو میں ناراج ہو جاؤں گی ۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں ۔ وہ کچھ کہے اور اُسے نہ کرنا مشکل ہو جائے تھا ۔ ایسی اچھی تھی وہ ۔ وہ تو کونے میں لگ ، چھپ کر کھڑی ہو گئی اور میں سمجھا کچھ مجاک ہے ۔ سو میں بھاگ کر بابوجی کے پاس لے گیا وہ لپھاپھ ۔ مجھے کیا مالوم کیا بھرا ہے اس میں ۔ بابو جی نے کھولا ۔ پڑھا اور رنگ ہلدی سا ہوگیا ۔ بولے کس نے دیا ہے تمہیں ۔ میں نے کہا بابوجی ایک لڑکا آیا تھا اُس دیوی نے بھیجا ہے ۔ اور جواب کو کہا ہے ۔ بولے کب آیا تھا ۔ میں نے کہا جب آپ پڑھنے گئے دے تھے ۔ اوہ ۔ اوہ وہ پاگلوں کی طرح

پھرنے لگے ۔ اب میں کیا کروں ۔ کیا کروں میں ۔ اب کیا ہوگا رینا ! اور میں حیران میں نے پوچھا کیا لکھے ہیں ۔ بولے کچھ نہیں ، کچھ نہیں ، تم اب جاؤ ۔ جاؤ تم ۔ اب جو میں رسوئی میں آیا تو وہ کونے سے لگی کھڑی تھی ۔ منہ پر ہنسی پر چھوٹے بابو جافران کی سمان جرد رنگ ۔ پھر میرے کان سے منہ لگا کر بولی ۔ پوچھو ، جب وہ لڑکا آئے تو کیا جواب دوں ۔ مجھے تو ڈر لگتا تھا بابو جی کے سامنے جاتے دے ۔ پر اس نے کہا ۔ تو کیسے نہ جاتا میں ۔ چلا گیا اور وہ جواب کا سن کر چیخنے لگے ۔ رینا ، رینا سچ بتا یہ انہوں نے بھیجا ہے ۔ سچ بتا رینا ۔ جی ، میں نے کہا ۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولے ۔ اب کیا ہوگا ۔ اچھا رینا مجھ سے ایسا مجاک نہ کرو ۔ میں نے کہا ، بابوجی میں کیوں کرنے لگا آپ سے مجاک ۔ لیکن میرے ماتا پتا ، وہ بولے کیا کہیں گے ۔ رینا ۔ ماتا تو مان جائے پر پتاجی کیسے مانیں گے اور ۔ اور رینا جانے وہ کون ہے ۔ نہ جانے کیا جات ہے اسکی ۔ میں پتاجی کو کیا بتاؤں گا ۔ نہیں نہیں میں پتاجی سے کیسے کہہ سکتا ہوں رینا میں نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا ۔ میں حیران چھوٹے بابو ۔ اب میں کھڑا ان کا منہ دیکھ رہا ہوں ۔ اور پھر جو سر اٹھایا میں نے تو دروازے میں وہ آپ کھڑی ہے ۔ لال ، لال آنکھیں اور ہونٹ گسے سے بھرے دے ۔ ایک نجر اس نے بابو جی کی طرپھ دیکھا ۔ اور بابوجی بُت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ۔ وہ بولی ۔ آپ کو مجھے [illegible] ہے یا جات سے ۔ وہ چل پڑی ۔ اب بابوجی پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگے ۔ اور بولے نہ جاؤ بلبیر!! ۔ یہ اس کا نام تھا نا نہ جاؤ گسے نہ ہو جانا بلبیر ! ۔ میرے ماتا پتا ۔ میں ان کی مرجی بنا کیا کر سکتا ہوں ۔ تم نہ جاؤ ۔ آکھر چھوٹے بابو وہ کھڑی ہوگئی اور بولی اچھا تو پوچھ لیجئے اپنے مات پتا سے ۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے ملنا ۔ اگلے بدھ کو باگ میں ملوں گی میں ۔ اسی وقت ۔ اور اور وہ ہونٹ کاٹ کر بولی ۔ اگر نہ ملے آپ تو بس میں سمجھ لوں گی کہ وہ نہیں مانے ۔ پھر میں کبھی نہ ملوں گی ۔ یہ کہکر وہ چلی گئی ۔

”چھوٹے بابو مجھے کیا کھبر تھی کہ یہ بات ہے ۔ میں تو مجاک سمجھتا رہا ۔ پر اس سمے مجھے مالوم ہوگیا کہ مجاک نہیں ۔ اور بابوجی تو پھر بالکل اپنے آپ سے

نے چپکے سے سر ہلایا ۔ پھر وہ بولے لیکن ماتا جی ۔ ماتا جی نے تو نہ ، نہ کی ہو گی ۔ رینا بتاؤ مجھے ۔ تم چپ کیوں ہو ۔ میں نے کہا ۔ جی وہ کہیں تھیں ۔ جو ایسا کیا اُس نے تو میں جہر کھا لوں گی ۔ جہر! ؟ وہ بولے ، اور پھر دھم سے پلنگ پر گر پڑے ۔ اب بابو جی کا اور بھی بُرا حال ہوگیا ۔ ہر سمے بولتے ۔ نہیں نہیں رینا میں نہیں جاؤں گا ۔ میں نہیں جاؤں گا رینا ۔ کیا ماتا جی سچ مچ جہر کھالیں گی ۔ رینا سچ بتاؤ ۔ اب میں کیا بتاتا بابوجی ۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولتے رینا میں جرور ملوں گا ۔ میں جرور ملوں گا ۔ میں جیوں گا ۔ مجھے جینا ہے رینا ۔ مجھے بھی کئی بار کھیال پڑتا ہے چھوٹے بابو کہ نہ جانے وہ کون دیوی ہے ۔ نہ جانے کیسے لوگ ہیں وہ ۔ بڑے لالہ جی سچ کہتے ہیں ، پر مجھے پوچھتا ہی کون تھا ۔ ہاں بابو جی کی حالت دیکھی نہ جائے تھی ۔

پھر بدھ کا دن آگیا جب اس نے باگ میں ملنا تھا بابو جی سے پر اس روج تو بابو جی نڈھال پڑے تھے ، مہاراج آٹھ دن نہ کھایا نہ پیا اور ہر سمے اٹھ اٹھ کر پاگلوں کی سمان بھاگتا ۔ مجھ سے بولے رینا پتاجی کی اور بات ہے پر ماتا جی ، ماتا جی نے جہر کھا لیا تو ۔ لیکن رینا میں جاؤں گا ۔ مجھے جانا ہی ہوگا ۔ پھر آپ ہی آپ سوچ میں پڑ جاتے ۔

جب دو گھنٹے رہ گئے تو مجھے بلایا ۔ بولے رینا ۔ مجھے ڈر ہے میں چلا نہ جاؤں ۔ رینا ماتا جی کو بچالو ۔ تم ماتا جی کو بچا سکتے ہو رینا! ۔ ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رینا ۔ میں بچا لوں ۔ میں حیران ، چھوٹے بابو میں بھلا ماتا جی کو کیسے بچا سکتا تھا ۔ بولے ہاں تم بچا سکتے ہو ماتا جی کو رینا ۔ بچاؤ گے ؟ میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا اور کیا کرتا میں چھوٹے بابو ۔ بولے سوگند کھاؤ ۔ میں نے کہا بھگوان جانتا ہے ۔ جو آپ کہیں گے کروں گا ۔ بولے اچھا تو ایک تالہ لے آؤ ۔ پھر وہ میرے ساتھ پچھلے کمرے میں چلے گئے اس کمرے کا ایک دروازجہ تھا ۔ بولے رینا یہ لو دو روپے آج دونو شو دیکھنے ہیں تم نے ۔ میں حیران ۔ بولے اور جاتے دے ہیں کمرے کو باہر سے تالہ میں نے پوچھا ، بولے اور جاتے دے اس کمرے کو باہر سے تالہ لگا دینا ۔ تالہ میں نے پوچھا ، بولے ہاں کہیں

بھی گئے ۔ کبھی روتے کبھی لیٹ رہتے اور کبھی آپ ہی آپ ادھر ادھر پھرتے اور بڑبڑاتے ۔ پتا جی کیا کہیں گے ۔ نہیں نہیں میں تو پتا جی سے نہ کہوں گا ۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اور پھر چپ ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد پھر بولتے ۔ نہیں نہیں میں جاؤں گا ۔ مجھے جانا ہی ہوگا ۔ میں جاؤں گا جرور جاؤں گا چاہے کچھ ہو ۔ رینا ۔ رینا میں جاؤں گا اور چھوٹے بابو ساری ساری رات نہ سوئے ۔ سوتے بھی تو آپ ہی آپ اٹھ بیٹھتے اور یہی چلّاتے ۔ پھر مجھے مالوم ہوا کہ اس نے بیاہ کے لئے لکھا تھا ۔ پر چھوٹے بابو کبھی سنا ہے ۔ آپ نے کہ لڑکی آپ اپنے بیاہ کی بات کرے ۔ توبہ ۔ پر وہ کالج کی تھی نا ! بارھویں میں تھی ۔ کالج کی لڑکی کا کیا ہے چھوٹے بابو چاہے جو بھی کہہ دے ۔ اس کا کیا ہے ۔ اور وہ تھی بھی ایسی تیج“ ۔

”اس روج کے بعد“ اسنے ایک آہ بھر کر کہا ۔ ”میں نے اس کو اس سڑک پر سے گجرتے نہ دیکھا ۔ میں سارا سارا دن کھڑا رہتا ۔ چھوٹے بابو پر وہ آتی تو دکھتی نا ۔ ادھر بابو جی بھی انتجار کرتے پر وہ نہ آئی ۔ اور بابو جی کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جائے تھی ۔ سو چھوٹے بابو میں نے بابو جی کو دلاسہ دیا ۔ اور آپ بڑے لالہ جی سے بات کرنے کے لئے گاؤں چلا گیا ۔ پر چھوٹے بابو وہاں میری بات کون سنتا تھا ۔ بڑے لالہ جی سے بات کی تو وہ ہنس پڑے بولے کس کی لڑکی ہے وہ کتنی جائداد ہے اس کے پتا کی ۔ اور ان کی جات کیا ہے ۔ اب میں کیا بتاؤں بابوجی ۔ بس چپ ہو رہا میں ۔ پر ماتا جی سے میں نے ساری بات کہہ دی ۔ ساری بات سُنادی انہیں ۔ اور ماتا جی تو سن کر مجھ پر ٹوٹ پڑیں ۔ بولیں اچھا اب ایسا ہوگیا ہے دہ ۔ نرلج کہیں کا ۔ رینا اگر اس نے ایسی ویسی سے بیاہ کر لیا تو میں جہر کھا لوں گی جہر ! نہ جانے کیا کیا بولتی رہی وہ رینا نے آہ بھری ۔ بس مہاراج میں اپنا سامنہ لئے آگیا واپس ۔

بابو جی نے مجھے دیکھا اور جھٹ سمجھ گئے ۔ بولے ۔ میں تو پہلے ہی جانوں تھا ۔ میں جانتا تھا وہ نہیں مانیں گے ۔ رینا ، رینا تم بولتے نہیں ۔ بولو کیا کہا ہے انہوں نے ، پتا جی کیا کہتے تھے ۔ تو چھوٹے بابو اب میں کیا کہتا ۔ میں

میں، چلا نہ جاؤں۔ مجھے ڈر ہے میں چلا جاؤں گا رینا میں چلا جاؤں گا۔ ماتا جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رینا۔ جاؤ۔ ابھی تالہ لگا کر چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ اور مہاراج وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑے اور رو رو کر حال بیحال کر لیا۔ اب میں کیا کرتا مہاراج میں نے درواجے کو باہر سے تالہ لگا دیا اور آپ چلا گیا“۔

”تو پھر وہ کبھی نہ آئی“۔ پرکاش نے پوچھا۔

رینا نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس سے اس کی آنکھوں میں ان بہے آنسو چھلک رہے تھے۔

”اور دروازہ بند ہی رہا“ پرکاش گنگنایا۔

”جی“ رینا بولا۔

عین اس وقت ساتھ والے کمرے سے کسی کی آواز آئی۔ ”ساوتری۔ تم پھر کھڑکی میں آبیٹھی ہو۔ ساوتری۔ تم سے جو کہا ہے دروازہ کھول کر نہ بیٹھا کرو“۔

پرکاش چونکا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”سنا تم نے یہ کمرا ہے اس کا۔ غالباً اس کا پِتا گھور رہا ہے۔ ساوتری۔ اچھا نام ہے۔“

”چل اٹھ یہاں سے“ آواز آئی پھر آئی ”راجو یہ کھڑکی بند کر دو بند کر دو اسے“۔

معاً بابوجی کمرے کے بیرونی دروازے کے پیچھے بڑبڑائے ”لو یہ دروازہ بھی بند ہوگیا۔ یہ بھی بند ہوگیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ رینا او رینا“۔ رینا نے جلدی اٹھ کر دورازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے۔ ”تم آ گئے رینا۔ بڑا اچھا ہے“۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے ہماری طرف آئے ”تم آجایا کرتے ہو، رینا ضرور آجایا کرتا ہے۔ مسٹر۔ مسٹر۔“

”مسٹر بلراج“۔ پرکاش نے انہیں یاد دلایا۔

” مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ مسٹر راج۔ اچھا ہوا تم نے چائے پی لی۔

بڑا اچھا ہوا۔ مہربانی ہے۔ مہربانی۔ رینا اب دروازہ بند نہ کرنا وہ بولے۔ ہم قیدی نہیں۔ نہیں ہم قیدی نہیں ہیں۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مجھے جانا ہے۔ میں ذرا ہو آؤں۔ رینا۔ اوہ پھر چلا گیا“۔ وہ شکایت کرنے لگے۔ لیکن ان کی آنکھیں۔ حسرت، یاس اور بے بسی سے بھری تھیں۔ اچھا میں ہو آؤں“ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر داخل ہوگئے۔

* * *

گہرائیاں

ویسے تو شیخ صاحب محلے بھر میں نہائت شریف آدمی سمجھے جاتے تھے ۔ مگر بیویوں کے حق میں لوگ دل ہی دل میں انہیں مہلک سمجھتے تھے ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اور ثبوت یہ تھا ۔ کہ ان کی تینوں بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہو چکی تھیں ۔ انہیں بیویاں ادلنے بدلنے کا شوق نہیں تھا ۔ بلکہ اسی بات پر وہ اکثر مغموم رہا کرتے تھے ۔ اور جب کبھی وہ شہزادہ سے بات چیت کرتے تو خواہ مخواہ ان کی گردن جھک جاتی ۔ ان کے منہ سے بیساختہ "جی ہاں جی ہاں" نکل جاتا اور ان کے انداز سے ایسا ظاہر ہوتا جیسے وہ اسے بیاہ کر لانے کی تلافی کر رہے ہوں ۔

شہزادہ ان کی چوتھی بیوی تھی ۔ اور ان کے دوست مولوی محمد عثمان کی بیٹی ۔ مولوی صاحب نہایت پاکباز آدمی تھے ۔ ان کا ایمان تھا کہ جسم نجات کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے ۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو اسی اصول کے ماتحت روحانی تربیت دی تھی ۔ مگر وہ روحانی تربیت شہزادہ کے جسم کی نشوونما کو روک نہ سکی تھی ۔ حتیٰ کہ اس کے متناسب جسم کے پیچ و خم کو شباب نے سانچے میں ڈھال دیا تھا ۔ اور شہزادہ اس اصول سے ابھر کر ایک حسین مجسمہ بن گئی تھی ۔ جیسے وہ جسم اس اصول پر طنزاً مسکرا رہا ہو ۔ شہزادہ کی طرف دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی مخملیں گلابی جسم ابھر ابھر سمٹ کر آپ سے کچھ کہہ رہا ہو ۔ جسے سن کر یا محسوس کر کے آپ کا جی چاہتا کہ اٹھ کر کچھ پھوڑ دیں یا کسی سے لڑ پڑیں ۔ اور اگر شہزادہ کی گہری عنابی آنکھیں مسکرا کر دیکھ لیں تو ۔۔۔۔ مگر شہزادہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں ۔ اور وہ تسلیم کی کالی کالی موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتی تھی ۔ تسلیم شیخ صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ اور ان کی پہلی بیوی جہاں آرا سے

تھی ۔ تسلیم کو دیکھ کر شہزادہ خواہ مخواہ غصہ محسوس کرتی ۔ شائد اس لئے کہ تسلیم کی آنکھیں اسے بہت پسند تھیں ۔ یا اس لئے کہ وہ آنکھیں اس کے اپنے چہرے پر نہ تھیں ۔ یا شائد اس لئے کہ شیخ صاحب تسلیم کے متعلق شہزادہ کی کوئی بات نہ سنتے تھے ۔ بہرصورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو ۔ شہزادہ بات بات پر تسلیم کو "اندھی ہے کیا ۔۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا" کہنے کی عادی تھی ۔ تسلیم سن کی پی جاتی اور اس کی آنکھیں ان بہے آنسوؤں سے بھیگ کر اور بھی جاذب نظر ہو جاتیں ۔ تسلیم کی عمر کوئی سولہ برس کی ہو گی ۔ مگر اس کا شباب ان خاموش، نمناک آنکھوں نے جذب کر لیا تھا ۔ اور اس کے اعضاء ان لطیف حرکات سے ناواقف رہ گئے جن سے شباب اپنا اظہار کرتا ہے ۔

البتہ جب کبھی تسلیم کا خالہ زاد بھائی ان کے گھر آ جاتا تو خدا جانے کہاں سے ایک ہلکی سے سرخی آکر اس کے چہرے پر جھلکی دکھا جاتی ۔ اور کرامت کی کسی نہ کسی بات پر اس کے ہونٹ تبسم سے کھل جاتے اور وہ تبسم اس کی آنکھوں میں جا جھلکتا ۔ شہزادہ کرامت سے باتیں کرتے ہوئے تسلیم کی وہ حرکات بن دیکھے محسوس کرتی ۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کیا کہنے والی تھی ۔ ادھر کرامت کی نگاہیں بھی ان کی گفتگو سے بیگانہ رہتیں ۔ اور کرامت کی نگاہوں کو دیکھ کر اور تسلیم کی متبسم آنکھوں کو محسوس کر کے اس کے دل میں ان جانا غصہ کھولنے لگتا ۔

پھر جب کرامت چلا جاتا تو شہزادہ یوں محسوس کرتی جیسے اس گھر کی دیواریں بہت اونچی ہوں ۔ اندر لوگ یوں چل پھر رہے ہوں جیسے کسی ویرانے میں بھوت اور وہ خود ایک پریشان، نہ ختم ہونے والا خواب ہو ۔ اس وقت تسلیم کی نمناک آنکھوں کو دیکھ کر اسے ان کا گذشتہ تبسم یاد آ جاتا ۔ اور وہ کسی نہ کسی بات پر کہتی ۔ "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ ابا کا کوٹ جھاڑ دینا ۔ مگر تم سنتی ہی نہیں ۔۔۔۔ اور یہ دیکھو میز پوش پر دھبہ لگا کر ناس کر دیا ہے ۔ لکھتے وقت تمہیں دکھائی نہیں دیتا" ۔

اس روز کرامت کے جانے کے بعد شہزادہ بہت ہی پریشان تھی ۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ لمبی لمبی دیواریں آپس میں ملی جا رہی ہوں ۔ وہ دو

ایک مرتبہ اندر گئی باہر آئی اور پھر اندر چلی گئی ۔۔۔۔۔ آئینہ دیکھ کر اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس خوبصورت سی تصویر سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو ۔ جیسے وہ چہرہ اس کا منہ چڑا رہا ہو ۔ پھر وہ باہر صحن میں آ بیٹھی ، اس کے سر پر ایک پھیکا سا اداس آسمان پھیلا ہوا تھا ۔۔۔ ۔۔ بانو کو آتے ہوئے دیکھ کر اس نے مُسکرانے کی کوشش کی ۔

”میں کہتی ہوں بانو ، دو روز سے پڑوس میں زبیدہ کے متعلق کیا جھگڑا ہو رہا ہے“ ۔ اس نے بات شروع کرنے کے لئے کہا ۔

”لو بی بی وہ ویسے ہی باتیں بناتی ہے ۔ محلے میں کون نہیں جانتا ۔۔۔۔ میں نے ان آنکھوں سے انہیں ملتے دیکھا ہے“ ۔

”سچ کہتی ہو“ ۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر کہا ۔

”اور تو کیا بی بی مجھے اس سے کوئی لاگ ہے کہ اسے برا کہوں“ ۔

”مگر بانو ۔ لوگوں کو یوں ملنے ملانے کی جرأت کیسے ہوتی ہے ۔ توبہ ۔ میں تو اس خیال سے ہی کانپ اٹھتی ہوں“ ۔ اس نے کانپ کر کہا ۔

”سچ پوچھو بی بی مجھے تو اس بیچاری پر ترس آتا ہے ۔ جوان لڑکی ہے ۔ وہ بھلا اپنی جوانی برباد کیوں کرے ، بیاہ کے وقت ماں باپ کہاں تھے ۔ جو اسے اس بڈھے کے سر تھوپ دیا ۔ اب لوگ خواہ مخواہ اس بیچاری کے سر ہوتے ہیں“ ۔

”چلو چھوڑو ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو برا کہیں ۔۔۔۔ میں کہتی ہوں اس مقابل والے مکان میں کون آئے ہیں ؟“

”یہی بات تو میں کہنے آئی تھی ۔ مگر جو تم برا مانو بی بی تو میں کہوں گی ہی نہیں“ ۔

”آخر بات کیا ہے ؟“ شہزادہ نے متفکر انداز سے پوچھا ۔

بانو قریب تر ہو بیٹھی اور بولی ”بات کیا ہونی تھی ۔ یہی جو سامنے والے گھر میں آئے ہیں نا ۔ ایک بڑھیا ہے اور ایک جوان مشٹنڈا سا لڑکا ۔ ابھی کل ہی تو آئے ہیں مگر وہ لڑکا کسی وقت بھی تو کھڑکی سے نہیں سرکا ، ہر آتے جاتے کو یوں آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنا ۔ چاہے تم کچھ بھی کہو ۔ مگر مجھے تو یہ بات پسند نہیں ۔ تمہارے گھر میں اللہ رکھے جوان لڑکی ہے ۔ اور پھر اس کے کمرے کی کھڑکیاں بھی تو ان کھڑکیوں کے مقابل کھلتی ہیں ۔ اس میں بڑی بے پردگی ہے بی بی“ ۔

”اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے ؟“ شہزادہ نے جوش میں کہا ۔

”یہ تو الٹی ہمارے ہی بھلے کی ہے ۔ میں کہتی ہوں اگر تمہیں ہمارے برے بھلے کا خیال نہ ہو تو پھر ہو گا کیسے ۔ تسلیم کے ابا کو تو ان باتوں کا خیال ہی نہیں ۔ کئی دفعہ ان سے کہہ چکی ہوں کہ لڑکی اب جوان ہے اس کی کوئی فکر کیجیئے ۔ مگر لڑکی کے متعلق تو وہ میری بات تک سننے کے روادار نہیں“ ۔

”یہ بھی کوئی بات ہے بی بی ۔ لو تمہیں لڑکی کا فکر نہ ہو تو کسے ہو ۔ آخر ایک روز شادی کرنی ہی ہے“ ۔ بانو نے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا ۔

”تم نہیں جانتی بانو“ ۔ شہزادہ نے بڑھ کر رازدارانہ انداز میں کہا ۔ ”ویسے دیکھ لو ہر بات میں میں جو چاہوں کروں ۔ مگر لڑکی کے متعلق وہ کچھ سنتے ہی نہیں ۔ وہ حمید کا جھگڑا ہوا تھا نا ۔ تم تو جانتی ہو ۔ توبہ ۔ لڑکی منہ پر مکر گئی ۔ اور کتنا پاکھنڈ مچایا ۔ اس کے ابا تو صاف کہنے لگے کہ میں نے لڑکی پر جھوٹا بہتان لگایا ہے“ ۔

”مگر بی بی ، سچ پوچھو تو تم نے بھی بن سوچے سمجھے بات کہہ دی“ ۔ بانو آنکھ چمکا کر بولی ۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات میرے ہی سر چڑھے گی ۔ میں نے تو ان کے بھلے کی بات کی تھی ۔ ورنہ ایک روز جگ ہنسائی ہوتی“ ۔

بانو قریب تر سرک آئی اور کان میں منہ دے کر کہنے لگی ۔ ” تم بھی سیدھی سادی ہو ۔ یہ کوئی شرافت کا زمانہ تھوڑا ہی ہے ۔ تمہیں تو چاہیئے تھا کہ کوئی خط پکڑ کر ان کے سامنے جا رکھتیں“ ۔

”یہی تو مجھے افسوس ہے ۔ مگر بانو اب تو وہ بات ہاتھ سے گئی ۔ شہزادہ

کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں ۔ بانو ایمان سے میری کوئی بری نیت نہیں ۔ تمہارے سر کی قسم میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ لڑکی اب اپنا گھر بسائے ۔ جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا ۔۔۔۔۔ "

" لو بی بی ، یہ بھی کوئی بات ہے " ۔ بانو نے بات کاٹ کر کہا ۔ "تم چاہو تو دو ہی دن میں ان کے سامنے سرخرو ہو جاؤ ۔ خط سامنے جا رکھنا" بانو نے ایک اسرار بھری مسکراہٹ سے شہزادہ کی طرف دیکھا ۔

"خط ! وہ کیسے ؟" شہزادہ دل تھام کر رہ گئی ۔

"واہ بی بی تم بھی بھولی ہو ۔ یہ تو کمبخت رشتہ ہی ایسا ہے ۔ یہاں لاگ لپیٹ کے بغیر کام نہیں چلتا ۔ اور تم کوئی بری نیت سے تھوڑا ہی کرو گی ۔ اس میں تو اُسی کا بھلا ہے" ۔

"ایمان سے بانو مجھے اس لڑکی سے بیر نہیں ۔ میں تو ۔۔۔۔۔ "

"لو بی بی میں بھلا سمجھتی نہیں" ۔

"اچھا تو بانو یہ کیسے ممکن ہے ۔ بس انہیں میری بات کا ثبوت مل جائے ۔ اور لڑکی اپنا گھر جا بسائے ۔ بس میں تو یہی چاہتی ہوں" ۔

"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ۔ دو دن کا کام ہے" ۔ بانو نے لاپرواہی سے کہا ۔

"مگر کرو گی کیسے ؟"

بانو کچھ سوچ کر بولی ۔ "یہ جو سامنے مکان میں لڑکا ہے بس اسے ہی لپیٹ لو ۔ اپنی بہن سے خط لکھوا کر اسے پہنچا دوں گی ۔ وہ سمجھے گا ۔ کہ تسلیم نے بھیجا ہے ۔ ان لونڈوں کا کیا ہے ۔ ان کو تو ایسی بات اللہ دے ۔ فوراً جواب لکھے گا ۔ بس وہ خط سنبھال کر رکھ لینا" ۔

"ہائیں" ۔ شہزادہ نے خوشی بھری حیرانی سے کہا ۔۔۔۔۔ "مگر بانو بات نکل گئی تو ؟"

"میرا ذمہ بی بی ۔ تم بے فکر رہو ۔ تم پر آنچ نہ آنے دوں گی" ۔

"مگر بانو ۔ خط کا جواب کون لائے گا ۔ اس بات میں کسی اور کو نہ لانا چاہیئے" ۔

"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں ۔ تم بے فکر رہو ۔ بی بی ۔ یہ کہہ کر بانو سوچ میں پڑ گئی ۔ پہلا خط میں کسی لڑکے کے ہاتھ بھجوا دوں گی ۔ لکھ دینا اور میں اپنی بہن سے نقل کروا لوں گی ۔ وہ اچھی خاصی اردو لکھ لیتی ہے ۔ تین جماعتیں پاس ہے تم خط اس طرح لکھنا جیسے تسلیم کا ہو ۔ اور اس میں لکھ دینا کہ اس بیٹھک کی کھڑکی میں رکھ جائے اور پھر اگلے روز وہیں سے اس کا جواب لے جائے ۔ کھڑکی میں سلاخیں تو ہیں ہی ۔ رات کو کھڑکی کھلی رکھا کرنا ۔ نو دس بجے آ کر وہ خط پھینک جایا کرے گا ۔ اور اٹھا کر بھی لے جایا کرے گا ۔ بس دو خطوں کی ضرورت ہے"

"ترکیب تو خوب ہے" ۔ شہزادہ نے سوچ کر کہا ۔ "مگر تسلیم اس کے سامنے تو ہو گی نہیں ۔ وہ بھی دل میں کیا کہے گا کہ خط تو آ رہے ہیں مگر لکھنے والی کا پتہ ہی نہیں چلتا" ۔

"کیوں ۔ اسے بھلا کیا پتہ کہ تسلیم ہے کون ۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی بھی تو گلی ہی میں کھلتی ہے ۔ وہاں گھڑی دو گھڑی کھڑے ہو کر بال بنا لیا کرنا ۔ اسے کیا خاک پتہ چلے گا ۔ کہ تم کون ہو ۔ وہ یہی سمجھے گا ۔ کہ تسلیم کھڑی ہے" ۔

"ہائیں ۔ میں" ۔ شہزادہ بھونچکی رہ گئی ۔

لو بی بی اس میں کیا بات ہے ۔ تمہیں کیا اس سے آنکھیں ملانی ہیں ۔ اور پھر دو ایک دن کی تو بات ہے ۔ اور اس بات کا پتہ بھی تو کسی کو نہ چلے گا ۔ آخر ایسی باتوں میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے نا ۔۔۔۔۔ "

"نہ بانو ۔ مجھ سے تو ایسا ۔۔۔۔۔ " شہزادہ نے گھبرا کر کہا ۔

"اللہ نہ کرے تمہاری کوئی بری نیت ہے بی بی ، بانو نے کہا ۔ "اور ڈر کس بات کا ہے ۔ تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو وہ تمہیں کھا جائے گا" ۔

بانو چلی گئی تو کچھ دیر شہزادہ چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ پھر وہ بیساختہ اٹھ

بیٹھی ۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا ۔ توبہ ہے ! خدا جانے لوگ ایسی باتیں کیسے کر لیتے ہیں" ۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ۔۔۔۔۔ وہ کوٹھے پر چلی گئی ۔ سامنے بیڈھب سے مکانوں کا تسلسل دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے زندگی ایک بے معنی سا پھیلاؤ ہو ۔ گُل عباسی کا پودا دیکھ کر اس نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ پودا گرد آلود ہو رہا تھا ۔۔۔۔۔ اس نے وہ گلدان اٹھا لیا اور نیچے اتر گئی ۔

"تسلیم دیکھو خدا جانے کتنے دنوں سے تم نے اسے پانی نہیں دیا ۔ بیچارہ سوکھ گیا ہے" ۔ تسلیم کی آنکھیں جھک گئیں ۔۔۔۔۔ شہزادہ کو یوں چپ دیکھ کر وہ حیران سی ہو رہی تھی ۔ شہزادہ نے اس پیڑ پر پانی چھڑکا ۔ پھر غسلخانے میں چلی گئی ۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے تسلیم کو آواز دی ۔ "مجھے ذرا اپنا دوپٹہ تو دینا ۔ تم جب تک اس کھونٹی سے میرا ہوائی ڈوپٹہ لے لو" ۔ تسلیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا ۔

"میرا دوپٹہ تو میلا ہے" ۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا ۔

"کوئی بات نہیں" ۔ شہزادہ مسکرا دی ۔

شہزادہ نے کمرے میں جا کر اپنے بال سنوارے اور پھر پلنگ پر یوں جا بیٹھی جیسے اسے کوئی کام ہی نہ ہو ۔۔۔۔۔ کمرے میں اس نے اندھیرا اندھیرا سا محسوس کیا ۔ اس کی نگاہیں پھر پھر کر کھڑکی پر جا ٹھہریں ، کھڑکی بند پڑی تھی ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔ کھڑکی کھولتے ہوئے اسے مقابل والا مکان یاد آ گیا ۔ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی ۔ "افوہ میں تو بھول ہی گئی" ۔۔۔۔۔ مجھ سے تو ایسی بات نہ ہو سکے گی ۔۔۔۔۔ "مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے" ۔ کوئی اُس کے دل میں کہہ رہا تھا ۔ "تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو ؟"

اس نے کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھولے ۔

سامنے کھڑکی میں ایک جوان لڑکا کچھ پڑھ رہا تھا ۔ اس کی چوڑی چھاتی ۔ گویا یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور فراخ ماتھے پر دو گھنے ابرو تنے ہوئے تھے ۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹھوڑی پکڑے ہوئے وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا ۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں" ۔ شہزادہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے سامنے گوالن دودھ دوھ رہی تھی ۔ خدا جانے کتنی دیر وہ غور سے اس گوالن کو دیکھتی رہی ۔ "عباس" ۔ کسی نے گلی سے آواز دی ۔ شہزادہ کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی ۔ وہ لڑکا اٹھ بیٹھا ۔ "کون ہے ؟" اس نے بھاری آواز میں پوچھا ۔۔۔۔۔ شہزادہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا ۔ اس کی آنکھوں میں عجیب تبسم جھلک گیا ۔۔۔۔۔ شہزادہ کی آنکھیں جھک گیئں ۔ اس کا دل دھڑکنے لگا ۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں اس کا دوپٹہ سرک گیا ۔

"کیسا ہرا بھرا پودا ہے" ۔ شہزادہ نے گل عباسی کے پیڑ کو دیکھ کر کہا ۔ "اب اس میں پھول لگیں گے" ۔ اس نے پیار سے ایک سرخ پھول کو چھوا "گل عباسی ۔۔۔۔۔ عباس اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ پھول اس کی انگلیوں کو دبا رہا ہو ۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں" ۔ وہ مسکرا دی ۔ "اتنا کام پڑا ہے اور میں سب کچھ بھولی جا رہی ہوں" ۔

شہزادہ بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کے بال پریشان تھے ۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں ۔ اور وہ بیٹھی عباس کا خط پڑھ رہی تھی ۔ وہ عباس کا تیسرا خط تھا اس کے بے تکلف الفاظ شہزادہ کے روئیں روئیں میں ناچ رہے تھے ، اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی ۔ کہ وہ خط "میری تسلیم" سے مخاطب ہے ۔ "میری" اس کے دل میں میری کا ایک دلچسپ اور نیا مفہوم پیدا ہو رہا تھا "میری ۔۔۔۔۔"

سامنے گل عباسی کے پھول لہرا رہے تھے ۔ سرخ سرخ پھول ۔ باہر آسمان پر صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی ۔ گلی دُور سے دوڑ کر کسی کے آنے کے لئے راستہ بنا رہی تھی ۔ مکانوں کی قطار یوں خاموش تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں ۔ وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی ۔ کوئی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔

"تمہاری آنکھیں کس قدر شوخ ہیں" ۔ کسی کاغذ سے حروف نکل کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے ۔ اور وہ مسکرا دی ۔ ایک ساعت کے لئے اس کے سامنے

تسلیم کی آنکھیں آ گئیں ۔ بڑی بڑی سی اندھی آنکھیں ۔ آئینے میں کوئی مسکرا مسکرا کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا ۔

دوپہر کے وقت شہزادہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا ۔ ٹرنک کھولا ۔ اور زیور کی ڈبیا میں سے تین کاغذ نکالے ۔ ان کو ایک بار پڑھا ۔ پھر کاغذ لیا اور کچھ لکھا ۔ اور بانو کے انتظار میں بیٹھ گئی ۔

"یہ لو" اس نے بانو کو وہ رقعہ دیتے ہوئے کہا ۔ "اسے اپنی بہن سے لکھوا کر مجھے شام تک پہنچا دینا" ۔

بانو نے وہ رقعہ لے کر پلے میں باندھ لیا ۔

"میں کہتی ہوں بی بی ۔ اس کے خطوں میں کیا لکھا ہوتا ہے" اس نے شہزادہ سے پوچھا ۔ اور اس کی آنکھ میں نقرئی چمک جھلکنے لگی ۔

"کچھ بھی نہیں ۔ بس ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں ۔ ابھی تک اس نے ہمارے مطلب کی کوئی بھی بات نہیں لکھی ۔۔۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ اب کے بار اس کا جواب آئے تو یہ قصہ ختم ہی کر دیں" ۔

"مگر بی بی اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے ۔ دو ایک خط اور لکھ دیکھو ۔۔۔۔۔ میں تو حیران ہوں بی بی ۔ ایسے جوان لڑکے تو جھٹ بات کا بتنگڑ بنا لیا کرتے ہیں ۔ خدا جانے اس کو کیا ہوا ۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں بی بی تم وہ خط مجھے تو سناؤ ۔ کچھ پتہ تو چلے ۔

"اچھا" ۔ شہزادہ نے جھجک کر کہا ۔ "تم سے کیا پردہ ہے" ۔ پھر سوچ کر اس نے کہا ۔ "اس وقت تو ان کے آنے کا وقت ہے ، کل سہی" ۔

رات کو نو بجے جب شیخ صاحب نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو شہزادہ نے اپنے ٹرنک سے وہ رقعہ نکالا ۔ اسے ایک بار پڑھا اور بیٹھک میں رکھنے چلی گئی ۔ کھڑکی میں اس نے ایک لکڑی کی خالی صندوقچی رکھ چھوڑی تھی ۔ جس میں وہ رقعہ رکھ دیا کرتی اور عباس اٹھا کر لے جایا کرتا تھا اور جواب ڈال دیا کرتا تھا ۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صندوقچی کھولی ۔ اس کے اندر ایک رقعہ پڑا ہوا دیکھ کر

وہ گھبرا گئی ۔ آج تو مجھے جواب دینا تھا ۔ یہ رقعہ کیسا ہے اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے وہ رقعہ اٹھا لیا ۔۔۔۔۔ عین اس وقت اس کے منہ پر برقی روشنی پڑی اور وہ گھبرا گئی سامنے عباس کی کھڑکی میں سے کوئی اس پر روشنی ڈال رہا تھا ۔ اس کے دل میں کئی ایک شبہات پیدا ہونے لگے ۔

"ٹھہرو سعید میں ابھی آیا" ۔ اس نے عباس کو کہتے ہوئے سنا ۔

"کہیں وہ یہاں تو نہیں آ رہے ۔۔۔۔۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ۔۔۔۔۔" اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر زنانے میں چلی جائے ۔ مگر وہ مبہوت کھڑی تھی ۔ بدن میں سکت نہ رہی تھی ۔ گلا خشک ہو رہا تھا ۔ کوئی آوارہ دھڑکن سینے میں لہریں لے رہی تھی ۔

ایک گرم سے ہاتھ نے سیخوں سے نکل کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

"خدا کے لئے تسلیم ۔ انکار نہ کرنا ۔ مجھے یوں پاگل نہ بناؤ ۔ مجھے تم سے محبت ہے" ۔

اس ہاتھ کی گرمی سے اس کا تمام جسم پگھل کر خدا جانے کیا ہو گیا ۔

"کچھ تو کہو ۔ خدا کے لئے ایک بار ہاں کہہ دو" ۔

شہزادہ کے منہ پر پھر برقی روشنی پڑی ۔ دور گلی میں پاؤں کی چاپ سنائی دی ۔

"چھوڑیئے چھوڑیئے کوئی دیکھ لے گا" ۔ اس کے منہ سے بیساختہ نکلا ۔ عباس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ شہزادہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ اور اندر بھاگ آئی ۔

وہ رقعہ اس کی مٹھی میں تھا اور وہ بھینچ بھینچ کر اسے محسوس کر رہی تھی ۔ خدا جانے وہ اسے بھینچ بھینچ کر معدوم کر دینا چاہتی تھی یا اسے محسوس کر کے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ رقعہ اس کے پاس موجود ہے بہر صورت وہ اسے پڑھنے سے ڈرتی تھی ۔ مگر وہ رقعہ دہکتے ہوئے کوئلے کی طرح اس کے بدن کو جلا رہا تھا ۔

وہ اٹھ بیٹھی اور کتنی دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی ۔ پھر اندر جا کر اس نے بتی جلائی اور جلدی جلدی اسے پڑھنا شروع کیا ۔ جیسے وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھنا چاہتی ہو ۔ مگر وہ الفاظ اس کی نس نس میں کھب کر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے ۔ اس نے وہ رقعہ ٹرنک میں پھینک دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی ۔ اپنا دھیان ادھر ادھر لگانے کی کوشش کی ۔ مگر اس رقعے کے الفاظ ٹرنک سے نکل نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے ۔ "اچھا تو دو ماہ کے لئے گوجرانوالہ جانا ہے ۔۔۔۔۔ دو ماہ ۔۔۔۔۔ مجھے ایک منظر دیکھنے کا شوق ہے ۔۔۔۔۔ رات کو دو بجے بیٹھک کے دروازے پر میرا انتظار کریں گے ۔ یعنی میں وہاں جا کر ان سے ملوں ۔ محبت ہے ۔ عشق ۔ اُف ۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ" ۔ اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا ۔ "یہ کیا حماقت ہے ۔ جانے دو ۔ مجھے کیا ہے ۔ میرے پاس اس کے تین خط ہیں ۔ کل ہی تسلیم کے ابا کے سامنے رکھ دوں گی ۔ کرامت ، کرامت سے منہ دھو رکھے ۔ اپنے گھر چلی جائے گی تو یہ روز کا قصہ ختم ہو گا ۔ "غیر آدمیوں سے ملنا ۔ توبہ ، کیسی بے حیائی کی بات ہے" ۔ اس نے ایک جُھرجُھری لی ۔ "میری تسلیم" ۔۔۔۔۔ "میری ۔۔۔۔۔" اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا ۔ "میں بھی کیسی احمق ہوں ۔ خواہ مخواہ یہ قصہ چھیڑ بیٹھی ۔ آج کل کے لڑکے بھی کیسے نڈر ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔ زبردستی ہاتھ آ پکڑا ۔ کیسی منہ پھٹ باتیں کیں ۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ پر کوئی گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہا تھا ۔۔۔۔ توبہ کیسا گرم ہاتھ تھا" ۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھ کر کہا ۔ "ان لڑکوں کا کیا اعتبار ہے ۔ آج کسی کے ، کل کسی کے ۔ بعد میں خواہ مخواہ بدنام کرتے پھرتے ہیں" ۔

اس نے ٹرنک کھولا ۔ اس کا ہاتھ زیور کی ڈبیا کی طرف بڑھا "لاحول ولا" کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ لو یہ قمیض عرصے سے ادھوری پڑی ہے ۔ اسے سی لوں ۔ یونہی نکمے بیٹھنے سے فائدہ ۔ نکما انسان بھی کس کام کا ۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچنا چاہتی تھی ۔ شائد وہ "نہ سوچنے" سے ڈرتی تھی ۔ اس کی نگاہ گل عباسی کے گلدان پر جا پڑی ۔ دو کملائے ہوئے پھول لٹک رہے تھے ۔ سوکھنے دو ۔ صبح و شام ان پودوں کی دیکھ بھال کون کرے ۔ اب تو ان کی بہار

ہی ختم ہونے کو ہے ۔ اس میں گلاب لگا لیں گے ۔

وہ قمیض لے کر سینے بیٹھ گئی ۔ دالان میں تسلیم سو رہی تھی ۔ منہ کھلا ہوا تھا ۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں تھی ہی نہیں ۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ۔

"یہ رہی آپ کی تسلیم ، آکر دل بھر کر دیکھ لیجئے" ۔ اور وہ ہنس پڑی ۔

گھڑی کی ٹک ٹک اسے یوں سنائی دے رہی تھی ۔ جیسے کوئی چکّی چل رہی ہو ۔ ساڑھے دس بج گئے ۔ "توبہ وقت کیسے گزرتا ہے ۔ دو بجے ، دو بجے آپ بیٹھک کے دروازے پر کھڑے سوکھیں گے ۔ اور آپ کی تسلیم یہاں خراٹے لے رہی ہو گی ۔۔۔۔۔ خدا جانے کس کس دروازے پر انتظار کیا ہو گا ۔ ان لڑکوں کا کیا اعتبار ۔۔۔۔۔ توبہ ہے ۔ خدا جانے میں بانو کی بات میں کیسے آ گئی ۔ شکر ہے بات یہیں ختم ہو گئی ۔ ورنہ نکل جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا ۔ اور ابا کو پتہ چل جاتا تو بس کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا ۔ اللہ نے بچا لیا ۔

"اب سو جاؤں" ۔ اس نے ایک انگڑائی لے کر کہا ۔

ٹرنک کھول کر اس نے قمیض رکھی ۔ زیور کو دیکھ کر اس نے اپنے جسم میں ایک سرسراہٹ محسوس کی ۔ "کیسی بے حیائی کی باتیں لکھتے ہیں ۔ وہ نماز پڑھ کر آئیں تو ابھی ان کو دکھلا دوں اور جھگڑا ختم ہو ۔ مگر وہ اپنی پیاری بیٹی کے خلاف ایسی بات کب مانتے لگے ۔ اور مان بھی گئے تو مجھے سچا ماننا ناممکن ہو گا ۔ یہ قصہ شروع سے ہی فضول تھا ۔ اور اس تسلیم کے لئے اتنا کچھ کرنا ۔ آخر بہتری تو اسی کی ہے نا ۔ اپنا گھر جا بسائے گی ۔ یہ خط ان کو دکھانا ! ۔۔۔۔۔ فضول ۔ ان تلوں میں تیل نہیں ۔ ان کے وظیفے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے ۔ بیٹی ہے ان کی ۔ بیاہیں یا نہ بیاہیں ۔ مجھے کیا ۔ میری بلا سے ۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں کہ اس چھوکری کی بہتری کے لئے خود کو خوار کر رہی ہوں ۔

اس نے زیور کی ڈبیا سے وہ کاغذ نکال لئے ۔ دیا سلائی لی اور ان کو آگ لگا دی ۔ "بھاڑ میں جائے تسلیم اور اسے چاہنے والے" ۔ اور وہ چارپائی پر جا لیٹی ۔ دو ایک کروٹیں لیں پھر تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر سینے پر پھونک

kitabiyat.blogspot.com
Engr. Faraz Akram

ماری اور سو گئی ۔

"شہزادہ ، شہزادہ "۔

اس کی آنکھ کھل گئی ۔ شیخ صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے ۔ مگر اسے ایسا دکھائی دیا جیسے کوئی ڈراؤنی شکل اسے دبا رہی ہو ۔ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی ۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ، شہزادہ " شیخ صاحب نے کہا ۔ "ڈر گئی تھی کیا ۔ بیمار تو نہیں تم" ۔

"کچھ بھی نہیں" ۔ اس نے شیخ صاحب کو پہچان کر کہا ۔

"بار بار میری تسلیم میری تسلیم بڑبڑاتی ہو کیا ہے تمہیں ؟"

"مجھے ؟ ۔۔۔۔۔ میں"

" تم مجھ سے چھپا رہی ہو ۔ تم مجھے معاف کر دو شہزادہ ۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ تمہیں تسلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ یہ میری بھول تھی" ۔

"نہیں آپ ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔ " وہ حیرانی سے ان کا منہ تک رہی تھی ۔

"نہیں شہزادہ ، میں تم سے شرمندہ ہوں ۔ اب تم جانو اور تمہاری بیٹی تسلیم آئندہ سے میں کسی بات میں دخل نہ دوں گا ۔ جو جی چاہے کرو" ۔

شیخ صاحب کے دل میں کئی ایک وہم پیدا ہو رہے تھے ۔ وہ بار بار شہزادہ کی نبض دیکھ رہے تھے ۔ ان کے ہاتھ اسے تھپک رہے تھے ۔ خدا جانے اسے سلا رہے تھے ۔ یا اپنی دنیا قائم رکھنے کے لئے مضطرب تھے ۔

شہزادہ پھر جاگ اٹھی ۔ جیسے اسے کسی نے جگا دیا ہو ۔ وہ کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی تھی ۔ گھڑی کی آواز دنیا بھر میں گونج رہی تھی ۔ ڈیڑھ بجا تھا ۔ گھڑی کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال اٹھنے لگے ۔ " ہاں دو بجے وہ آئیں گے ۔ میری تسلیم" ۔ اس نے تسلیم کی طرف دیکھ کر کہا اور مسکرا دی ۔ باہر نگاہ دوڑائی ۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ۔ " اس اندھیرے میں کون گھر سے نکلتا

ہے ۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں ۔ محبت ۔ " وہ طنزاً مسکرا دی ۔ " لوگ بھی کس قدر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے اس نے کروٹ لے کر کہا ۔ اور آنکھیں بند کر لیں ۔ اس نے اپنے ہتھ پر ایک گرم سا دباؤ محسوس کیا ۔ ٹھٹک گئی ۔ ہاتھ جھٹک دیا ۔ "توبہ میں بھی کیسی پاگل ہوں ۔ یہاں کون آ سکتا ہے ؟"

گھڑی نے دو بجا دیئے "لو دو بج گئے ۔ وہ تو اپنے بستر میں سو رہا ہو گا ۔ اور یہ رہی ان کی تسلیم ۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہوں" ۔

"اس اندھیرے میں بھلا دو بجے کون نکلتا ہے" ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ "تو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا" ۔ بالکل اس کے دل میں کسی نے کہا" چاہے جا کر دیکھ لو ۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ "لاحول ولا قوۃ ۔ تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو تمہیں کھا جائے گا ۔ "کسی نے اس کے دل میں کہا ۔

اس نے باہر دیکھا ۔ برآمدے میں تسلیم اور اس کے ابا سو رہے تھے ۔ مکان میں بالکل خاموشی تھی ۔ نہ جانے کیوں ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ باہر گئی ، باورچی خانہ میں گئی ۔ پھر واپس آئی ۔ برآمدے سے گزری ۔ مگر تسلیم اور اس کے ابا بھی نیند سو رہے تھے ۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یوں پریشان کیوں پھر رہی ہے ۔ اس خیال پر وہ بیٹھ گئی ۔ نقاہت ، ڈر یا بے بسی کی وجہ سے اس کا دل بیٹھنے لگا ۔ عین اس وقت اس نے دیکھا کہ وہ بے خبری میں کہیں سے ایک تالا اٹھا لائی ہے ۔۔۔۔۔ تالہ ۔۔۔۔۔ وہ مسکرا دی ۔ نہ جانے تالا کیوں اٹھا لائی ہوں ۔۔۔۔۔ معاً اس کی نگاہ بیٹھک کے دروازہ کی زنجیر پر جا پڑی ۔۔۔۔۔ لگا دو اس کے دل میں کسی نے چپکے سے کہا ۔ اسی وقت اس کا دل پھر سے بیٹھ گیا ۔۔۔۔۔ ڈوبنے لگا ۔ اس نے شرم کی ایک رو محسوس کی ۔ ٹن ٹن ۔۔۔۔۔ گھڑی نے دو بجائے ۔ جوش کی شدت میں وہ اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔ منہ لال ہو گیا ۔ گویا غصے کا سہارا لے رہی ہو ۔ آپ ہی آپ بولی ۔ میں کیوں تالا لگا دوں ۔ میں کیوں

ڈروں کسی سے ۔ میری بلا سے ۔ کس کی ہمت ہے جو یہاں آئے اور آ بھی جائے تو کیا ہے ۔ شیخ صاحب جو ہیں ۔ میں کیا اکیلی ہوں یہاں ۔ اسے خیال آیا کہ شیخ صاحب کو جگا دے ۔ پھر وہ رک گئی ۔ خواہ مخواہ جگا دوں ۔ کوئی بات بھی ہو ۔ بڑا آیا ہے وہ ہماری دیوار پھاند کر آنے والا ۔ یہاں آئے تو وہ کروں اس سے کہ پھر بھولے سے ایسی بات کا خیال نہ لائے ۔ کیا سمجھا ہے مجھے ۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تن کر بیٹھک کی طرف چل پڑی ۔ مذاق سمجھ رکھا ہے اس نے ۔ میں کیا کھانڈ کا کھلونا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ بیٹھک میں داخل ہو گئی ۔

Engr. Faeez Akram

سہارا

"صفو یہ کیا کر رہی ہے تو ۔ دیکھ تو سارا کرتہ ناس کر دیا ۔ یاں آ ۔ آ ادھر "۔۔۔۔ صفیہ نے نانی اماں کی آواز سنی ۔ اس کے ناچتے ہوئے پاؤں رک گئے ۔ گیت ہونٹوں پر خشک ہو گیا ۔ بایاں ہاتھ جو وہ جھلا رہی تھی نیچے گر گیا ۔ چہرے پر مسرت کی جگہ زردی چھا گئی ۔ لیکن اس کے باوجود دایاں ہاتھ شدت سے جھولی کو تھامے رہا ۔ بلکہ اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی ۔

"کبھی کسی نے جھولی میں بھی جامن ڈالے ہیں کیا ؟" بڑھیا اس کا شانہ جھنجھوڑ کر بولی ۔ "دیکھ تو سارا کرتہ نیلا ہو رہا ہے ۔ جیسے دوات میں ڈبو کر نکالا ہو ۔ اب کیا یہ رنگ جائے گا ۔ اونہوں ؟" ۔۔۔۔ نانی اماں نے صفو کو کندھے سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا ۔

"لے ڈال اس میں" ۔۔۔۔ بڑھیا تھالی کو آگے بڑھا کر بولی ۔ ڈال اب ۔ ڈال ۔۔۔۔" اس نے پھر اسے جھنجھوڑا ۔ صفیہ کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور جامن تھالی میں گر گئے ۔ "توبہ کیسی ضدی لڑکی ہے" ۔ نانی اماں نے اسے آخری مرتبہ جھنجھوڑ کر تھیڑ دیا ۔ جامنوں کو تھالی میں گرتا دیکھ کر صفیہ کے چہرے کا تناؤ ٹوٹ گیا ۔ آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رونے لگی ۔

"بس" بڑھیا چلائی ۔ "کوئی عقل کی بات کرو تو بنو لگی بسورنے ۔ دیکھو تو کیسے گلا پھاڑ رہی اے ۔ جیسے کسی نے مار مار کر حلال کر دیا ہو ۔ توبہ ہے ۔ ادھر آ میں تیرا کُرتہ اتار دوں ۔۔۔۔" نانی اماں نے نرم لہجہ سے اسے بھرمانے کی کوشش کی ۔

"اوں ۔ ہوں" ۔۔ صفو اکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔ بڑھیا نے یہ دیکھ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولی ۔ "نہ بیٹی ۔ ضد نہیں کیا کرتے ۔ یہ تو میری

پیاری بیٹی اے ۔ ایسی اچھی اے یہ لڑکی آ میں تیرا کرتہ اُتار دوں ۔ لے دیکھ ہو ریا اے نا سارا پنڈا نیلا ۔ میں نے کہا نہ تھا“ ۔ وہ اس کا کرتہ اتارتے ہوئے بولی ۔ اور پھر پیار سے باتیں کرنے لگی ۔

”اوں ۔ ہوں ۔ میں اپنے جامن لوں گی“ ۔ صفیہ روٹھے انداز سے بولی ۔

”نہ میری بچی ۔ زیادہ جامن نہیں کھاتے ۔ اللہ مارے خشک “ ۔

”اوں کھشک ۔ اور مانی بھائی جو کھاتے ہیں“ ۔

”دفع کر“ ۔ نانی اماں نے ہاتھ چلا کر منہ بنا کر کہا ۔ ”اسے تو سر پر چڑھا رکھا ہے ۔ لنڈور کہیں کا ۔ اللہ نہ کرے تو اس جیسی ہو ۔ توبہ ہے ۔ تو تو میری پیاری بچی ہے نا ۔“

”اور آپا نے بھی تو کھائے تھے“ ۔ صفو بسورنے لگی ۔

”بڑی آئی ہے وہ ۔ آپا ۔ لٹکو کہیں کی ۔ تو اس کی بات چھوڑ ۔ لے جا ۔ یہ کرتہ غسل خانے میں رکھ آ ۔ اری تو ننگے پاؤں پھرتی ہے ؟ ۔۔۔۔۔“ بڑھیا اس کے پاؤں کی طرف دیکھ کر ازسرِنو چیخی اور پھر غصے میں ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھ گئی ۔ ”ہائے ری کتنی بار کہا اے تجھے نہ پھرا کر ننگے پاؤں ۔ نہ پھرا کر پر ۔ یہاں کوئی سنے بھی کسی کی ۔ یہاں تو سبھی کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے ایں“ ۔ بڑھیا باآواز بلند بڑبڑانے لگی ۔ جیسے گھر کے جملہ لوگوں کو سنا رہی ہو ۔ ”ہزار بار کہا ہے بچے کو ننگے پاؤں نہ رہنے دو ۔ بیمار ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ کہاں ہے تیرا جوتا“ ۔ وہ پھر لڑکی سے مخاطب ہوئی ۔۔۔۔۔“ پھر کھو آئی ہے کہیں ۔ توبہ کیسی نٹ کھٹ اے یہ چھوکری ۔ اب کون تجھے نت نئے جوڑے خرید کر دے ۔ ابھی چیز لے کر دی ۔ ابھی گم ۔ نہ جانے کرتی کیا اے یہ ۔ جا اب ڈھونڈ اپنا جوڑا ۔ جا ۔ “ بڑھیا نے ایک اس کی کمر میں دی ۔

”اوں ۔ اوں ۔ میں کہاں سے لاؤں“ ۔ صفو رونے لگی

”جہاں رکھا تھا ۔ اور کہاں سے“ ۔

”میں نے تو غسل خانے میں اتارا تھا“ ۔۔۔۔۔ ”تو دیکھ وہاں جا کر“ ۔

”وہاں تو نہیں ہے“ ۔

”دیکھے بغیر ہی ۔ توبہ ۔ کیسے بہانے بنانا آتے ایں ۔ کیا زمانہ آیا اے ۔ منہ میں دانت نہیں پر باتیں سنو باتیں ۔ جا دیکھ جا کر وہاں ۔ اتنی بڑی ہو گئی اے نہ جانے کب سمجھ آئے گی ۔

”دیکھ تو آئی ہوں“ ۔۔۔۔۔۔ ”تو پھر زمین کھا گئی کیا ؟“

”مجھے کیا معلوم“ ۔۔۔۔۔ ”تجھے نہیں تو ہو گا کسے ؟“

”مانی بھائی نے اٹھا لیا ہو گا ۔ وہ اٹھا لیا کرتا ہے میری چیزیں ۔ کل اس نے ۔“

”بس وہ لڑکا تو گیا ہاتھوں سے“ ۔ بڑھیا نے بات کاٹ کر غصے میں کہا ۔ ”ہزار بار کہا میں نے ۔۔۔۔۔ بچے کی خبر لو ۔ پر تمہاری ماں تو آنکھیں موند کر بیٹھی اے ۔ اب کوئی کیا کرے ۔۔۔۔۔ لو ۔ سنا تم نے ۔ “ وہ ساتھ والے کمرے سے لڑکیوں کی ہنسی سن کر بولی ۔ یہاں تو دن بھر کھی کھی کے سوائے کچھ ہوتا ہی نہیں ۔ جیسے میلے پر آئی ہوئی ہوں ۔ بات کرو تو منہ کو آتی ایں ۔ کیوں نہ آئیں ماں کی شہ جو ہوئی ۔ اس نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے عقل کی بات بتاؤ تو اللہ ماری آزادی ۔ نہ جانے کیا بلا ہے یہ آزادی ۔ آج کل تو ہر لڑکی آزادی کی دیوانی ہے نہ شرم نہ حیا ۔ یہ دیکھ لو آزادی کے لچھن“ ۔ ملحقہ کمرے سے دبی دبی ہنسی کی آواز نے اسے پھر ادھر متوجہ کر دیا ۔ ”یہ کیا جوان لڑکیوں کے سے لچھن ہیں ان کے ۔ توبہ ہے !!“ معاً اس کی نگاہ رضو پر پڑی ۔ بڑھیا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ ”اللہ رکھے اک یہی میری بیٹی ہے ۔ بڑی ہو کر ایسی تمیزدار ہو گی دنیا دیکھے گی ۔ ہاں “ ۔ بڑھیا نے صفو کا ماتھا چوما ۔۔۔۔۔ ”جا میری بنو ۔ اپنا جوتا لے آ ۔ وہیں غسل خانے میں پڑا ہو گا ۔ حمام کے پیچھے ۔ جا میری بیٹی ۔ بڑی پیاری بیٹی ہے یہ“ ۔

رضو کے جانے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ کر پرانی جراب ادھیڑنے لگی ۔ اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی“ ۔ چاہے ادھر ہنڈیا جل رہی ہو ۔ لیکن ماں کی لاڈلیاں اپنے کمرے میں مگن بیٹھی ہیں ۔ نہ جانے کیا جادو ہے اس کمرے میں ۔

باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا ، ان کا ۔ اور پوچھو تو کتاب کا بہانہ ۔ چاہے کتاب کو ہاتھ بھی نہ لگائیں ۔ ہُنھ کتاب کتاب کا ہوش بھی ہو ۔ باہوں میں باہیں ڈالیں اور لگیں کانوں میں کُھسر پُھسر کرنے ۔ پھر کِھی کِھی کِھی کِھی“ ۔

بغل والے کمرے سے ہنسی کی آواز سن کر ۔ اس کی آواز اور بھی بلند ہو گئی ۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ اس پر ہنس رہی تھیں ۔ ”میری طرف سے چاہے ناک پر انگلی رکھ کر ناچیں ۔ ہاں ۔ میری بلا سے ۔ انہیں کے بھلے کی کہتی ہوں نا ۔ پر کوئی جانے بھی ۔ میری بھی کیا بُری عادت ہے ۔ چپ نہیں رہ سکتی ورنہ مجھے کیا اے ۔ یہ جانیں اور ان کے کام ۔ کسی کو کیا واسطہ ۔ پر دل ہی ایسا برا اے میرا ۔ کسی کا برا ہوتے دیکھا نہیں جاتا ۔ پھر اوپر سے یہ ہنستی ہیں ۔ لاڈو کہیں کی پڑی ہنسیں ۔ مجھے کیا ۔ کوئی لینا دینا ہے ۔“

”لو ۔۔۔۔۔۔ نانی اماں ہم کیا تم پر ہنس رہی ہیں“ ۔ صادقہ نے دروازے سے سر نکال کر کہا ۔ اس پر اندر سے پھر کِھی کِھی کی آواز آنے لگی ۔

”ہنستی ہو تو میرا کیا لیتی ہو“ ۔ بڑھیا سیخ پا ہو کر بولی ۔ ”اپنا ہی بگاڑو گی کچھ ہاں کہے دیتی ہوں میں ۔ اس کی آواز اور منہ کی جھریوں میں ان کہی دھمکی تھی ۔ پھر وہ خاموش ہو گئی ۔ اس کا غصہ منہ کی جھریوں سے نکل کر ہاتھوں میں اُتر آیا ۔ نہ جانے جوش سے یا بے بسی سے اس کے ہاتھ کانپنے لگے ۔ وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی تاگا ادھیڑتی رہی جیسے اپنی بے بسی کو بھولنے کی اشد کوشش میں لگی ہو ۔

ملحقہ کمرے سے انگریزی پڑھنے کی آواز سن کر وہ چونکی ۔ چہرے کی جھریاں گویا جاگ اٹھیں ۔۔۔۔۔۔ ”بس“ اس انگریزی نے نہ گھر کا رہنے دیا نہ گھاٹ کا ۔ دو حرف پڑھ لو دماغ بگڑ جائے ۔ یہ کیا تعلیم ہے ۔ نہ اللہ کا خوف نہ بڑوں کا لحاظ ۔ آنکھیں ڈھل کر کوری ہو جاتی ایں ۔ منہ جیسے ہنڈیا میں ڈال کر پکایا ہوا ہو ۔ بھولا پن تو نہ جانے کہاں اُڑ جاتا اے ۔۔۔۔۔ اس انگریزی سے تو اللہ ہی بچائے ہائے کیا زمانہ آیا ہے ۔ اب پکانے کھانے کا وقت آیا تو لے بیٹھیں انگریزی ۔ توبہ ان کے بہانے ۔۔۔۔۔ میرا بس چلے تو سب کو اٹھا لوں سکول

سے ۔ نخرے کے سوا وہاں دھرا ہی کیا ہے !“ اس کی نگاہ صحن میں پڑی ”یہ لو“ ۔ وہ غرائی ۔ ”صفو ۔ تو پھر کھیل میں لگ گئی ۔ نہ جانے کب عقل آئے گی تجھے“ ۔۔۔۔۔ معاً باہر خاموشی چھا گئی ۔ صفو کے ساتھیوں نے نانی اماں کو دیکھا اور چپکے سے ادھر ادھر ہو گئے ۔ صحن میں صرف صفو کھڑی رہ گئی ۔ ”صفو“ نانی اماں پھر چلائیں منہ میں انگلی لئے دیوار سے سہارا لگائے وہ یوں معصوم بنی کھڑی تھی ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ ”یہ کیا کھیل کا وقت ہے“ ۔ بڑھیا اٹھ بیٹھی جس وقت دیکھو کھیل میں لگی ہے ۔ میں کہتی ہوں کبھی دو حرف پڑھ بھی لیا کر“ ۔ نانی اماں نے دروازے میں کھڑی ہو کر کہا ۔ ”ادھر آ تو اور پھر ہاتھ لمبا کر کے شانے سے پکڑ اسے اندر گھسیٹ لیا ۔ ”بیٹھ یہاں“ ۔ بڑھیا نے اسے جھٹکا ۔ کہاں ہے تیری کتاب ۔ ہر گھڑی کا کھیلنا اچھا نہیں“ ۔

”اوں ۔۔۔۔۔ اور وہ جو کھیلتے ہیں“ ۔ صفو بولی ۔

”بھاڑ میں گئے وہ ۔ تجھے ان سے کیا ۔ ان کی بات پر گئی تو گدھی کی گدھی رہ جائے گی ۔ ہاں بیٹھ جا یہاں ، یہ تو میری پیاری بچی ہے ۔ کیا مجال جو شوخی یا ضد کرے“ ۔ بڑھیا نے اسے پچکارا ۔ ”آج کا پڑھا کل تیرے کام آئے گا ۔ پڑھنے کے بغیر تو آدمی جاہل رہ جاتا ہے ۔ جاہل ۔ پڑھ جائے گی تو تمیزدار بہو بنے گی ۔ لوگ عزت کریں گے ۔ اور یوں لنڈور رہی تو کوئی بات کرنے کا روادار نہ ہو گا ۔ کہیں کے پھوہڑ بے پھوہڑ ۔ آ میری بیٹی ۔ یہاں میرے پاس بیٹھ کر یاد کر لے اپنا سبق“ ۔

”اچھا ؟ ۔۔۔۔۔ صفو چلائی لیکن جلد ہی بولی ۔ ”پر میں پڑھوں کیسے نانی اماں ؟“

”اے ہے اپنے منہ سے پڑھے گی اور کیسے“ ۔

”نہیں ۔ مجھے پڑھائے گا کون“ ؟

”اے ہے“ ۔ بڑھیا نے جواب دیا ۔ ”ہر وقت پڑھا نہیں کرتے ۔ کبھی پڑھا ہوا یاد بھی کرتے ہیں“ ۔

”تو میں آپا سے پڑھ لوں“ ۔ صفو بولی ۔

“بس تجھے تو آپا کی لگن لگی ہے ۔ نہ جانے وہاں کیا ملے گا تجھے ۔ نہ بیٹھی یہاں بیٹھ کر پڑھ لے میرے پاس” ۔

“اوں تمہارے پاس ۔ تمہیں تو آتی ہی نہیں انگریزی ۔ آتی ہے کیا ؟”

“اے ہے اس میں آنے نہ آنے کی کیا بات ہے ۔ تو پڑھیو میں پاس بیٹھی تاگا ادھیڑوں گی ۔”

صفو نے ہونٹ لٹکا لئے ۔

“بس کوئی بات نہ کرے” ۔ نانی نے ہاتھ ہلا کر کہا ۔ “بات کی اور بسورنا شروع کر دیا ۔ میری طرف سے پڑھ یا نہ پڑھ ۔ تیرا ہی بگڑے گا کچھ ۔ میرا کیا اے جاہل رہ جائے گی ۔ اور آج کل جاہل کو جانتا ہی کون ہے ۔ پڑھ لے گی تو اللہ اچھا گھر ملے گا لے جا بیٹی لے آ اپنی کتاب ۔ میری بیٹی کیسی اچھی ہے ۔ جا میری بنّو ۔”

کتاب لا کر صفو پڑھنے لگی اور نانی اماں اطمینان سے تاگا ادھیڑتی رہی ۔ اگرچہ صفیہ نے “اے مین رین” کی رٹ لگا رکھی تھی ۔ لیکن اس کا دھیان کتاب کی طرف نہ تھا ۔ نگاہیں دیوار پر لٹکے ہوئے کلنڈر پر جمی تھیں ۔ انگلیاں ورق سے کھیل رہی تھیں ۔ اور زبان اے مین رین کا ورد کر رہی تھی ۔

ملحقہ کمرے میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں ۔ دبی دبی باتیں ہوتیں پھر دبا دبا قہقہہ سنائی دیتا لیکن نانی اماں کا دھیان کسی اور طرف لگا تھا ۔ ہاتھ تاگا ادھیڑنے میں مصروف نگاہیں دور ۔ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خوش کن خواب دیکھ رہی ہو ۔ منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی ۔ اور آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی چمک ۔

صفیہ نے بے خبری میں اپنی چوکی گھسیٹی۔ آواز سن کر بڑھیا بیدار ہو گئی ۔ صفیہ کی طرف دیکھا اور چڑ کر بولی ۔ “اے ہے ذرا خیال سے پڑھ ۔ کتاب کہیں دھیان کہیں ۔ غلط تو پڑھنا ہی ہوا ۔ کیسی بُری عادت ہے تیری” ۔

“ٹھیک تو پڑھ رہی ہوں” صفو بولی ۔ “اور کیسے پڑھوں” ۔

“ٹھیک طور پر پڑھے بھی تو” ۔۔۔۔۔ بڑھیا گھورنے لگی ۔

“اوں ۔ جیسے تمہیں پتہ ہو” صفو نے ایک انداز سے کہا ۔ “یہ انگریزی ہے نانی اماں ، انگریزی” ۔۔۔۔۔۔ “معلوم ہے مجھے” ۔۔۔۔۔ ؟ “تمہیں آتی تو ہے نہیں” ۔

“اے ہے آتی نہیں تو کیا میں سمجھتی بھی نہیں کہ ٹھیک پڑھ رہی ہے تو کہ نہیں ۔ ہوں ؟ آخر اتنی دیر سے جو سُن رہی ہوں اللہ ماری یہ زبان” ۔

“لو میں تو کہہ رہی ہوں ۔ اے مین رین ۔ اے مین رین یہ کیا غلط ہے ؟”

“ہاں ہاں اب تو ٹھیک ہے ۔ جب نہ جانے کس طریقہ سے کہہ رہی تھی ۔۔۔۔۔ لے اب دیکھ تو اپنی انگلیوں کی طرف ۔ اس ورق نے کیا بگاڑا ہے ترا جو اسے مروڑ رہی ہے” ۔

“میں کیا توڑ رہی ہوں اسے ۔ میں تو ۔۔۔۔۔”

“بس اب لگی بہانے بنانے” ۔۔۔۔۔ “بہانے کہاں کرتی ہوں ۔ نانی اماں” ۔

“بہت زبان کھل گئی ہے تری” ۔۔۔۔۔ “اوں ۔ اوں”

“اوں ہوں کیا ہوا ۔ وہ جلال میں بولی ۔۔۔۔۔ “اور یہ ٹانگیں کیوں جھلانے لگی تو ۔ توبہ ۔ نہ جانے کب عقل آئے گی تجھے ۔ سنا نہیں تو نے” ۔ بڑھیا نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا ۔ نہ جھلا ٹانگیں ۔ کہہ جو رہی ہوں ۔ سیدھی ہو کر بیٹھ ۔۔۔۔۔ اور یہ پاجامہ ۔۔۔۔۔ اے ہے سب خاک میں لت پت کر دیا ۔ صفو ۔۔۔۔۔”

“اے ہے” ۔ نانی اماں بیٹھی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھیں ۔ “نادان بچی اے نہ جانے کہاں بھیج دیا ہے اسے ۔ انہیں تو ذرا خیال نہیں آتا ۔ لو اور سنو لڑکیوں کو بھی میلے میں بھیجتا ہے کوئی آج تک تو سننے میں نہ آیا تھا ۔ لیکن اب تو ایسا الٹا زمانہ آیا ہے کہ توبہ میری ۔ میں پوچھتی ہوں یہاں نہیں آئی بسنت

کیا ۔ جو چچا کے ہاں بھیج دیا صفو کو ۔ یہیں دیکھ لیتی یہ اللہ ماری پتنگیں ۔ یہاں بھی تو گننے میں نہیں آتیں ۔ نہ جانے وہاں کیا خاص بات تھی اللہ رکھے جوان ہونے کو آئی ہے ۔ جوان لڑکیاں اچھی لگتی ہیں کوٹھے پھلانگتی ہوئی ۔ پوچھے کوئی ۔ لیکن اس گھر میں کوئی سنے بھی کسی کی ۔ نہ جانے کیا ہوگیا ہے ان کی سمجھ کو اور بھیجنا ہی تھا تو دوپہر کو بھیج دیتے دو گھڑی دیکھ کر چلی آتی واپس ۔ اتنی سویرے لڑکی کو بھیج دینا ۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے ٹھنڈ لگ جائے تو ۔ نہ جانے کب آئے گی وہ ۔ نہ کھانا نہ پینا ۔ اور پھر کوئی اسے نگاہ میں رکھے نہ رکھے ۔ اللہ نہ کرے اگر کوٹھے سے گر پڑے تو ۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی ۔ ڈور سے ہاتھ کاٹ لے ۔ ہاں ۔ اسے سمجھ بھی ہو ۔ بالکل بچی ہے وہ تو ۔ اور اللہ ماری یہ ڈور ۔ کم بخت دھار کی طرح تیز ہوتی ہے ۔ لڑکی کی ماں نے تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں ۔ پھر مجھے کیا پڑی ۔ میری بلا سے ۔ غصے میں وہ دیوار کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی ۔ جیسے دیوار سے روٹھ گئی ہو ۔ صادقہ اور عقیلہ باتیں کرتی ہوئی پاس سے گذریں تو اس کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو گئی ۔ اس نے صادقہ کو آواز دی ۔ ”صادقہ“ لیکن دونوں لڑکیاں باتوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہوں نے بڑھیا کی آواز نہ سنی ۔ ”صادقہ“ وہ جلال میں بولی ۔ ”کون ہے“ ؟ عقیلہ نے کہا ۔ ”کوئی بھی نہیں نانی اماں ہے“ ۔ صادقہ نے جواب دیا ۔ اور وہ ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں ۔

نانی اماں کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا ۔ ”کانوں میں روئی ٹھونسے پھرتی ہیں دڑگ دڑگ ۔ اُدھر سے اِدھر ۔ دڑگ دڑگ اِدھر سے اُدھر اور کیا ۔ چاہے کسی کا گلا خشک ہو جائے آوازیں دے دے کر ۔ کیا مجال جو انہیں خبر ہو ۔ کیا زمانہ آیا اے ۔ مزاج ہی ٹھکانے نہیں ان کے ۔ توبہ یہ آج کل کی لڑکیاں !!“

مانی نے بڑھیا کے پاس آکر زور سے سیٹی بجائی تو وہ چونک پڑی ۔ مانی کِھلکھلا کر ہنسنے لگا ۔ ”ڈر گئی نانی اماں ڈر گئی ۔“ ”چل دور ہو“ ۔ وہ غرائی ۔ ”شیطان کہیں کا ۔ وہاں جا کر بجا اسے اپنی ماں کے کان میں ۔ ہاں ۔ شرم نہیں آتی ۔ مجھ سے مذاق کرتے ہوئے“ ۔ مانی بڑھیا کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہوگیا اور سیٹی بجانے لگا ۔ ” میں کہتی ہوں ۔ جائے گا تو یا کہوں تیری اماں

سے ؟“ مانی نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا ۔ ”اچھا ٹھہر تو“ بڑھیا نے دھمکی دی لیکن مانی نے چلے جانے کی بجائے جھک کر اس کے کان کے قریب سیٹی بجانی شروع کر دی ۔ ”اچھا پڑا بجا“ ۔ وہ بولی ۔ ”اپنے کان بہرے کرے گا ۔ میرا کیا لے گا“۔ اور وہ شدت سے تاگا ادھیڑنے میں مصروف ہو گئی ۔

جب صادقہ کمرے سے باہر نکلی تو بڑھیا اس پر برس پڑی ۔ ”میں کہتی ہوں ۔ تم نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے کیا ۔۔۔۔۔ ؟“

”ہم نے تو کوئی نہیں ٹھونسی ۔ تمہارے ہی مزاج ٹھکانے نہیں نانی اماں“ ۔

” میرے مزاج ۔ کیوں کیا ہے مجھے ؟ صبح سے چلا رہی ہوں کہ ۔۔۔۔۔ “

”تمہاری تو عادت ہو گئی ہے نانی“ ۔ صادقہ یہ کہہ کر چلی گئی ۔

”صفو کی ماں ذرا یہاں تو آ ۔ بات سن کر جا میری ۔“ اس نے اسے آتے ہوئے دیکھ کر کہا ۔۔۔۔۔ ”ابھی آئی اماں ۔“ اس نے جواب دیا اور بغل والے کمرے میں داخل ہو گئی ۔ یہ دیکھ کر مانی دبے پاؤں آیا اور پیچھے کھڑا ہو کر بڑھیا کا منہ چڑانے لگا ۔

بڑھیا نے حسرت بھری نگاہ اٹھائی ۔ چاروں طرف دیکھا اور ایک لمبی آہ بھر کر کام میں لگ گئی ۔ اس کا سر جھک گیا ۔ چہرے پر جھریاں یوں سمٹ گئیں ۔ جیسے بے بسی کی لہریں چل رہی ہوں ۔ کمرے میں لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں ۔ باہر دیوان خانے میں قہقہے گونج رہے تھے ۔ صحن کے ایک کونے میں مرغیاں چوں چوں کر رہی تھیں ۔ چھتوں پر بچے شور مچا رہے تھے ۔ وہ کاٹا ۔ اس گہما گہمی کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھی جیسے کوسوں دور تک ویرانی چھائی ہوئی ہو ۔ جیسے صور پھنک جانے کے بعد لوگ نفسا نفسی میں کھوئے ہوئے ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ارد گرد کی دنیا کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کی اپنی دنیا بے سہارا اوندھی پڑی ہو ۔ اس نے تاگا ادھیڑنا بند کر دیا اور گٹھڑی سی بن کر کھٹولے پر دھوپ میں لیٹ گئی ۔ دیوان خانے میں مردوں کے قہقہے بے معنی سنائی دیتے تھے ۔ ملحقہ کمرے میں لڑکیوں

کی کھی کھی ارد گرد کی اداسی کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی ۔

"اماں" ۔۔۔۔۔ صفو کی آواز سن کر وہ چونک پڑی ۔ اٹھ بیٹھی ۔ "تو آگئی بیٹی ۔ آ میرے لال ۔ آجا" ۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے "اے ہے اتنی دیر رہی وہاں ۔ جی لگ گیا تیرا ۔ میری طرف دیکھ ۔ منہ کیوں نیچے کر رکھا ہے تو نے ۔ خیر تو ہے ۔ بولتی نہیں" ۔

صفو کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر نانی اماں نے اسے گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا ۔ "تُو تو میری جان کا سہارا ہے ۔ میں تو صرف تیرے لئے جیتی ہوں ۔"

لیڈی ڈاکٹر

"ہوں ۔ نروس بریک ڈاؤن" ۔ ڈاکٹر نے میرا بیان سن کر کہا ۔ "کب سے آنکھ لگی ہے" ۔

"پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے" ۔ میں نے جواب دیا ۔

"ہوں ۔ جگانا مناسب نہیں ۔ میں انتظار کروں گا ۔ کوئی محبت و جبت کا قضیہ تو نہیں" ۔

"معلوم نہیں" ۔ میں مسکرایا ۔ "غالباً جوان ہے ۔ خوش شکل ہے ۔ جاذب نظر ہے" ۔

"گذشتہ ہسٹری کیا ہے ۔ وہ ڈاکٹرانہ انداز سے پوچھنے لگے ۔

"دیکھئے نا" ۔ میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔ "میں آپ کو اپنی پوزیشن سمجھاتا ہوں ۔ "نہیں نہیں" وہ چلائے ۔ "آپ کی پوزیشن نہیں چاہیئے ۔ مریض کی گذشتہ ہسٹری" ۔

"دیکھئے نا ڈاکٹر صاحب ۔ بات یہ ہے کہ میں مریضہ سے قطعی ناواقف ہوں" ۔

"بالکل نہیں جانتے آپ ۔۔۔۔۔ ہوں" ۔ انہوں نے بے معنی نگاہ سے میری طرف دیکھا ۔ "جوان ہے ۔ خوش شکل ہے" ۔ اس سے پہلے بھی تو آپ کے پاس آتی جاتی ہوگی" ۔

"ڈاکٹر صاحب !!! میں چلّایا ۔ "غضب کر رہے ہیں آپ" ۔

"لیکن جب تک آپ مجھے حالات نہ بتائیں گے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا" ۔

غصّے سے میرا منہ لال ہوگیا ۔ ”لاحول ولا قوۃ ۔۔۔۔۔ کس غلط فہمی میں ہیں آپ ۔ سنئے بھی نا ۔ مریضہ میری بیوی کی سہیلی ہے ۔ میری بیوی گھر پر نہیں ہے ۔ مریضہ اس سے ملنے کے لئے آئی تھی ۔ کہیں باہر سے آئی ہیں آپ ، چونکہ ہمیں آج شام کو بجّی کا انتظار تھا ۔ خیال تھا کہ وہ شام کی سروس سے آجائیں گی ۔ اس لئے مریضہ اس کے انتظار میں بیٹھی رہی ۔ پھر وہ واقعہ ہوگیا جو میں بیان کر چکا ہوں ۔ ان حالات میں میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو بلا لوں“۔

”ہوں“۔ ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے کہا ۔ ”تو آپ مریضہ سے بالکل ناواقف ہیں“۔ پھر وہ ربڑ کی ٹوٹیوں سے کھیلنے میں مشغول ہوگیا ۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔ دفعتاً وہ بولا ”مریضہ سے دریافت کئے بغیر میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا ۔ آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے ہوش نہیں“۔

”جی ہاں“۔ میں نے جواب دیا ۔

”اچھا تو میں انتظار کروں گا ۔ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ۔ آدھ گھنٹہ تک انتظار کر سکتا ہوں میں“۔

باہر ہوا زوروں پر تھی ۔ درختوں کے پتے شائیں شائیں کر رہے تھے ۔ کبھی کبھار بجلی کے چمکنے سے آنکھیں چندھیا جاتیں ۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خوفناک کڑک گونجتی جسے سن کر دل پر منوں بوجھ پڑ جاتا ، پھر ہوا ٹہنیوں سے لپٹ کر چیختی اور تھک کر کراہنے لگتی ۔ اف وہ رات ۔ کمرے میں ایک طرف وہ خوب صورت اجنبی مریضہ یوں منہ ڈھانپے پڑی تھی جیسے کل کی مری ہوئی ہو ۔ میز کے پاس ڈاکٹر ربڑ کی ٹوٹیوں سے کھیل رہا تھا ۔ اس وقت وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ۔

”کیوں ڈاکٹر کیا آپ اس عجیب بیماری کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جسے محبت کہا جاتا ہے ۔“ میں نے بات چھیڑنے کی غرض سے کہا ۔

”کیا“۔ ڈاکٹر چونکا ۔

”کیا میٹریا میڈیکا میں محبت کا بیان ہے“ میں نے پوچھا ۔

”نہیں“۔ وہ خشک انداز سے کہنے لگا ۔ ”لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ

محبت واقعی ایک بیماری ہے ۔ جیسے یرقان یا پائیوریا“۔

”تو آپ اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں نا“۔ میں نے ازراہِ مذاق سوال کیا ۔

”بالکل“۔ وہ بولا ۔ ”تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے“۔

”کیا آپ کو بھی یہ مرض ہوا ہے کبھی“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ۔

”مجھے ؟“ وہ مسکرا دیا

”ہاں آپ کو“۔

”میں بھی تو آخر انسان ہوں“۔ ڈاکٹر کے چہرے پر بشاشت چمکی ۔

”کوئی نرس ہوگی“۔ میں نے اسے چھیڑا ۔

”نہیں“۔ وہ ہنسا اور سٹیتھو سکوپ پھینک کر آگ تاپنے لگا ۔

”بہت خوبصورت ہوگی وہ ؟“ میں نے بات چلائی ۔

”کون ؟“ ایک ساعت کے لئے وہ چونکا ۔ اچھا ”وہ ۔ پھر مسکرانے لگا ۔ شاید خوبصورت ہو ۔ میں نے سنا تھا کہ وہ واقعی بے حد خوبصورت ہے“۔

”سنا تھا ؟“ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔

وہ میری حیرانی کو سمجھ کر ہنسنے لگا ۔ ”ہاں سنا تھا ۔ دیکھا نہیں“۔

آپ نے اسے دیکھا تک نہیں ۔

”نہیں“ وہ بولا ۔ ”دیکھنے کی نوبت نہ آئی“۔

”اور آپ کو اس سے محبت تھی“۔ میری ہنسی نکل گئی ۔

”محبت نہیں عشق عشق“۔

”بن دیکھے عشق ہوگیا تھا کیا“؟۔

”ہاں“۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز ہنسی کھیلنے لگی ۔ ”ایسے حالات

میں صرف عشق ہو سکتا ہے عشق ، محبت نہیں ہو سکتی"۔

"یہ محبت اور عشق کا فرق بھی خوب رہا ۔ اگر بُرا نہ مانیں آپ تو میں بھی سنوں وہ واقعہ"۔

"میری زندگی کا عجیب ترین واقعہ ہے" اس نے کرسی آگ کے قریب تر سرکاتے ہوئے کہا ۔ "عجیب ترین واقعہ"۔

"تو آپ بھی اس مرض کے ہاتھوں لاچار ہو چکے ہیں کبھی"۔ میں گنگنایا ۔

"اب تک ہوں"۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"سچ ؟" واقعی ۔ دو سال ہو چکے ہیں دو سال"۔ اس نے ایک آہ بھری ۔

ہنستے ہنستے میری نظر مریضہ پر جا پڑی ۔ رضائی ہلتی دیکھ کر خیال ہوا کہ وہ جاگ پڑی ہے ۔ ڈاکٹر سے کہنے والا ہی تھا کہ وہ بولا ۔ "وہ ایک عجیب ترین واقعہ تھا"۔ اس عجیب ترین واقعہ کو سننے کے لئے میں بے تاب ہو رہا تھا اگر میں ڈاکٹر کی توجہ مریضہ کی طرف دلا دیتا تو اس واقعہ کو سننے کا کوئی امکان نہ رہتا ۔ اس لئے خاموش ہو رہا ۔

"ان دنوں میں رضا پور ڈسپنسری سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ جا رہا تھا ۔ رضا پور ایک چھوٹی سی ڈسپنسری ہے ۔ جہاں میں انچارج کی حیثیت سے کام کر رہا تھا ۔ لیکن سیالکوٹ کے ہسپتال میں مجھے سب انچارج کے فرائض سر انجام دینے تھے ۔ قدرتی بات تھی مجھے یہ تبدیلی پسند نہ تھی سب انچارج کی حیثیت کون پسند کرتا ہے ۔ رضا پور میں سب سے پہلے تھانے دار نے مجھ سے اس کا ذکر کیا بولا ۔ ڈاکٹر صاحب ۔ سیالکوٹ میں جا کر مزے کرو گے نا"۔

"مزے ؟" میں نے حیرانی سے دہرایا ۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا ۔ جیسے کچھ پتہ ہی نہ ہو ۔ "آخر بات کیا ہے" میں نے پوچھا ۔ کہنے لگا ۔ "اس ظالم پر تو سارا سیالکوٹ مرتا ہے ۔ اُف کیا چیز ہے ۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے"۔ "بھئی وہ کون ہے" میں نے حیرانی سے پوچھا"۔ "وہی لیڈی ڈاکٹر"۔ وہ مسکرایا ۔ "جو زنانے ہسپتال میں ہے وہاں ۔

لیکن ڈاکٹر ایسی شاطر ہے وہ کہ کسی کے ہتھے نہیں چڑھتی ۔ اچھا بھئی سیالکوٹ جا کر ہمیں یاد رکھنا"۔

پھر کواپریٹو انسپکٹر آ گئے ۔ وداع ہوتے وقت وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے ۔ "برا نہ مانئے لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کو آگاہ کر دوں"۔ "فرمائیے" ملک صاحب میں نے کہا ۔ ملک صاحب اپنے طبعی بزرگانہ انداز سے کہنے لگے ۔ "نزہت سے بچ کر رہئے گا ۔ وہاں سیالکوٹ میں"۔ نزہت ، کون ملک صاحب"۔ وہی لیڈی ڈاکٹر ۔ برے بھلے کے متعلق تو خدا جانتا ہے لیکن وہ بدنام ہے"۔ ان کی باتیں سن کر میں نے اس موضوع میں دلچسپی لینی شروع کر دی ۔ میں نے کہا ۔ "کیا وہ آوارہ ہے"۔ "نہیں نہیں"۔ وہ بولے ۔ "آوارہ نہیں"۔ پھر میں نے پوچھا ۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بری عورت نہیں لیکن چونکہ خوبصورت ہے ۔ اس لئے ہر ایک کی نظر پر چڑھی ہوئی ہے ، کیا افسر ، کیا چپڑاسی ، ذرا خیال رکھنا"۔

سیالکوٹ دفتر میں پہنچا تو ایک کلرک بولا ۔ "لو جی یہ آ گئے ہسپتال کے سب چارج" ہیڈ کلرک نے اپنی عینک سنواری اور مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی سائینسدان کسی نئی قسم کے جرثومہ کو دیکھتا ہے ۔ کونے میں سے ایک صاحب چلائے ۔ "بھئی واہ یہ جوڑا ٹھیک رہے گا ۔ پہلا سب انچارج تو انچارج کی طرح قابل پنشن تھا" ۔ لالہ جی ہنسے ۔ "یہ تو بہت چست معلوم ہوتے ہیں ۔ ہم تو جب مانیں گے ۔ لالہ جی کلرک بولا ۔ جب ان کی چستی کا نتیجہ نکلے گا ۔ خیر بھئی جوڑا برابر کا ہے"۔ دوسرا گنگنایا ابھی نہیں ۔ تیسرا مجھے گھور کر کہنے لگا ۔ وہ تو بجلی ہے بجلی"۔ اس بات پر میں سمجھ گیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کا ذکر کر رہے تھے ۔

لیڈی ڈاکٹر کے متعلق باتیں سن کر میرے دل میں اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا ۔ جب کبھی اکیلا بیٹھا ہوتا مجھے اس کا خیال آ جاتا ، ایک خوبصورت مجسمہ میری آنکھوں تلے آ کھڑا ہوتا ۔ یا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا یا برآمدے میں ٹہلنے لگتا اور میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہتا ۔ غرضیکہ میں نے لوگوں کی باتیں سن سن کر اکیلے میں اندازے لگا لگا کر اپنی خواہشات کو بھرما بھرما کر دل

ہی دل میں لیڈی ڈاکٹر سے عشق پیدا کر لیا ۔ اب میں بے تابی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب میں اسے دیکھنے والا تھا ۔ آخر ایک روز ہمیں ملنا ہی تھا نا ۔ کب تک سامنے نہ آئے گی ۔ لیکن سیالکوٹ آئے مجھے پانچ دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اسے ملنے کا موقع نہ ملا تھا ۔

میری زندگی میں ایک عجیب بات واقعہ ہوتی رہی ہے ۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا جب کبھی میرے دل میں کسی خاص عورت کی محبت یا آرزو پیدا ہوتی ہے عین اس وقت کوئی اجنبی عورت خواہ مخواہ میری زندگی میں داخل ہو جاتی ہے اور ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ نہ میں ادھر کا رہتا ہوں اور نہ اُدھر کا"۔

"عجیب بات ہے ۔" میں نے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا ۔

"ہاں"۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا ۔ "بارہا ایسا واقعہ ہو چکا ہے ۔ ایک دن شام کے وقت میں صحن میں ٹہل رہا تھا ۔ گھر کی بتیاں تک روشن نہ کی تھیں ۔ نہ جانے کس خیال میں کھویا ہوا تھا میں ۔ مختصر سا کوارٹر تھا وہ ۔ درحقیقت میرا مکان کوارٹر نہ تھا بلکہ مریضوں کا ایک کوارٹر مجھے دے دیا گیا تھا ۔ اس کا ایک دروازہ ہسپتال میں کھلتا تھا اور دوسرا باہر گلی میں"۔

"مریض کہاں ہے ؟" سُریلی آواز میرے کان میں پڑی ۔ شام کے دھندلکے میں میرے روبرو دروازے میں ایک چٹا سفید چہرا جھلملا رہا تھا ۔ نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے کیا ہوا ۔ میں نے سمجھا شگفتہ آ گئی ہے ۔ شگفتہ میری ایک پرانی آشنا ہے ۔ کبھی کبھی وہ یونہی اطلاع دئے بغیر آجایا کرتی ہے اور دو ایک دن میرے پاس ٹھہر کر چلی جاتی ہے ۔ ہر بار وہ نیا بہانہ بنا کر آتی ہے ۔ کبھی مریضہ بن کر اور کبھی ڈاکٹر ۔ اسے دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ شگفتہ ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنی جگہ کھڑا رہا ۔ میں نے کہا ۔ کون مریض ؟"۔

"میرا مطلب ہے" وہ بولی ۔" اس وقت تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ شگفتہ ہے ۔" میں نے کہا ۔ "میں جانتا ہوں تمہارا مطلب" اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے میں نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا ۔ "صاحب؛" وہ چلّائی "میں بتاتی ہوں آپ کو"۔ تم کیا بتاؤ گی میں خود بتاتا ہوں تمہیں"۔ اس نے دو ایک

ہلکی ہلکی چیخیں ماریں ۔ لیکن میں قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔ "کس غلط فہمی میں ہیں آپ"۔ وہ چلّائی "لو سب غلط فہمیاں دور کئے دیتا ہوں"۔ میں نے اسے بے تحاشا چومنا شروع کر دیا ۔ پھر وہ خاموش ہوگئی تو میں نے بتی جلائی اور کہنے لگا ۔ "لو اب کہو مزاج کیسے ہیں"۔ ارے ۔ اسے دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ شگفتہ کی جگہ ایک اجنبی عورت میرے بستر پر گھٹڑی بنی پڑی تھی ۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا ۔ "مجھے بے حد افسوس ہے ۔ معاف کیجیئے گا"۔ میں نے معذرت کی لیکن معاً مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے اسے ذرا بھی احساس دلایا کہ میں نادم ہوں یا ڈر گیا ہوں تو وہ بپھر جائے گی ۔ ڈاکٹر بن کر عورت کی نفسیات سے کچھ واقفیت ہو ہی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا ۔

یعنی آپ کا مطلب ہے اگر آپ گھبرا جاتے تو ۔۔۔۔۔۔ میں نے اپنا خیال الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔

بالکل ۔ وہ بولا اگر میں گھبرا جاتا تو وہ بپھر جاتی ۔ اف ۔ کس قدر بدنامی ہوتی ۔

"عجیب بات ہے" میں نے کہا ۔

بالکل حقیقت پر مبنی وہ بولا ۔ اتنی زیادتی کر دینے کے بعد یہ کہنا کہ مجھ سے غلطی یا بھول ہوئی ۔ عورت کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہوتا ہے ۔ ایسے حالات میں اسے اپنانے کے سوا چارہ نہیں ہوتا ۔ تو صاحب میں نے جھٹ کہہ دیا ۔ ان پیاری گستاخیوں کا افسوس نہیں مجھے بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ اتنی جلدی بتی جلا دی"۔

"عجیب انسان ہیں آپ"۔ غصے سے اس کا منہ لال ہو رہا تھا ۔

"تم بھی تو عجیب ترین عورت ہو ۔ عجیب اور بے حد پیاری" میں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا ۔

اب میں کیا کہوں ۔ اس کے ہونٹوں پر موہوم مسکراہٹ جھلکی ۔

"کہنے کی ضرورت بھی ہو" میں چلایا ۔ "نیچی نظر سے دیکھنا ہی کافی ہے ۔

اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنا کھویا ہوا توازن حاصل کر سکے ۔ میں نے اسے پھر سے چومنا شروع کر دیا ۔ پہلے تو اس نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی ۔ لیکن صاحب میری گرفت بھی تو ڈوبتے کی گرفت کے مصداق تھی"۔

"ڈوبتے کی گرفت ؟" میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ۔

"ہاں صاحب" وہ مسکرایا ۔ اگر وہ ذرا بھی بگڑ جاتی تو کس قدر بدنامی ہوتی ۔ میرا سارا کیریر برباد ہو جاتا ۔ یقینی طور پر وہ مجھے نوکری سے برطرف کر دیتے ۔ ہاں ۔ تو جلدی ہی اس کی کوششیں ڈھیلی پڑ گئیں حتیٰ کہ اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ۔

پھر تو آپ نے من مانی کی ہوگی"۔ میں مسکرا دیا ۔

"قطعی نہیں"۔ وہ بولا ۔ "اسے یوں پا کر میں نے اس سے دوستی گانٹھنی شروع کر دی"۔

"وہ کیسے ؟"

"باتیں" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ عورت کو بھرمانے کے لئے باتوں سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ۔

"آپ نے تو میری سدھ بدھ مار دی ہے" ۔ وہ مسکرائی ۔ "سدھ بدھ تو مجھے نہیں رہی جب سے تمہیں دیکھا ہے"۔ میں نے جواب دیا ۔

"کیوں مجھے کیا ہے" وہ بولی "مجھے کیا معلوم" میں نے کہا "دیکھ لو ایک پڑھا لکھا سمجھدار ڈاکٹر ایک جھلک سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے" "ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے آ[illegible]ط فہمی سے ایسا کیا ہے" وہ بولی ۔

"غلط فہ[illegible]ی غلط فہمی ۔ میں انجان بن گیا ۔ "شاید آپ کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے ۔ جب میں آئی آپ سمجھے میں وہ ہوں"۔

"پگلی" میں ہنسنے لگا ۔ "ساری عمر تمہارے انتظار میں بیٹھا رہا ۔ آخر تم آہی گئیں ۔ میں جانتا تھا تم آؤ گی ۔ ضرور آؤ گی ۔ اس میں غلط فہمی کا سوال

پیدا ہی نہیں ہوتا"۔

"اچھا" وہ مسکرانے لگی ، "بھلا بتاؤ تو میں کون ہوں"۔ اس بات پر میری ہنسی نکل گئی ۔ میں نے کہا مجھے نام سے کیا واسطہ ، مجھے تو تم سے غرض ہے چاہے تم کوئی بھی ہو تم میری ہو ۔ تم وہ ہو جس کا مجھے انتظار تھا ۔ یہ سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی ۔ کہنے لگی "بات بنانا ختم ہے آپ پر" میں نے کہا ہاں بشرطیکہ تم سن رہی ہو ۔ اچھا اسی بات پر اپنا نام بتا دو ۔ نام کا کیا ہے ۔ وہ بولی ۔ "آپ کو تو مجھ سے غرض ہے ۔ چاہے کسی نام سے بلا لیا کرو"۔ تو تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں"۔ میں نے بگڑ کر کہا ۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی ۔ وہ میری طرف دیکھ کر چلائی"۔ ناراض نہ ہو جانا کہیں ۔ میرا نام صندلی ہے ۔ "صندلی" میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "فی البدیہہ معلوم ہوتا ہے ۔ خوب نام تجویز کیا ہے"۔ قسم ہے جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا"۔ وہ بولی ۔ پھر تو میں بڑا آدمی ہوں"۔ میں نے بن کر کہا "نہ جانے کیا ہیں آپ" وہ مسکرائی ۔ لیکن ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے آپ کے سامنے کوئی پردہ ٹھہر نہیں سکتا ۔ صندلی میرا نام نہیں لیکن بالپن میں مجھے سب ہی صندلی کہا کرتے تھے"۔ اس کی آنکھوں میں صداقت جھلک رہی تھی ۔ بس صاحب مختصر یہ ہے کہ میں نے ایسی ایسی باتیں کہہ کر دھاک بٹھادی ۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی تو میں محسوس کرنے لگتا کہ اس کے انداز میں تفریح کی جگہ سنجیدگی کی جھلک ہے ۔ لیکن یہ تو صرف وقت کٹی کر رہا تھا ۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور انگیٹھی میں اٹھتے ہوئے شعلوں کو غور سے دیکھنے لگا ۔ گویا ان شعلوں میں اسے کسی کی تصویر نظر آرہی تھی ۔

میری نظر مریضہ پر جا پڑی ۔ یقینی طور پر وہ جاگ رہی تھی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی لیکن اب وہ بائیں پہلو پر پڑی تھی ۔ منہ ہماری طرف تھا ۔ اگرچہ لحاف سے ڈھانپا ہوا تھا ۔ شاید وہ بھی ڈاکٹر کی آپ بیتی سن رہی تھی ، یا ویسے ہی لیٹی ہوئی ہو ۔

"اگر وہ اس قدر خوبصورت اور پیاری نہ ہوتی تو شاید میں اس کی محبت کا

دم بھرنے لگتا" ڈاکٹر گنگنایا ۔

خوبصورت نہ ہوتی تو ؟" میں چونکا ۔

"ہاں" وہ بولا "ہم رسمی خوبصورتی یا حسن کی ہلکی سی جھلک سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی کا حسن آنکھیں خیرہ کر دینے والا ہو تو دل میں جھجک اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے حسن کو ہم شک کی نظر سے دیکھتے ہیں یا شاید اس کی وجہ وہ انوکھی ملاقات ہو ۔ بہرحال میرے دل میں صندلی کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے ۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ ایک عام عورت ہو ۔ میرا مطلب ہے ہر ہاتھ کا کھلونا ۔ حالانکہ اس کی باتیں اور انداز نہایت مہذب اور پاکیزہ تھے لیکن اس کا حسن ۔ اُف

حسن بذات خود ایک بد قسمتی ہے ایک افتاد ۔ اگر میں صندلی کو دور سے دیکھتا ۔ چند دن اسے پاس سے دیکھنے کی آرزو لئے پھرتا ۔ چند مرتبہ وہ بے پروائی اور بے نیازی سے میرے پاس سے گذر جاتی تو میرے دل میں اس کے لئے عزت پیدا ہو جاتی ۔ اور شاید میں لیڈی ڈاکٹر کا خبط چھوڑ دیتا ۔ لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا ۔ صندلی کو دیکھ کر معاً مجھے لیڈی ڈاکٹر کا خیال آجاتا ۔ کس قدر مختلف تھی ۔ خاموش اور شرمیلی ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس روز تک میرے روبرو نہ آئی تھی ۔ اس کے بعد صندلی اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آجایا کرتی تھی ۔ عموماً وہ شام کو آتی اور آدھی رات کے قریب لوٹ جاتی ۔ پہلے دن تو اس بات کی ضرورت تھی کہ میں اس سے اظہارِ محبت کروں ۔ لیکن اس کے بعد مجھے ایسا ڈھونگ رچانے میں کوئی دلچسپی نہ رہی ۔ تو صاحب اس کے آنے پر ہم دونوں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتے وہ چائے بناتی اور ہم دونوں مل کر چائے پیتے اور ریڈیو سنتے یا تاش کھیلتے ۔ اور نہیں تو رضائی میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے رہتے شاید آپ سمجھتے ہوں کہ میں بات چھپا رہا ہوں ۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا "نہیں نہیں"۔ میں نے کہا" اس کی کیا ضرورت ہے ۔ ویسے بات کر رہا ہوں ۔" وہ بولا ۔ "اس کے حسن کو دیکھ کر ولولہ تو اٹھتا تھا لیکن اس کا یوں آپ ہی آپ آجانا ۔ مجھ سے بے تکلف لڑتے جھگڑتے رہنا ۔

اس کا بے پناہ حسن یہ سب باتیں مجھے روک لیتی تھیں ۔ نہ جانے کون ہے ۔ کہاں سے آتی ہے ۔ شاید یہ اس کا کام ہو ہزاروں خیال دل میں آتے"۔

"ہچ" ! ایک گھٹی ہوئی ہچکی کی آواز آئی ۔ ڈاکٹر چونکا اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا ۔ مریضہ بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ "کیسی آواز تھی"۔ وہ بولا ۔ معلوم نہیں"۔ میں نے کہا ۔ عین اس وقت باہر بجلی کڑکی ۔ پہاڑوں میں وہ کڑک گونجی ۔ گونجتی چلتی گئی ۔ اُف کس قدر طوفانی رات ہے ۔ ڈاکٹر بولا ۔ ہوا کس قدر زوروں پر ہے" میں نے کہا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑیاں طوفان کی زد میں آکر کراہ رہی ہوں"۔ ہوں وہ خاموش ہوگیا ۔ مریضہ کا لحاف آہستہ آہستہ ہل رہا تھا ۔ جیسے اس کے تلے لہریں اٹھ رہی ہوں ۔ عجیب سی حرکت ہے ۔ میں نے سوچا ۔ جیسے وہ ہچکولے کھا رہی تھی ۔ ہاں تو وہ لیڈی ڈاکٹر کیا ہوئی میں نے آہ بھر کر کہا ۔ "آپ تو صندلی کے بھنور میں پھنس گئے ۔"

"ہاں" ڈاکٹر مسکرایا ۔ "واقعی وہ ایک بھنور تھی ایک حسین پراسرار بھنور جس میں بالآخر ہم دونوں ڈوب گئے ۔ لیڈی ڈاکٹر اور میں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے کہ قدرت نے التزاماً وہ بھنور میری راہ میں پیدا کر دیا تھا ۔ اف کس قدر زبردست چیز ہے قدرت ۔ ڈاکٹر نے آہ بھری ۔ نہ جانے وہ اس کی آہ تھی جو کمرے میں چاروں طرف گونجنے لگی یا باہر کی ہوا تھی ۔ بہرحال میں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کمرے کا کونہ کونہ آہیں بھر رہا تھا ۔ "لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق تو ہوا ہوگا ؟" میں نے بات چلانے کی خاطر کہا ۔

"ہاں" وہ مسکرایا "جلد ہی وہ دن آگیا ۔ اس روز مجھے اپریشن کرنا تھا ۔ یا شاید کوئی اور بات تھی ، میں بھاگا بھاگا اپریشن روم کی طرف جا رہا تھا ۔ راہ میں مجھے کمپاؤنڈر ملا ۔ میں نے ویسے ہی اس سے پوچھا"۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں کیا" "جی نہیں"۔ وہ بولا ۔ "اندر لیڈی ڈاکٹر ہیں"۔ لیڈی ڈاکٹر ؟ میں اور بھی تیز چلنے لگا ۔ ابھی دروازے کے پاس ہی تھا کہ اندر سے ایک چپڑاسی آیا کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھہریئے ذرا"۔ کیوں" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ "اندر

لیڈی ڈاکٹر ہیں"۔ وہ بولا ۔ "پھر کیا ہے"۔ میں نے غصے سے کہا ۔ وہ سہم کر ایک طرف ہوگیا ۔ "جی انہوں نے کہا تھا"۔ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دو اندر نہ آئیں"۔ یہ کیا مذاق ہے میں نے سوچا ۔ "لیڈی ڈاکٹر کیا مجھ سے پردہ کریں گی ۔ کیا کر رہی ہیں وہ"۔ میں نے اپنے آپ کو مشکل سے روکا ۔ آپریشن کا سامان لے رہی ہیں ۔ ہم خود دیں گے انہیں سامان ، یہ کہہ کر میں اندر داخل ہوگیا ۔ دیکھتا ہوں کہ وہ دوسرے دروازے سے باہر جا رہی ہے ۔ لیڈی ڈاکٹر ۔ لیڈی ڈاکٹر میں چلایا لیکن وہ نہ مڑی ۔ میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ۔ اُف کس قدر بے عزتی ہوئی ۔ ہسپتال کے ملازمین بغلوں میں منہ ڈال کر ہنس رہے تھے ۔ "کیوں کمپاؤنڈر" میں نے برسبیل تذکرہ پوچھا کیا لیڈی ڈاکٹر پردہ کرتی ہیں ؟ نہیں تو وہ بولا"۔

اس روز مجھ سے ذرا کام نہ ہوا ۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ بات کیا تھی ۔ رہ رہ کر خفت کا احساس ہوتا ۔ شام کو صندلی آگئی ۔ اُف کس قدر غصہ آیا مجھے صندلی کو دیکھ کر لیکن پی گیا ۔ جس قدر مغموم تھا میں اسی قدر بشاش تھی وہ ۔ اس روز بات بات پر ہنستی ۔ چہکتی مجھے چھیڑتی ۔ اس کی باتوں سے مجھے خواہ مخواہ شک پڑنے لگا ۔ ایسا محسوس ہونے لگا ۔ جیسے وہ میرا راز جانتی تھی ۔ مجھے کھوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی ۔ میں خوب جانتا تھا کہ اس کے دل میں میرے لئے محبت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے ۔ صاف بات تھی ۔ پہلے روز میرا وہ رنگین اور دلیرانہ رویہ وہ دلچسپ اظہار محبت اور پھر یہ شان بے نیازی ۔ ایسے حالات میں کوئی عورت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی"۔ وہ ہنسا ۔ "جب ہم اکھٹے بیٹھے ہوتے ہیں اس کے خوبصورت پاؤں یا ہاتھ سے کھیلتا رہتا ۔ اس وقت وہ میرے منہ کی طرف تکتی رہتی ۔ حیران ہوتی ہوگی کہ یہ متوالا اپنی دلچسپ کھیل پاؤں اور ہاتھ تک محدود کیوں رکھتا ہے ۔ میں سب سمجھتا تھا ۔ اس کی بے قراری اور شوق کو خوب سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود بوکھلا بن کر بیٹھ رہتا ۔ اس کے اشارے اور کنائے رنگین اور واضح ہوتے ۔ لیکن میں ظاہر کرتا کہ میں کچھ نہ سمجھتا تھا ۔ مثلاً وہ چائے کا پیالہ اٹھانے کے لئے اس طریقہ سے جھکتی کہ اس کا چہرہ میرے منہ سے ٹکرا جاتا یا اس کا جسم مجھ سے چھو

جاتا ۔ یا وہ اپنا ہاتھ مجھے دکھا کر کہتی دیکھو تو میری قسمت میں کیا ہے ۔ میں جھوٹ موٹ ہاتھ دیکھتا رہتا اور پھر سوچ سوچ کر کہتا ۔ رسوائی ، بدنامی ، بہت سے مجنوں اور ، اور ہنگامے ۔ اُف تمہاری قسمت تو ایک مسلسل جھمیلہ ہے ۔ جھوٹ کہتے ہو وہ ہنستی ۔ جھوٹ کیسے میں جواب میں پوچھتا ۔ جسے قیامت کا حسن ورثہ میں ملا ہو اس کی قسمت میں اطمینان کہاں ۔ جو دیکھے گا عقل و خرد کھو بیٹھے گا ۔ ہر کوئی قرب کی آرزو کرے گا ۔ قرب سے ڈرے گا ۔ ہر کوئی محبت اور شک کی نظر سے دیکھے گا ۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ۔ کاش وہ آہ بھر کر کہتی ۔ کاش کہ میں ایک سیدھی سادی عام عورت ہوتی"۔

چچ ۔۔۔۔۔ کمرے میں ایک گھٹی ہوئی ہچکی گونجی ۔ معاً نظر مریضہ پر پڑی ۔ لحاف تلے گویا ربڑ کا گیند بار بار ابھر رہا تھا ۔ نہ جانے مریضہ کو کیا ہے ۔ میں نے سوچا ۔

ڈاکٹر نے بات جاری کی "اس روز بار بار مجھے خیال آتا اگر یہ ہاتھ صندلی کے بجائے لیڈی ڈاکٹر کا ہوتا ۔ اگر اس کی جگہ لیڈی ڈاکٹر میرے پاس بیٹھی ہوتی"۔

لحاف تلے مریضہ نے مدھم سی چیخ ماری ۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا ۔ "کیوں کیا بات ہے"۔ ڈاکٹر نے مجھے گھبرائے ہوئے دیکھ کر کہا ۔ آپ نے نہیں سنی آواز ۔ "ہاں" وہ ہنس دیا ۔ "ان پہاڑیوں کے طوفان ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنڈورا کا صندوق کھل گیا ہو"۔ لیکن مریضہ" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا "مریضہ" ڈاکٹر چونک پڑا ۔ پھر مریضہ کے بستر کو دیکھ کر بولا ۔ "ہاں مریضہ کو سونے دیجئے"۔ وہ بولا "آرام علاج سے بہتر ہے ۔ ڈاکٹر نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی ۔

"اس روز صندلی کی باتیں مجھے بڑی بامعنی معلوم ہوتی تھیں ۔ کہنے لگی ۔ آج آپ اس قدر کھوئے کھوئے سے کیوں ہیں ۔ نہیں تو میں نے ہنسنے کی کوشش کی ۔ یوں گھور رہے ہیں آپ جیسے مجھ میں کسی اور کو دیکھ رہے ہوں ۔ تمہارا وہم ہے میں مسکرایا ۔ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف دیکھنا ۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی ۔ اسی طرح پریشانی میں چند ایک

دن گذر گئے ۔ پھر ایک روز پیغام آیا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں ۔ آپریشن روم میں آجائیے ۔ میں فوراً تیار ہو کر ہسپتال چلا گیا ۔ اپریشن روم کے دروازے میں اسسٹنٹ سرجن کھڑے تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی بولے ۔ آپ آرام کیجئے ڈاکٹر ۔ آپریشن ہو گیا ہے ۔ ہوگیا ہے ؟ میں نے حیرانی سے پوچھا بولے نہیں ہوا نہیں لیکن میرے ساتھ لیڈی ڈاکٹر ہیں جب تک آپ راؤنڈ کر لیجئے ۔ کیسا آپریشن ہے ۔ میں نے پوچھا ۔ جسم میں رسولی ہے وہ بولے ۔ تو مجھے بھی اجازت دیجئے میں نے منت کی ۔ آپ کے تجربے سے میں بھی فائدہ حاصل کروں جو ۔ نہیں وہ بولے پھر سہی کبھی ۔ حرج ہی کیا ہے ۔ میں نے کہا ۔ لیڈی ڈاکٹر کا شامل ہونا ضروری ہے ۔ وہ بولے ۔ بیشک شامل ہوں میں نے کہا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ پلیز ڈاکٹر اندر سے آواز آئی ۔ ڈونٹ کم ان ۔ میں تو کٹ کر رہ گیا ڈاکٹر مسکرانے لگے ۔ برا نہ ماننا اور وہ دروازہ بند کر کے اندر چلے گئے ۔ اسی شام کو میں زخمی شیر کی طرح صحن میں ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا ۔ عجیب تماشا ہے ۔ ساری دنیا کے سامنے ننگے منہ پھرتی ہے لیکن مجھ سے پردہ ہے ۔ حرام زادی !!

اوہ ، آپ تو گالیاں دینے لگے صندلی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ۔

اس روز صندلی کا آنا مجھے ناگوار گذرا ۔ اس حد تک ناگوار گذرا کہ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی ۔

لوگوں کے منہ سے لیڈی ڈاکٹر کی تعریفیں سن سن کر میں پہلے ہی شوق سے بھرا بیٹھا تھا ۔ اس کے میرے روبرو آنے سے انکار کرنے پر وہ شوق دفعتاً عشق کے درجہ تک پہنچ گیا ۔ آپ جانتے ہیں ۔ نیا نیا عشق ہو تو دلچسپ باتیں نہیں سوجھتیں ۔ پہلے تو صندلی مجھ سے خاموشی کی وجہ پوچھتی رہی ۔ پھر وہ بھی ہار کر چپ ہو رہی ۔ مجھے خیال آیا کہ صندلی کو راز بتا کر اس سے کام لوں تو صاحب میں نے تمام واقعہ اسے سنا دیا ۔ وہ ہنسی کھلکھلا کر ہنسی ۔ بولی مرد بھی عجیب مخلوق ہے جو سامنے آجائے اس سے لاپروا ہو جاتے ہیں جو چھپ جائے اس سے عشق لگا لیتے ہیں ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے بات کرنے کی خاطر کہا یہ تو محض دل لگی ہے ۔ تم ہی سوچو ، صندلی اس کمبخت نے مجھ سے چھپ کر مجھے کتنی اہمیت دے دی ہے ۔ ہاں ، وہ مسکرائی بات تو ٹھیک ہے ۔ میں نے کہا ۔ اچھا کیسی ہے وہ لیڈی ڈاکٹر ۔ صندلی نے منہ بنا دیا ۔ عام سی ہے وہ بولی ۔ جیسے آپ اور میں ۔ تم سی ہے میں نے دہرایا ۔ پھر تو قیامت ہوگی قیامت ۔ اس کے بعد صندلی کو چپ لگ گئی ۔ اگر میں لیڈی ڈاکٹر کی بات کرتا تو وہ جل بھن جاتی ۔ بات بات پر آہیں بھرتی اور میری طرف دیکھتی ۔ ہوں تو آپ کو اس سے محبت ہے ۔ وہ کہتی شکر ہے آپ کو بھی کسی سے محبت ہوئی ۔

”چند ہی دنوں کے بعد ایک اور واقعہ ہوا ڈاکٹر ازسرنو مسکرانے لگا ۔

”چپڑاسی آکر کہنے لگا ۔ سول سرجن صاحب پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں آپ کو بلایا ہے ۔ میں وہاں پہنچا تو ڈاکٹر پہلے ہی سے موجود تھا ۔ ہم نے تیاری مکمل کر لی تو سول سرجن بھی آ گئے ۔ آتے ہی پوچھا ۔ لیڈی ڈاکٹر نہیں آئی ؟ میرا دل سینے میں اچھلا ، اس کا آنا ضروری ہے وہ بولے ۔ خاتون کی لاش ہے بڑا اہم کیس ہے ۔ اس نے چپڑاسی کو دوڑایا ، جاؤ انہیں بلا لاؤ ۔ ابھی آجائیں ابھی ۔ چپڑاسی کو دوڑاتے دیکھ کر خوشی سے میری باچھیں کِھل گئیں ۔ کیسے نہ آئے گی آج ؟ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے چند ہی منٹ کے بعد چپڑاسی لوٹ آیا ۔ بولا ۔ وہ کہتی ہیں ۔ میری طبیعت اچھی نہیں ۔ بیمار ہیں کیا سول سرجن نے پوچھا ۔ جی ۔۔۔۔ چپڑاسی کہتا کہتا رک گیا ۔ کیا بات ہے صاحب بولا ۔ جی وہ تو آرہے تھے ۔ پھر صاحب نے پوچھا ۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کون کون ہیں وہاں ۔ میں نے کہا حضور بڑے صاحب ہیں ۔ انچارج ہیں اور سب انچارج ہیں ۔ یہ سن کر وہ رک گئیں ۔ بولیں کہہ دو ہماری طبیعت اچھی نہیں ۔ اسسٹنٹ مسکرائے اور سول سرجن کے پاس جا کر زیرلب کچھ کہا ۔ نہیں ، نہیں صاحب چلّایا انہیں آنا پڑے گا ۔ ہم اس کے بغیر یہ کام نہ کر سکیں گے ۔ چپڑاسی جاؤ ان سے بولو صاحب کہتے ہیں جس حالت میں بھی ہیں آپ آجائیے ۔ جاؤ ۔

”کچھ دیر کے بعد چپڑاسی واپس لوٹا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا ۔

یہ دیا ہے انہوں نے وہ بولا ۔ صاحب نے کاغذ کی طرف دیکھا ۔ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی ۔ پڑھو ڈاکٹر کیا ہے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا ۔ پڑھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ۔ استعفیٰ بھیجا ہے صاحب ۔ مجھے دو وہ غصے میں چلّایا اور پن نکال کر اس پر لکھنے لگے ۔ چپڑاسی' ہیڈ کلرک سے بولو ۔ یہ استعفیٰ آج ہی منظور کیا جائے ۔ لیڈی ڈاکٹر کو اطلاع کر دی جائے ۔

"اس واقعہ پر میرے رہے سہے اوسان بھی کھو گئے ڈاکٹر نے بات جاری کی ۔ اس نے میری خاطر استعفیٰ دے دیا ہے ۔ سارے ہسپتال میں باتیں ہو رہی تھیں ۔ میری طرف انگلیاں اٹھتیں ۔ میری آمد پر لوگ چپ ہو جاتے ۔ اک ہنگامہ برپا ہوگیا ۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھتے ہوں گے ۔ نہ جانے وہ مجھ سے چھپنے پر مصر کیوں تھی ۔ نہ جانے وہ کون تھی ۔ شاید وہ مجھے جانتی ہو ۔ لیکن چھپنے سے مطلب ۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا ۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا میں کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔ کون ہے میں نے پوچھا ۔ لڑکے نے ایک بڑا سا لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا ۔ کہنے لگا ۔ یہ انہوں نے بھیجا ہے یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔ میں سمجھا کوئی سرکاری کاغذ ہوگا ۔ اندر آیا بجلی جلائی ۔ لفافے میں اس کی تصویر تھی ۔ نیچے انگریزی میں لکھا تھا ۔ گڈ بائی ڈاکٹر زینت"۔

کیا لیڈی ڈاکٹر کی تصویر تھی وہ ؟" میں نے پوچھا ۔

"ہاں" ڈاکٹر ہنسا ۔ قہقہہ مار کر ہنسا ۔ "تصویر !"

"خوبصورت تھی کیا ۔"

"خوبصورت" وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا بے حد خوبصورت تصویر تھی صرف اس کا منہ پرلی طرف تھا"۔

"پرلی طرف تھا ؟" میں نے پوچھا ۔

میں نے کئی بار اس کا چہرہ دیکھنے کی امید پر تصویر کو الٹایا بھی ۔ یہ حماقت کی انتہا تھی" وہ پھر ہنسنے لگا ۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔ "یہ بھی عجب مذاق تھا اس کا ۔ وہ تصویر اب بھی میرے پاس موجود ہے ۔ میں نے اسے

انلارج کر کے کمرے میں لٹکا رکھا ہے ۔ یار دوست اسے دیکھ کر ہنسا کرتے ہیں ۔ چوڑے شانے پتلی کمر اور لمبی چوٹی اس تحفہ کو دیکھ کر ہنسی نہ رکتی تھی ۔

کچھ دیر کے بعد صندلی آگئی ۔ اس روز اسے دیکھ کر مجھے غصہ نہ آیا ۔ لیڈی ڈاکٹر تو ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ چلو چند دن کی دل لگی ہی سہی"۔

قریب ہی کوئی کراہنے لگا ۔ میں نے مریضہ کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی پڑی تھی ۔ منہ کی طرف سے رضائی کا کونہ اوپر اٹھا رکھا تھا ۔

"ڈاکٹر نے پھر بات جاری کی بولا "اس روز میں نے صندلی کو بھرمانے کی بہت کوششیں کیں ، لیکن ظالم بے حد سنجیدہ تھی ۔ کہنے لگی اس کے بعد شاید میں آپ سے مل نہ سکوں ۔ ابھی تو تمہاری ضرورت پڑی ہے مجھے ، میں نے اسے چھیڑا ۔ اچھا اس نے آہ بھری ، میں ایک ضروری بات پوچھنے آئی ہوں وہ بولی ۔ بصد شوق میں نے ہنس کر کہا ۔ نہیں وہ کہنے لگی ۔ مذاق نہیں ڈاکٹر بے حد اہم بات ہے ۔ اہم اور سنجیدہ ۔ کہو میں نے منہ پکا کر لیا ۔ بولی ۔ میرے جیون ساتھی بنو گے ؟ میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اور کس کا جیون ساتھی بنوں گا ۔ وہ شیطان تو استعفیٰ دے کر چلی گئی ۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس سے محبت ہے ۔ وہ بولی ۔ ہاں معاً میری شوخی معدوم ہوگئی ۔ مجھے اس سے محبت ہے لیکن تم سے بھی تو ہے ۔ "ڈاکٹر" وہ غصہ میں چلائی ، کیا تم مجھے بازاری عورت سمجھتے ہو ؟ تم میری توہین کر رہے ہو"۔ میرا مطلب ہے"۔ مجھے پھر شرارت سوجھی ، میں جانتا ہوں تمہارا مطلب" میں نے اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور اندر لے جا کر چومنے لگا ۔ ڈاکٹر ، وہ چلائی ۔ اس کی چیخ سن کر میں گھبرا گیا"۔ محبت نہیں نہ سہی لیکن میری توہین نہ کرو"۔ پھر جو میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے میری طرف ایک گتا سا پھینکا ۔ گتے کا سخت کونہ میری آنکھ میں چُبھ گیا ۔ کچھ دیر کے بعد میں نے آنکھ کھولی تو وہ جا چکی تھی ۔ میرے سامنے ایک تصویر پڑی ہوئی تھی ۔ نیچے اردو میں لکھا تھا بصد شوق و محبت ۔ صندلی ۔ بالکل ویسا ہی انداز ۔

چہرہ کدھر تھا میں نے پوچھا ۔

Engr. Faraz Akram
kitaabghar.com

میری طرف ۔ وہ مسکرایا ۔ ”بس وہ آخری دن تھا ۔ اس کے بعد وہ بھی کہیں گم ہوگئی ۔“

”آپ نے صندلی کا پتہ نہ لگایا ۔“ میں نے پوچھا ۔

”اس کی کیا ضرورت تھی ۔“ وہ طنزاً مسکرایا ۔

”اس کی تصویر ؟“ میں نے پوچھا ۔

”اس کی تصویر اب بھی میرے پاس ہے“۔ وہ ہنسا دونوں تصویروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں ۔ غالباً ایک ہی فوٹوگرافر سے کھنچوائی ہوں گی ۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا ۔

دفعتاً مریضہ کے بستر میں حرکت ہوئی ۔ مریضہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ سیاہ لحاف میں اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا تھا ۔ نہ جانے کیسے ۔ میرے منہ سے ان جانے میں نکلا ۔ ”صندلی کی تصویر بھی انلارج کروائی ہوگی“۔ اونہوں“۔ ڈاکٹر بولا ۔ ”اسے نہیں لٹکایا“۔ وہ منہ بنا کر ہنسا ۔ ”میرا گھر پان والے کی دوکان نہیں“۔ قریب ہی سے ایک چیخ سنائی دی ۔ مریضہ دھم سے بستر پر گر پڑی ۔ کون تھا ڈاکٹر چلّایا ۔ ”ہائے کتنی مصیبت ہے“۔ نجمی کمرے میں داخل ہو کر بولی ۔ اسے دیکھ کر ہم اٹھ بیٹھے ۔ ”اوہ ڈاکٹر“ نجمی بولی“۔ آپ باہر چلئے ذرا“۔ ڈاکٹر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا ۔ ”اچھا میں جاتا ہوں“۔ وہ گنگنایا ۔ تم ہو نجمی مریضہ کو دیکھ کر خوشی سے چلائی ۔ مریضہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا ۔ باہر بجلی کی روشنی میں ڈاکٹر اپنا ہینڈ بیگ سنبھالے واپس جا رہا تھا ۔ مریضہ کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں ۔ گال آنسو سے تر تھے ۔ پاس نجمی حیران کھڑی تھی ۔ باہر ہوا ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر چیخ رہی تھی ، کراہ رہی تھی ۔

……

پیارا پالتو

سلیمان نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھا ۔ وہ بوٹ سمیت کاؤچ پر پڑا تھا ۔ سر تلے دو ایک گدیاں رکھی تھیں ۔ کمر تلے کاغذ اور کتابیں پڑی تھیں ۔ فرش پر جابجا کتابوں اور کاغذوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں ۔ پرلی طرف دو تین کرسیاں گڈ مڈ ہو رہی تھیں ۔ دو ایک کرسیوں پر کپڑے پڑے تھے ۔ ایک کرسی پر گدیاں یوں نیچے اُوپر رکھی تھیں جیسے چنگیر میں روٹیاں ۔

اس نے کاؤچ پر پڑے پڑے کمرے کا جائزہ لیا ۔ اور اس گھما گھمی کو دیکھ کر مسکرا دیا پھر ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے اپنے نوکر کو آواز دی ــــــ نتھے ــــــ او نتھے !“ پھر کوئی فلمی دُھن گنگناتے ہوئے وہ مٹھو کو دیکھنے میں کھو گیا ۔ مٹھو سفید رنگ کا جانور تھا ۔ جو اس نے کسی دوست سے بطور تحفہ لیا تھا ۔ اگرچہ اسے جانور رکھنے کا شوق نہ تھا ۔ لیکن اس سفید طوطے کو دیکھ کر اس کا دل للچا گیا ۔ اس نے طوطے کے لئے ایک پنجرہ بنوایا ۔ جو کسی ہلکی ، سفید اور چمکیلی دھات کا تھا ۔ اس روز سے وہ اور مٹھو ساتھی بن گئے ۔ اکثر بیٹھے بٹھائے وہ مٹھو کو دیکھنے یا اس سے باتیں کرنے لگتا ۔ مصیبت یہ تھی کہ مٹھو کو بولنا نہ آتا تھا ۔ وہ کبھی کبھار چیخ مار کر سلیمان کی توجہ مبذول کر لیتا اور پھر خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنا کرتا ۔ سلیمان کو طوطے کا نہ بولنا اور بھی پسند تھا ۔ کیونکہ اس نے کئی ایک ایسے طوطے دیکھے تھے جو ہر وقت میاں مٹھو چلّا چلّا کر سر کھا جاتے تھے ۔ اس طوطے کی سب سے بڑی خصوصیت جو سلیمان کو پسند تھی' یہ تھی کہ اس کی نشست کے انداز تھے ۔ کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی کسی فلاسفر کی طرح سوچ بچار میں کھویا ہوا ۔ یا اسے بیٹھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا گویا وہ ابھی اٹھ کر ناچنے لگے گا ۔ اس کا ہر انداز اظہار کیفیت سے بھرا ہوا تھا ۔ سلیمان اکثر کہا کرتا ۔ یہ طوطا تو آل ایکسپریشن ہے“ ۔ اس کے علاوہ اس کے ہر انداز

نشست میں جالی کیفیت موجود رہتی ۔ شائد اسی لئے طوطے کو دیکھنے سے اس کے دل میں راحت سی پیدا ہوتی ۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا گویا یہ طوطا صحیح معنوں میں جی رہا ہے ۔ اس بات پر وہ اپنے آپ میں وہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور شاید اسی لئے ہر سے خوش باش رہنے کا عادی ہو گیا ۔

ایک موٹا سا آدمی کشتی نما ٹوپی سنبھالتا ہوا دروازے میں آ کھڑا ہوا ۔

"ہجور ۔۔۔۔۔ !"

وہ چونک پڑا اور تھے کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر بولا ۔ "ہوں ۔۔۔۔۔ کیا ہے ۔۔۔۔۔ ؟"

"ہجور !" تھے نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا ۔۔۔۔۔ "ہجور : آپ ہی نے بلایا ہے" ۔

"اوہ !" وہ مُسکرایا ۔ "اچھا تو میں نے بلایا ہے ۔ ہوں ۔ اچھا ، اچھا ۔۔۔۔۔ تو چائے ہی بنا لاؤ ۔

"چائے" ۔ تھے نے سر کھجاتے ہوئے کہا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا ۔ "ابھی تو تین ہی بجے ہیں" ۔

"ہوں ۔ تو تین بجے ہیں" سلیمان نے مُسکرا کر گھڑی کی طرف دیکھا ۔ "ابھی تین بجے ہیں ۔ اچھا تو ہم سوا تین بجے چائے پیئں گے ۔ جاؤ ۔"

تھا سر کھجاتا ہوا باہر نکل گیا ۔ سلیمان کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہو ۔

سلمان کی طبیعت بلا کی آزاد تھی ۔ رسموں ، تکلفوں اور اصولوں سے بے نیاز ۔ متواتر آٹھ سال اس نے آزاد فضا میں گذارے تھے ، چھ بورڈنگ میں جب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور دو سال جب سے وہ پروفیسر تھا ۔ اب اسے صرف کالج جانے کی پابندی تھی ۔ وہ بھی کڑی نہیں ۔ کیونکہ پڑھانا یا نہ پڑھانا اس کی اپنی مرضی پر منحصر تھا اور طبعاً اس کی طبیعت میں پابندی کا احساس قطعی مفقود تھا ۔ جب جی چاہتا پڑھنے لگ جاتا ۔ کئی کئی دن وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہتا ۔ صبح و

شام ، صبح و شام اور بعض اوقات ہفتوں کتاب تک نہ کھولتا ۔ چائے پینے پر طبیعت آ جاتی تو دن میں چھ چھ چائے دانیاں پی جاتا ۔

وہ چائے چائے دانیوں کے حساب سے پیا کرتا تھا ۔ اسے ایسی آزاد زندگی بے حد پیاری تھی ۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار یہ بے مہار آزادی اس کے دل کے کسی کونے میں کھٹکتی ۔ اس کا جی چاہتا کہ گھر میں کوئی ایسا فرد ہو جو اس کی زندگی میں دلچسپی پیدا کرے جس کی رفاقت اس کی آزادی کو اور بھی رنگین بنا دے ۔ بسا اوقات جب اس کا احساس آزادی مسرّت کی لہریں بن کر اس پر چھایا ہوتا تو اس کے دل کے کسی کونے میں ایک ٹھیس سی اُٹھتی اور اسے پریشان کر دیتی ۔ وہ اس مبہم احساس کو بھلانے کے لئے اٹھ بیٹھتا ۔ کتاب کھول لیتا یا ویسے ہی کمرے میں ٹہلنے لگتا ۔ ورنہ مٹھو سے باتیں کرنے میں لگ جاتا اور ان جانے تھے کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتا ۔ کچھ گنگناتا اور جب تھا چائے کا ٹرے لے کر آتا تو حیران ہو کر پوچھتا ۔ "ہیں ، ابھی سے چائے ۔ ابھی تو تین ہی بجے ہیں ۔۔۔۔۔ تھے کی پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آ جاتی ۔ اور ساتھ ہی یاد آتا کہ اس نے خود ہی چائے کے لئے آواز دی تھی ۔ "اوہ" وہ مسکراتا ۔ "اچھا تھے میز پر رکھ دو" ۔

اس روز وہ خاص طور پر خوش تھا کیونکہ زندگی میں پہلی مرتبہ اماں اس کے پاس رہنے کے لئے آ رہی تھی ۔ اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ اماں سے منت کی تھی کہ اس کے ساتھ رہے لیکن بوڑھی ماں کو اتنی دور جانا گوارا نہ ہوا ۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے سلیمان کے لئے ایک خوبصورت سی دلہن لائے ۔ اسے چاؤ چونچلے سے بیاہے ۔ اس لئے وہ اکیلی اتنی دور جانے پر رضامند نہ ہوئی تھی ۔ سلیمان کو فی الحال بیاہ کرنا منظور نہ تھا کیونکہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا اور اماں دھوم دھڑاکے کا بیاہ کرنا چاہتی تھی ۔ قرض لینا اسے گوارا نہ ہوا اور روپیہ جمع کرنا اس کی سرشست میں نہ تھا ۔ ان حالات میں وہ بیاہ نہ کر سکتا تھا ویسے بھی اسے بیاہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی ۔ اس روز وہ خوش تھا کہ ماں نے اس کے ساتھ رہنا منظور کر لیا ہے ۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اماں کے آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح بیٹے کو بیاہ پر مائل کرے اور اس مقصد کے لئے کچھ

روپیہ جمع کر سکے ۔

اگلے دن صبح سویرے اس کی آنکھ کھل گئی ۔ باورچی خانے میں شور سن کر اسے غصہ محسوس ہوا اس نے ایک انگڑائی لی اور تھے کو آواز دے کر پوچھنے ہی والا تھا کہ سرہانے ماں کی شکل دکھائی دی ۔ لمبا سا جھریوں بھرا چہرہ گویا بے بسی کی تصویر تھا ۔ انداز میں دکھ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ۔ آواز میں لجاجت تھی ۔ اس کی ہر جنبش پر محسوس ہوتا گویا چینی کی پیالی چور چور ہو گئی ہے ۔

"سلیمان بیٹے تھوڑا سا ناشتہ کر لو" ۔ اماں نے منت سے کہا ۔ معاً وہ اُٹھ بیٹھا ۔ روز صبح اسے تھے تھے چیخنا پڑتا ۔ جب کہیں چائے نصیب ہوتی ۔ اور اسی چیخ پُکار میں اسے کالج سے دیر ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن اس روز اتنے سویرے سبھی کچھ تیار تھا بس اس کے اٹھ کر بیٹھ جانے کی دیر تھی ۔ واقعی گھر میں جان پڑ گئی تھی ۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر اس بڈھی جان کو گلے لگا لے ۔

چائے پیتے ہوئے اس کی نگاہ طوطے پر جا پڑی جو بڑے مزے سے کٹوری میں سے کچھ کھانے میں مصروف تھا ۔ "اوہ ۔۔۔۔۔ یہ تو ساری دنیا جاگ اٹھی ہے اور اتنے سویرے دیکھ اماں" ۔ اس نے ماں سے کہا ۔ "ذرا مٹھو کو دیکھنا کیسے انداز سے کھا رہا ہے ۔ خدا کی قسم اماں پیرس کی میم کو بھی مات کر دیا ہے ظالم نے ۔ تمہارے آنے پر اسے کس قدر خوشی ہوئی ہو گی ۔ ورنہ اسے کچھ کھانے کو مل جائے ۔ روز بار بار تھے کو یاد دلانا پڑتا تھا پھر کہیں جا کر بے چارے کو کچھ نصیب ہوتا لیکن اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے ۔"

چائے سے فارغ ہو کر وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے ۔ کیونکہ اس سے پہلے تو چائے پیتے ہی کالج سے دیر ہو جایا کرتی تھی ۔ اور وہ ادھر ادھر سے کوئی پتلون اٹھا ، کوٹ پہن جلدی میں تیاری کرنے کا عادی تھا ۔ شائد اسی لئے اگرچہ اس کے کپڑے صاف ہوتے لیکن پہناؤ میں وہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی ۔ جو اچھے کپڑے پہننے والے پیدا کر لیتے ہیں ۔ خیر اب تو اسے بے پروائی سے کپڑے پہننے کی عادت ہو چکی تھی اور ایسا لباس پسند تھا ۔ جس میں تزئین سے بے نیازی کی جھلک واضح رہے ۔ خیر وہ صوفے پر بیٹھ گیا ۔ کتاب کے ورق الٹتا پلٹتا

رہا ۔ اور طوطے کو غور سے دیکھتا رہا ۔ "کیوں مٹھو اب تو مزے ہو گئے نا دوست ۔ بڑی سوچ میں پڑے ہو" ۔ وہ مٹھو کے پاس جا کھڑا ہوا ۔ "دیکھا دنیا بدل گئی نا ۔ ہیں ؟" اس نے مٹھو سے باتیں کرنے کے دوران میں کپڑے بدلنا شروع کر دیا ۔

ابھی اس نے پہننے کے لئے کوٹ اٹھایا تھا کہ اماں آ گئی ۔ "اوہ بیٹا تم نے تو پہن بھی لئے کپڑے ۔ میں سمجھی ۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر وہ یوں مڑی گویا واپس جا رہی ہو ۔

"کیا بات ہے اماں" ؟ اس نے ماں کو آواز دی ۔ "میں نے تو نہیں پہنے کپڑے ابھی ۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا ۔ کیوں کیا بات ہے ۔"

"کچھ بھی نہیں بیٹے" ۔ ماں نے کہا ۔ "یہ کپڑے کچھ خراب سے تھے میں نے کہا ذرا صاف کر دوں ۔ برش کر کے لائی تھی یہ" ۔ اس نے ایک جوڑا دکھاتے ہوئے کہا ۔

"اوہ اماں !" وہ خوشی سے چلایا ۔ "یہ تو بہت صاف ہو گیا" ۔

اگرچہ وہ سوٹ سلیمان کو پسند نہ تھا اور وہ اسے پہننے سے احتراز کیا کرتا تھا ۔ اماں سے سوٹ لے کر اس نے پہنا ۔ اس روز وہ سوٹ بھی نیا نیا سا معلوم ہوتا تھا ۔ اس نے محسوس کیا گویا اس سوٹ کو خواہ مخواہ ترک کر رکھا تھا ۔ حالانکہ ایسا اچھا سوٹ تھا وہ ۔

کالج سے واپسی پر اماں بیٹھی راہ دیکھ رہی تھی کھانا تیار تھا ۔

"بہت دیر لگا دی بیٹا" ۔ اماں بولی ۔ "اتنی دیر تک لگتا ہے تمہارا کالج ۔ تم تو کہتے تھے کالج دو ایک گھنٹے لگتا ہے اور بس ۔۔۔۔۔ اچھا بیٹا" ۔ اس نے سلیمان کو خاموش دیکھ کر کہا ۔۔۔۔۔ "اب نہا لو تو کھانا اتار دوں ۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا بیٹے" ۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حسب معمول کاؤچ پر دھم سے جا پڑے ۔ کوٹ

اتار کر کسی کرسی پر پھینک دے ۔ پڑا پڑا ٹوپی کھونٹی پر ٹانگنے کی کوشش کرے اور اس دوران میں تھے کو آوازیں دے اور کھانا نہ تیار ہونے پر بُرا بھلا کہے ۔ اور طوطے سے کھانا تیار نہ ہونے کی شکائت کرے ۔ نہا کر کھانا کھاتے ہوئے اسے خوشی تو ہوئی لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں افسوس سا ہوا کہ اس کا بہترین مشغلہ اس سے چھین لیا گیا ہے ۔

"بس ؟" اماں نے اسے کھانے سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا ۔ "کیوں بیٹا ؟ تمہیں بھوک نہیں لگتی کیا ؟" اسکی آواز میں فکر نمایاں تھا ۔ "صبح چائے کے ساتھ بھی تم نے کچھ نہ کھایا تھا" ۔ ایک نظر اس نے اماں کی طرف حیرانی سے دیکھا ۔ چونکہ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس روز اس نے بڑی اشتہا سے کھانا کھایا تھا اور یقیناً روز سے زیادہ کھا گیا تھا ۔ پھر وہ مسکرا پڑا ۔ اماں کے چہرے پر تشویش اور پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آگئی ۔

"میں جانوں تمہیں پسند نہیں آیا" ۔ اماں نے دکھ بھری آواز سے کہا ۔ اس کی آواز لجاجت بھری تھی "کیوں بیٹے ؟"

"نہیں اماں" ۔ وہ ہنسا ۔ "میں تو روز پھوٹ پھوٹ کر کھاتا ہوں اور آج بھی میں نے ٹھونس کر کھایا ہے ۔ تم تو ویسے ہی گھبرا گئی ہو اماں" ۔ اس نے ہنستے ہوئے اٹھ کر کلّی کی اور پھر کرسی پر آ بیٹھا ۔

اس روز کمرے میں ہر چیز سلیقے سے پڑی تھی ۔ تمام کتابیں الماری میں رکھی ہوئی تھیں ۔ کرسیاں مناسب مقامات پر لگی تھیں ۔ میزوں پر دھلے ہوئے میزپوش پڑے تھے ۔ نہ جانے کیوں خواہ مخواہ اسے محسوس ہوا گویا وہ کتابیں بیکار ہو چکی ہوں اور مر جانے کے بعد الماری میں دفن کر دی گئی ہوں اور وہ کمرا بے جان پڑا ہو ۔ اگرچہ کمرے کی صفائی پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود اسے رہ رہ کر خیال آتا گویا وہ کمرا کسی غیر آدمی کا ہو ۔ جیسے سلیمان سے دور کا بھی تعلق نہ ہو ۔ اس نے اٹھ کر الماری سے ایک کتاب اٹھا لی ۔ گویا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا واقعی وہ کتابیں مر چکی تھیں یا ابھی جان باقی تھی ۔ تفریحاً وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا ۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکا ۔ سامنے اماں یوں کھڑی تھی ۔ گویا حزن و ملال کی ایک تصویر ٹنگی ہو ۔

"بیٹے !" ماں نے منت سے کہا ۔ "ابھی کھانا کھایا ہے ۔ ذرا آرام کر لے ۔ اللہ ماری یہ کتابیں ، تو نے تو پڑھ پڑھ کر جان ہلکان کر لی ہے ۔ آرام کر لے ذرا بیٹا" ۔

وہ زبردستی مسکرایا ۔ "تو کیا بے آرامی کر رہا ہوں ۔ ہیں اماں ؟"

"نہیں بیٹے ۔ میں کہہ رہی تھی ۔ ابھی تو سر کھپا کر آیا ہے ۔ اور پھر کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام تو بہت ضروری ہوا بیٹے ، ویسے تو آپ سیانا ہے ۔ اللہ رکھے سمجھدار ہے ۔ جو جی چاہے کر ۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی" ۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ۔ "دیکھو تو کیسا لاغر ہو گیا ہے ۔ نہ کھانا ، نہ پینا اور کام ہی کام ۔ اللہ ماری یہ کتابیں" ۔ اس نے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "ایک دو ہوں تو بھی ہے ۔ یہاں تو پورا کباڑ خانہ اترا ہوا ہے" ۔

"واہ اماں !" وہ ہنسا ۔ "میں کیا دبلا پتلا ہوں یہ دیکھو" اس نے چھاتی کے بٹن کھول کر اماں کو دکھایا ۔ دیکھا اماں پورا پہلوان بن گیا ہوں ۔ کھایا پیا اور پھر سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہا ۔ اور یہ کتابیں ، میں کیا پڑھتا ہوں انہیں ہونہہ ! اماں تو تو ویسے ہی فکر کرتی رہتی ہے" ۔

"آخر یہ کتابیں پڑھی ہی ہوں گی نا" ۔ وہ بولی ۔ "اب نہیں پڑھتا تو کیا ہوا ۔ یہ ایک ہی کتاب سر پھرا دینے کے لئے کافی ہے ۔ توبہ کتنی بڑی بڑی ہیں ۔ اچھا بیٹا ذرا آرام کر لے ۔ دو گھڑی سو لے تو کیا حرج ہے تیرا ؟ اماں نے مزید لجاجت سے کہا ۔

سلیمان بادل ناخواستہ اٹھ کر چارپائی پر جا پڑا اس روز گویا اس کی آنکھیں نیند سے قطعی خالی تھیں ۔ لیکن اس خیال پر کہ اماں کا دل نہ دکھے وہ چپ چاپ پڑ گیا ۔ اور سوچنے لگا کہ اماں کو کس قدر خیال ہے میرا ۔ بے چاری ہر گھڑی میری

بہتری سوچتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود چوری چوری اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلے ۔ مٹھو سے باتیں کرے یا کچھ گنگنائے ۔ اور پھر تھے سے چائے کا مذاق رہے ۔ لیکن اس روز تو کمرے کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کتابیں ادھر ادھر پھیلا دے ۔ کرسیاں گڈ مڈ کر دے ۔ حتیٰ کہ وہ کمرہ اس کا اپنا کمرہ ہو جائے ۔

نہ جانے کب تک وہ انہی خیالات میں کھویا پڑا رہا ۔ پھر اماں کی آواز سن کر چونک پڑا ۔۔۔۔۔ ”کیوں بیٹے ؟ تمہیں نیند نہیں آتی ۔ پنکھا کروں ؟“

”نہیں نہیں اماں ۔ پنکھا کرنے کی ضرورت بھی ہو ۔ میں تو بالکل آرام کر رہا ہوں“ ۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ ”تم کیوں فکر کرتی ہو“ ؟

”میں فکر تو نہیں کرتی بیٹے ۔ ویسے ہی دیکھنے آئی تھی کہ تم سو گئے ہو یا نہیں ۔ بس اب میں جاتی ہوں تم آرام کرو“ جاتے ہوئے وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی ۔ ”ناحق بے آرام کیا میں نے“ ۔

اماں کے چلے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ بیمار ہو ۔ اماں کے انداز کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مہلک بیماری کا شکار ہو اور صرف اماں اس بھید کو جانتی ہو ۔ اس خیال پر وہ مسکرا دیا ۔ ”یہ عورتیں ! وہ ہنسا انہیں بچوں اور بیماروں سے کس قدر لگاؤ ہوتا ہے ۔ کسی بے بس کی دیکھ بھال کرنے سے کس قدر دلچسپی ہوتی ہے“ ۔

”تم جاگتے ہو بیٹا“ ۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد وہ پھر آگئی ۔ ”چائے منگواؤں“ ۔

”کیوں نہیں اماں“ ۔ سلیمان اٹھ بیٹھا ۔ ”میں تو چائے کے انتظار میں بیٹھا ہوں“ ۔

چائے پیتے ہوئے اماں نے غور سے سلیمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ سلیمان اس محبت اور بے بسی کو دیکھ کر گھبرا گیا ۔ نہ جانے اماں اس قدر دکھی اور بے بس کیوں نظر آتی تھی ۔ وہ جانتا تھا ۔ کہ اماں کی زندگی میں بڑے بڑے

مصائب آئے تھے ۔ وہ کثرت ازدواج کی شکار تھی ۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اب تو ایک عرصہ سے اسے کوئی تکلیف نہ تھی ۔ کسی کی محتاج نہ تھی ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا موجودہ غم گزشتہ زندگی کی تمام تر تکلیفوں سے زیادہ جانگسل ہو ۔ سلیمان کا شادی سے یوں بے نیاز ہونا اس کے لئے سب سے بڑا دکھ تھا ۔ چونکہ اس کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں بیٹے کو آباد دیکھے ۔ بہرحال اس وقت وہ اماں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا ۔ اس لئے خواہ مخواہ اپنی توجہ ادھر ادھر مبذول کرنے میں لگ گیا ۔ تاکہ ماں کی طرف نہ دیکھ سکے ۔

جب سلیمان نے تیسرا پیالہ بنایا تو اماں بولی ۔ ”بیٹے تو بُرا نہ مانے تو کہوں ۔ اتنی چاء پینا اچھا نہیں ۔ یہ اللہ ماری ۔۔۔۔۔“ اس نے چاء دانی کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ ”بدن کی ساری چربی پگلا کر رکھ دیتی ہے ۔ دیکھ تو منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں تیرے“ ۔

”نہیں اماں“ ۔ وہ خواہ مخواہ چڑ گیا ۔ ”میں تو چھ چھ پیالے پی جاتا ہوں ۔ اس میں کیا ہے ؟“

”اچھا بیٹے !“ ماں نے آہ بھر کر کہا ۔ ”جیسے تیری خوشی ۔ پر یہ گرمی خشکی تیرے لئے اچھی نہیں ۔ آگے تو آپ سمجھدار ہے ۔ میں تو پاگل ہوں جو تجھے ایسی بات کہہ دیتی ہوں“ ۔ اس وقت اس کی آواز پیئے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی بھیگی سنائی دے رہی تھی ۔ سلیمان نے زبردستی طوطے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ۔ وہ ان تاثرات سے بچنا چاہتا تھا جو اماں کی آواز اور جھریوں بھرا چہرہ پیدا کر رہے تھے ۔ خوش قسمتی سے باورچیخانے سے تڑاخ کی آواز آئی ۔ ”دیکھنا تو اماں نہ جانے تھے نے کیا توڑ دیا ہے“ ۔ سلیمان نے بے پروائی سے کہا ۔

اماں کے جانے کے بعد دو ایک ساعت وہ خاموش بیٹھا رہا ۔ گویا چائے کا پیالہ پینے سے ہچکچا رہا ہو ۔ پھر اس نے دل کڑا کیا اور چائے کا تیسرا پیالہ غٹ غٹ پی گیا ۔ اور پھر جلدی جلدی چوتھا بنا کر معصوم انداز سے یوں طوطے کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

”لو بیٹے“ ۔ اماں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی ۔ تھوڑا سا مکھن کھا

kitaabghar.blogspot.com

لو ۔"

"مکھن ؟" سلیمان نے تعجب سے اماں کی طرف دیکھا ۔

"ہاں بیٹے" ۔ وہ بولی ۔ "چائے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ مکھن کا استعمال کر لیا کرو تو اچھا رہے ۔ ورنہ یہ کم بخت تو انتڑیاں سکھا دیتی ہے ۔ رس بسکٹ پر لگاؤ گے یا ٹوسٹ بنا دوں" ۔ اس وقت نہ جانے سلیمان کو وہ مکھن کا ٹکڑا اس قدر ڈراؤنا کیوں دکھائی دیا ۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ۔

"لیکن اماں ۔۔۔۔۔" وہ رک گیا ۔ معاً اسے خیال آیا کہ اماں کا دل دکھانا اچھا نہیں ۔ بادل ناخواستہ اس نے وہ ٹکڑا اماں کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا ۔ "نہیں اماں ٹوسٹ کی کیا ضرورت ہے" ۔ اس نے تھوڑا سا مکھن رس بسکٹ پر لگا لیا ۔

"ذرا سا اور لگا لو" ۔ اماں نے لجاجت سے کہا ۔ "اتنے سے مکھن سے کیا ہو گا ؟" سلیمان نے محسوس کیا ۔ گویا اس وقت دنیا کی چیزوں میں صرف ایک مکھن ہی تھا ۔ جس کے خلاف اسے اس قدر نفرت تھی ۔ اسے پسینہ آ گیا ۔ پھر اسے سوجھی ۔ چھری یوں چلائی گویا مکھن لگا رہا ہو لیکن سارے کا سارا مکھن چھری پر اتر آیا ۔ جھٹ چھری والے ہاتھ کو میز تلے چھپا کر وہ ایک نوالے ہی میں بسکٹ نگل گیا ۔ ماں سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی ۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی معصوم کو دھوکا دیا ہو ۔ گویا وہ چور ہو ۔ ایسی معمولی سی بات پر فریب کرنا ، یہ احساس اس کی نظر میں اس کے جرم کو اور بھی قبیح بنا رہا تھا ۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ وہ بودا آدمی ہے ۔ اس میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ ماں سے دل کی بات کہہ دے ۔

چائے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ ٹوسٹ اس کے معدے میں پھول پھول کر آفت بنا رہا ہو ۔ پہلے تو وہ کمرے میں ٹہلتا رہا ۔ مگر وہ اس مکھن کے ٹکڑے کو بھلا نہ سکا ۔ پھر ماں سے کہنے لگا ۔ "اماں میں ذرا سیر کر آؤں" ۔

"ہاں ہاں بیٹے" ۔ وہ بولی ۔ ذرا ٹہل آؤ ۔ لیکن جلدی لوٹ آنا ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا ۔

کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا سے اسے چڑ تھی ۔ وہ یہ بات سن کر اکثر طنزاً ہنسا کرتا ۔ یہ عورتیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا کا پاکھنڈ کرنا خوب جانتی ہیں وہ اپنے دوست سے اکثر کہا کرتا تھا مسٹر نعیم ، بیگم صاحبہ کا مطلب ہے کہ تم آوارہ گردی نہ کرو ۔ ورنہ کھانے کا کیا ہے ۔ ٹھنڈا ہو بھی جائے تو کیا کھایا نہیں جاتا ۔ اور سچ پوچھو مسٹر نعیم تو بیگم صاحبہ کا تمہیں آوارہ گردی سے بچانے کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ تم جلدی واپس آ کر بیگم گردی کر سکو ۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا تو محض بہانہ ہے ۔ مطلب تو صرف اپنی طرف متوجہ کرنا ہے ۔ پھر وہ ہنس پڑتا ۔ "کس قدر چالاک ہیں یہ عورتیں !" اور وہ ہنسے جاتا لیکن اس روز اماں کی بات پر وہ ہنس بھی نہ سکا ۔ بیگم گردی کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا ۔ وہ تو اماں تھی ۔ اس کی اپنی ماں ۔

عام طور پر وہ سیر کا عادی نہ تھا ۔ اگرچہ سینما جایا کرتا تھا ۔ لیکن سیر ۔۔۔۔۔ سیر سے اُسے نفرت تھی اگر اس کا کوئی دوست اس سے پوچھتا مسٹر سلیمان، تم سیر کو نہیں جاتے تو وہ ہنس پڑتا اور کہتا ۔ "بھئی میرے لئے تو صرف یہ احساس ہی ضروری ہے کہ میں ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں اتنی سیر گاہیں ہیں ۔ جب اور جہاں چاہوں جا سکتا ہوں لیکن چل کر جانا ۔۔۔۔۔ نہ بھئی کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو یا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگا جا رہا تھا ۔ لیکن جلد ہی وہ مکھن کا ٹکڑا اس کے پیٹ میں گرہ سی بن گیا اور ناچار اسے واپس آنا پڑا ۔

"کھانا کھاؤ گے ؟" اماں نے پوچھا ۔ "طبیعت تو اچھی ہے تم اس قدر چپ کیوں ہو ؟ سلیمان" ۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اماں" ۔ وہ بولا اور نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑا ۔

"دیکھا ، میں نے کہا تھا نا" ۔ اماں دکھی انداز سے بولی ۔ "یہ اللہ ماری چائے ، بس چائے چائے چائے نہ کھانا نہ پینا ۔ تمہارے دشمنوں کی انتڑیاں سوکھ

گئی ہیں اور کیا ہے گرمی اور خشکی" ۔

سلیمان کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا ۔ لیکن وہ چپ چاپ پڑا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اماں کی باتیں نہ سنے ۔ لیکن وہ باتیں اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں ۔ پھر اسے سوجھی بولا ۔ "اماں ! تم فضول فکر کرتی ہو ادھر نعیم کی ہاں چلا گیا تھا انہوں نے کھانا کھلا دیا" ۔

"اوہ یہ بات ہے" ۔ اماں بولی ۔ "تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا ۔ خیر کھانے کی بات نہیں ۔ مجھے تیری طبیعت اچھی نہیں دکھتی بیٹا" ۔

اگلے دن سویرے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اماں سرہانے کھڑی ہے ۔ اور ہاتھ سے اس کا ماتھا محسوس کر رہی ہے ۔ پہلے تو وہ چونک پڑا ۔ پھر انگڑائیاں لینے لگا ۔

"نہ بیٹے اٹھو نہیں" ۔ وہ بولی ۔ "یہیں ناشتہ لے آتی ہوں میں ۔ دیکھو تو سر تنور کی طرح تپ رہا ہے ۔ میں جانتی تھی تیری طبیعت اچھی نہیں" ۔ اس نے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا ۔ "نہ جانے کتنا بخار ہے" ۔

"نہیں اماں !" اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی "ویسے ہی گرمی ہے ۔ بخار کہاں" اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر حسب معمول کمرے میں گھومے ۔ کوئی کتاب اٹھا کر یہاں سے وہاں رکھ دے ۔ طوطے سے گپ شپ اڑائے لیکن اماں کے خیال سے وہ پڑا رہا ۔ اگرچہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا چارپائی پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں ۔

ماں ناشتہ لینے گئی تو وہ طوطے کی طرف متوجہ ہو گیا ۔ جو پنجرے میں بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا ۔ نہ جانے کیوں اس وقت اُسے طوطے کی انداز نشست میں وہ جمالی کیفیت نظر نہ آئی ۔ اس کے اطمینان بھرے انداز کو دیکھ کر پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ شائد وہ اطمینان محض ظاہری ہو ۔ اسے خواہ مخواہ شک پڑنے لگا ۔ کہ طوطا خوش نہیں ہے ۔

جب وہ چائے کا پیالہ بنانے لگا تو ماں لجاجت سے بولی ۔ "بیٹے سلیمان ! آج چائے نہ پیو تو کیا ہرج ہے ۔ دودھ کا پیالہ پی لو ۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری

"دودھ" اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ۔ اسے دودھ سے چڑ تھی ۔ اس روز تو اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا کا سارا پاٹ دودھ بغیر پی جائے ۔ اتفاق سے اماں نمک لینے چلی گئی ۔ سلیمان نے قہوہ کا پیالہ بھرا اور اسے طشتری میں ڈال کر پی گیا ۔ پھر اس نے جلدی جلدی منہ پونچھا ۔ اور یوں بیٹھ گیا گویا اماں کا انتظار کر رہا ہو ۔ پھر آپ ہی آپ وہ غصے میں آگیا ۔ اس کا جی چاہا کہ اماں آ جائے تو اس کے روبرو دودھ ڈالے بغیر ایک پیالہ بنا کر پئے لیکن اماں کو دیکھ کر اس نے اپنی خواہش دبا لی اور ازسرِنو اماں کا دل نہ دکھانے کا ارادہ کر لیا ۔

ابھی اس نے مربہ کی پھانک اٹھائی ہی تھی کہ وہ بولی ۔ "نہ بیٹے ! آج میں تمہیں یہ کھانے نہ دوں گی ۔ اللہ مارا کس قدر کھٹا ہے اور تم ساری رات کھانستے رہے ہو" ۔

سلیمان شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا پھر وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی ۔ "اچھا بیٹے جیسی تمہاری مرضی ۔ اگر ضرور ہی پینی ہے چائے تو دودھ زیادہ ڈال لو ۔ خشکی نہ کرے" ۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ "دودھ ہی سے چائے کی خشکی کم ہو جاتی ہے ۔ لیکن آج کل تو لوگ چائے میں دودھ ڈالنا حرام سمجھنے لگے ہیں ۔ بس بوند گرائی رنگ بھی نہیں بدلتا اور پی گئے" ۔

سلیمان ہنسنے لگا ۔ لیکن اس کی ہنسی وحشت بھری سنائی دے رہی تھی ۔ "اچھا اماں" ۔ وہ بولا ۔ "یہ دیکھو" اور آدھ پیالہ دودھ سے بھر لیا ۔ "ٹھیک ہے نا ؟"

"جیسے تیری مرضی بیٹے !" ماں نے مسکرا کر کہا ۔ "میں تو تیری خوشی میں خوش ہوں ۔ میرا کیا ہے ؟"

"نہیں نہیں" وہ چلایا ۔ "ٹھیک تو کہہ رہی ہو تم ۔ میں کیا بچہ ہوں جو اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ چائے خشکی کرتی ہے اور کھانسی کی وجہ سے مجھے مارملیڈ نہ

kitaabghar.blogspot.com

کھانا چاہیئے“ ۔

”نہیں بیٹے ۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں تو میری بات کا برا نہ مان جائے“ ۔

اس روز کالج سے چھٹی تھی ۔ سلیمان نے کتاب اٹھائی تو اماں نے اسے پڑھنے سے منع کر دیا ۔ وہ لیٹے لیٹے تھک گیا پر دن تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو تھے کو آواز دے کر چاء کے لئے ہی کہہ دے لیکن اماں کے خیال سے رک جاتا ۔ کچھ گنگنانا چاہتا تو نہ جانے کیوں آواز حلق میں اٹک جاتی ۔ پھر وہ چپ چاپ طوطے کو دیکھنے میں لگ جاتا لیکن اس روز طوطا بھی یوں بیٹھا تھا جیسے طنزاً اس پر ہنس رہا ہو ۔ آخر اکتا کر اس نے کتاب اٹھا ہی لی ۔ نہ جانے کون سی کتاب تھی وہ اور اس میں تصویریں دیکھتے دیکھتے پڑھنے لگا ۔

”بیٹے سلیمان !“ اماں کی لجاجت بھری آواز سنائی دی ۔

” اف ـــــ !“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا ۔

اماں گھبرا گئی ۔ ”نہیں نہیں بیٹے تو آپ سمجھدار ہے ۔ جو تیرا جی چاہے کر میری تو ویسے ہی بری عادت ہے کہ تجھ سے تیرے بھلے کی کہتی رہتی ہوں ۔ جو جی چاہے کر ، اللہ رکھے آپ سمجھدار ہے“ ۔

”کیا کروں اماں ۔ میں تو لیٹے لیٹے تھک گیا“ ۔ اس نے طبیعت کو قابو میں کرتے ہوئے کہا ۔

”نہیں نہیں جو تیری خوشی ہو کر“ ۔ اماں بولی ۔

”میری خوشی“ وہ ہنسا ۔ ”اماں میری خوشی تو رہی ہی نہیں ۔ میرا مطلب ہے ہے ہی نہیں ۔ ویسے میرا جی چاہتا ہے ـــــ“ اور وہ چپ ہو گیا ۔

”کیا جی چاہتا ہے بیٹے ؟“ اماں نے پوچھا ۔

”بتاؤں ؟“ وہ مذاقاً کہنے لگا ۔ ”جی چاہتا ہے اپنے کمرے میں چلا جاؤں“ ۔

”اپنے کمرے میں ؟“ اماں نے حیرانی سے دہرایا ۔ ”یہی تو ہے تیرا کمرہ ـــــ !“

”ہے تو یہی ـــــ لیکن رہا نہیں“ وہ اٹھ بیٹھا ۔ ”دیکھو اماں میں دکھاؤں اپنا کمرہ تمہیں ؟“

اس نے الماری میں سے سب کتابیں نکال کر انہیں ڈھیریوں میں ادھر ادھر بکھیر دیا ۔ دو ایک کرسیاں الٹ پلٹ کر دیں گدیاں ایک طرف پھینک دیں اور پھر بوٹ سمیت صوفے پر گر کر ہنسنے لگا ۔ ” دیکھا اماں یہ ہے میرا کمرہ !“

اس کی ہنسی میں دیوانگی کی جھلک محسوس کر کے اماں نے چیخ سی ماری ۔ ”سلیمان ـــــ کیا ہے تمہیں بیٹا ۔ ذرا تیرا سر دیکھوں“ ۔ اس نے سلیمان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔ ”میں جانوں بخار دماغ کو چڑھ گیا ہے ۔ ہائے اللہ ماری یہ چائے کی خشکی ۔ کیوں بیٹے ۔ کیسی ہے طبیعت ؟“ وہ بولی ۔

طوطے نے یوں چیخ ماری جیسے وہ سلیمان پر ہنس رہا ہو ۔ سلیمان نے محسوس کیا جیسے طوطا اسے طعنہ دے رہا ہو ۔ وہ اماں سے کہنے لگا ۔ ”میرا جی چاہتا ہے ـــــ اس طوطے کو اڑا دوں“ ہنستے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور لپک کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا ۔ طوطے نے پر پھڑپھڑائے اور بیٹھا رہا ۔

”شی شی ـــــ شی“ ۔ سلیمان نے تالی بجا کر اُسے اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔

”اے ہے سلیمان ، کیا ہے تجھے“ ۔ اماں لجاجت سے بولی ۔ ”ایسے پیارے پالتو کو اڑاتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا تمہیں ؟ ہائے ہائے کیسا پیارا ـــــ“

”پیارا پالتو ـــــ“ وہ کھلکھلا کر دیوانہ وار ہنسا ـــــ ”پیارا پالتو ـــــ“

”سلیمان ـــــ !“ اماں نے ڈر سے چیخ ماری ۔ ”میرے اللہ کیا ہے میرے بیٹے کو ؟“

”پیارا پالتو !“ ـــــ وہ ازسرِ نو جوش سے ہنسنے لگا ـــــ ”پیارا پالتو ـــــ !!“

……

kitaabplyat.blogspot.com